اورینٹل کالج میگزین

اوریئنٹل کالج میگزین

فروری ۱۹۵۶ء

جلد ۳۲ عدد ۲

عدد مسلسل ۱۲۴

مدیر :—

ڈاکٹر سیّد عبداللہ

باہتمام مسٹر احسان الحق ہیڈ کلرک اوریئنٹل کالج لاہور ، پرنٹر و پبلشر اوریئنٹل کالج میگزین ردن پرنٹنگ پریس مل روڈ لاہور میں طبع ہو کر اوریئنٹل کالج لاہور سے شائع ہوا ۔

ترتیب

یونیورسٹی اورینٹل کالج

کے

۸٦ ویں یومِ تاسیس کے موقع پر

ڈاکٹر سیّد عبداللہ

پرنسپل اورینٹل کالج ، لاہور

کا

خطبۂ استقبال

(۲۸ اکتوبر ۱۹۵۵ء)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

صدر عالی مقام و حاضرین کرام !

دنیا کی بعض رسمیں پامال ہو جانے کے باوجود ہمیشہ تازہ و خوشگوار رہتی ہیں انہیں میں ایک اظہار شکریہ کی رسم بھی ہے جو عام ہو جانے کے باوجود بڑی ضروری اور خوشگوار چیز ہے ۔ اس لئے میں سب سے پہلے یہی فرض ادا کرتا ہوں اور آپ سب صاحبوں کے قدوم میمنت لزوم کا شکریہ ادا کرتا ہوں مگر اے مہمانان گرامی ! میرا یہ شکریہ محض رسمی نہیں بلکہ ایسا ہے جو دل کی گہرائیوں میں پیدا ہو کر قلم و زبان پر آیا ہے مگر حق تو یہ ہے کہ زبان و قلم ہر دو اس کا پورا حق ادا کرنے سے قاصر ہیں ۔ لہٰذا میں اختصار میں سلامتی سمجھ کر اپنے تمام جذبات عربی کے اس ایک ہی شعر میں ادا کرنے پر اکتفا کرتا ہوں

سَرَّتْمُوْ بِمُدُومِكُمْ يَا سَادَتِي مَا الشُّكْرُ اِلَّا بِاللِّسَانِ الْقَاصِر

حضرات ! آپ کو یاد ہوگا ہم نے پچھلے سال ۲۹ - اکتوبر کو اورینٹل کالج کا یوم تأسیس منایا تھا ۔ اس سال پھر اسی رسم کا اعادہ کیا جا رہا ہے ۔ سال ۱۹۵۵ء اس کالج کی عمر کا ۸۶ واں سال ہے ۔ پچھلے سال میں نے کالج کے ۸۵ سال کے کام پر ایک تاریخی تبصرہ کیا تھا مگر اس سال کسی تاریخی تبصرے کی بجائے یہ خیال ہوا کہ مختصراً ان نظریات و تصورات کا کچھ تجزیہ کر لیا جائے جو اس درسگاہ کی طویل تاریخ حیات سے ہمیشہ وابستہ رہے ہیں ۔ میں چاہتا ہوں کہ آج بڑے اختصار سے میں اس روایت کی بھی کچھ وضاحت کردوں جو تعلیمی اور تصنیفی لحاظ سے

اورینٹل کالج کے لئے ہمیشہ باعث امتیاز رہی ہے ۔ اس سے یہ دیکھنا اور دکھانا مقصود ہے کہ یہ پرانے عقائد اور یہ پرانی روایت موجودہ مسائل تعلیم اور مقاصد قومی کی تکمیل میں ہمارے لئے کس حد تک ممد ہو سکتی ہے اور اس لحاظ سے یہ بھی سوچنا ہے کہ یہ کالج اور اس کو وجود میں لانے والے تعلیمی و تہذیبی اصول ہمارے نئے تعلیمی و تہذیبی منصوبوں کی پیش رفت اور کامیابی میں کیا حصہ لے سکتے ہیں ۔

حضرات ! اورینٹل کالج کی تعلیمی تحریک جس کی ابتدا انجمن پنجاب اور اس کے فاضل صدر ڈاکٹر لائٹنر نے کی تھی ۔ اس بنیادی عقیدے پر مبنی تھی کہ ملکی تعلیم کا نظام اس طرح مرتب کیا جائے کہ اس میں مشرقی علوم اور ملکی زبانوں کو نمایاں حیثیت حاصل ہو ، علوم جدید اور علوم قدیم میں معقول پیوند قائم کیا جائے اور جدید علوم ملکی زبانوں میں پڑھائے جائیں ـــ بس ـــ انجمن پنجاب کی تعلیمی تحریک انہی اصولوں پر مشتمل تھی ان کی کامیابی کے لئے انجمن کے فاضل صدر ڈاکٹر لائٹنر نے طویل مدت تک جدو جہد کی مگر افسوس ہے کہ تعلیم کا مذکورہ بالا نظریہ انگریزی حکومت کی سیاسی حکمت عملی اور اس کے مخصوص مصالح کے سبب کوئی عملی شکل اختیار نہ کر سکا اور انجمن کی یہ مفید تحریک پوری طرح کامیاب نہ ہوسکی ۔ یہ صحیح ہے کہ حکومت نے انجمن کے بعض مطالبات کو تسلیم کرلیا مگر عملی لحاظ سے وہ اپنی اسی حکمت عملی پر کار بند رہی جو ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں رائج ہو چکی تھی ۔ انجمن کے جو مطالبات نظری طور پر تسلیم کرلئے گئے ان میں ایک تو تھا علوم مشرقیہ اور دیسی زبانوں کی اہمیت کا اعتراف اور دوسرا علوم مشرقی کی تعلیم کے لئے ایک شعبہ مشرقی یا اورینٹل کالج کا قیام ـــ ! مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان اصولوں کو عمل میں لانے کے لئے جن تدبیروں کی ضرورت تھی ان میں بے دلی تھی یہی وجہ ہے کہ ان سے وہ نتائج پیدا نہ ہوئے جن کی توقع تھی ۔ انجمن پنجاب ایک اورینٹل یونیورسٹی کے قیام کے علاوہ عام یونیورسٹی

تعلیم میں ملکی زبانوں کو ذریعہ تعلم کی حیثیت سے رواج دینا چاہتی تھی۔ اور علوم جدید اور علوم مفید کو غیر زبان کی مشکلات سے بچا کر ان کو عام لوگوں تک براہ راست اور جلد پہنچانا چاہتی تھی۔ مگر انجمن کی یہ تجویزوں پر عمل نہ ہوا۔

اس سلسلے میں انگریزوں کی عام تعلیمی حکمت عملی کا تذکرہ اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ اس سے انجمن اور حکومت کے متضاد نقطہ ہائے نظر کی وضاحت ہوتی ہے اور یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں انجمن پنجاب کی نظر قومی مصالح پر تھی وہاں انگریزوں کی تعلیمی حکمت عملی کی ایک بڑی غایت یہ تھی کہ ملکی تعلیم کو ان سیاسی مصالح کے تابع بنایا جائے جن کے لئے انگریزی حکومت قائم ہوئی تھی اور اس کے ان عناصر کو بالکل کمزور کردیا جائے جن سے ان مصالح کو کبھی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو——یہ اہم عناصر جن کو اس زمانے کی حکومت خاص طور سے دبا دینا چاہتی تھی کم و بیش تین تھے۔ اول قومی تاریخ۔ دوم مشرقی علوم۔ سوم ملکی زبانیں۔ ان تینوں تہذیبی عناصر سے انگریزوں کی تصیرت، ہمیشہ خائف رہی اور انہوں نے ہمیشہ اس پر نظر رکھی کہ ان عناصر کا تناسب اور ان کی معنوی مقدار اس حد خاص سے آگے بڑھنے نہ پائے جس کے بعد قومی احساس اور ملکی شعور کی بیداری کی منزل قریب آجاتی ہے۔

ہندوستان کی اٹھارویں اور انیسویں صدی کی پوری تاریخ اس امر کی شہادت دیتی ہے کہ ہمارے ملک کے انگریز حکمران ملکی تعلیم کے معاملے میں پوری ڈیڑھ صدی تک مشوش اور پریشان رہے۔ اور ایک عرصے تک تو ان پر گومگو کا عالم طاری رہا—— وہ دیکھتے تھے کہ تمام ملک میں ملکی علوم کی تعلیم کا ایک وسیع نظام قائم ہے جس کا تعلق صرف ملازمت اور معاش سے ہی نہیں بلکہ قومی زندگی اور تہذیبی شعور سے بھی ہے۔ اس لئے یہ تو ناممکن تھا کہ ملک کے نظم و نسق کو چلانے کے لئے پرانے نظام تعلیم سے وہ یکسر بے نیاز ہوجاتے اس لئے وہ خاصی

مدت تک پرانے سلسلے سے ھی کام چلاتے رہے اور جہاں تک ھوسکا انگریز ملازموں کو بھی عربی فارسی اردو وغیرہ کی تعلیم دلاتے رہے مگر یہ سب کچھ انھوں نے ضرورت کی حد تک کیا مگر جب ان کی ضرورتیں اور بڑھیں اور انہیں دیسی ملازموں کی زیادہ ضرورت پڑی تو وہ اپنی تعلیمی حکمت عملی کو تبدیل کرنے پر مجبور ھوگئے مگر اس مرتبہ بھی بنیادی حیثیت عربی، فارسی اور ملکی زبانوں کو ھی دی گئی - وارن ھیسٹنگز لارڈ ولزلی اور بعض دوسرے گورنر جنرل صاحبان نے تعلیم کے اس نئے نظام میں بڑی دلچسپی لی - اور اس نئی تعلیم کے لئے کالج اور مدرسے کھولے چنانچہ وارن ھسٹنگزسکول کلکتہ ، مدرسہ عالیہ کلکتہ، فورٹ ولیم کالج ، دھلی کالج ، آگرہ کالج ، بنارس سنسکرت سکول اور ان کے علاوہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال وغیرہ اسی دور سے متعلق ھیں - یہی وہ زمانہ تھا جس میں علوم مشرق مساجد و مکاتب اور پاٹ سالاؤں سے نکل کر پہلی مرتبہ سرکاری مدرسوں ، کالجوں اور درسگاھوں میں پہنچے - اور مسجد و مدرسہ اور مندر اور پاٹ سالہ میں ایک تفریق پیدا ھوئی اور ملک میں اھل علم کے دو مختلف الخیال طبقے پیدا ھوگئے اور یہی وہ زمانہ تھا - جس میں '' قدر مرد بہ علم '' کے ساتھ ساتھ '' قدر علم بہ ملازمت '' کا نعرہ بھی بلند ھوا اور علوم ادراک حقیقت کے لئے نہیں اقتصادی منڈی میں بکنے کیلئے پڑھے جانے لگے - اور یوں تو اس عالم آب وگل میں جہاں جسم و روح کا رشتہ برقرار رکھنے کے لئے مادی وسائل کی بہر حال ضرورت ھوتی ھے اقتصاد بھی زندگی کی ایک نہایت ھی بنیادی قدر ھے مگر اقتصاد کی تنظیم کے لئے علمی ، اخلاقی اور فکری اقدار کی غلامی شرف انسانی کی موت سے کسی طرح کم نہیں -

باایں ھمہ حکومت انگلشیہ کے اس تعلیمی دور میں علوم مشرق کے مطالعہ و تحصیل کے حق میں کچھ مفید نتائج بھی پیدا ھوئے مثلاً تعلیم میں نظم و قاعدہ کی اھمیت ، علوم مشرقیہ کی بعض خاص انواع کا از سر نو زندہ ھونا ، امتحان کے طریقے کا رواج غرض یہ اوراس قسم کی دوسری منصوبہ

بندیاں جن سے پرانا نظام تعلیم نا آشنا سا ہو گیا تھا پھر رواج پذیر ہوئیں ـــــاسی زمانے میں مضامین میں انتخابیت کا اصول بھی رائج ہوا، ادب و تاریخ کی تحصیل کی غایت بھی بدلی اور اس کے نتیجے کے طور پر مطالعۂ علوم مشرق (اورینٹل سٹڈیز) کی منظم تحریک ہندوستان میں پیدا ہوئی جس کی نشوو نما میں سر ولیم جونز گل کرائیسٹ، شکسپیر، سمرنگر کرک پیٹرک وغیرہ نے خاص حصہ لیا۔ چنانچہ ان کی کوششوں سے مشرقی علوم کے مطالعہ و تجزیہ اور تحقیق و تصنیف کے لئے نئے راستے نکلے جو خالص مغربی طریقوں سے ماہر تھے اور اس طرح قدیم و جدید اور مشرق و مغرب کے پیوند کی ایک ایسی صورت نکلی جس سے علوم مشرق کو گویا ایک نئی زندگی نصیب ہوئی ــ ڈاکٹر لائٹنر جو کچھ دیر بعد انجمن پنجاب کے صدر اور گورنمنٹ کالج اور اورینٹل کالج لاہور کے پہلے پرنسپل ہوئے۔ علمائے مشرقیات کے اسی دبستان سے تعلق رکھتے ہیں انہوں نے پنجاب میں تعلیم کے انہی تصورات کو پھیلانے کی کوشش کی جو انگریزوں کی تعلیمی حکمت عملی کے دور دوم سے تعلق رکھتے ہیں ــ مگر ان کے کام کی تفصیل آگے آتی ہے۔

بہر حال انگریزوں کے اس دوسرے تعلیمی دور میں ہندوستان بھر میں مشرقی علوم اور ملکی زبانوں کو ترقی ہوئی۔ اس زمانے میں علوم جدید کی اشاعت کا بھی خاصا کام ہوا جس کے سبب اردو کی علمی حیثیت میں بھی بڑا اضافہ ہوا۔ اور یہ امکانات روشن ہونے لگے کہ اردو اپنی کم عمری کے باوجود دنیا کی اہم زبانوں کی صف میں کھڑی ہو جائے مگر ترقی کی رفتار دفعتاً رک گئی۔ حکومت نے اپنی تعلیمی حکمت عملی میں تبدیلی کا اعلان کر دیا ـــ جس کی تشکیل میں لارڈ میکالے کے اس تعلیمی نوٹ نے خاص حصہ لیا۔ جس میں انہوں نے علوم مشرق کے خلاف بہت کچھ لکھا اور بعض ایسی باتیں بھی کہہ ڈالیں جو خلاف واقعہ ہونے کے علاوہ بڑی دل خراش بھی تھیں۔ درحقیقت میکالے کی تعلیمی یاد داشت تعصب اور بے خبری کا عجب و غریب مجموعہ تھی مگر اس کی پشت پر حکومت انگلشیہ کی مستعمراتی حکمت عملی کار فرما تھی اور اس کے ساتھ

پر نوکریوں کی نوید جلی حروف میں کندہ تھی - اس لئے اسکا نفاذ ھوا - اور بڑے زور سے ھوا - اس کے زیر اثر انگریزی زبان کو اصولی اور اولین حیثیت حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ ملکی زبانوں کا درجہ بالکل گر گیا اور مشرقی علوم تو تقریباً نظام تعلیم سے خارج سے ھوگئے اور اگر ایک طرف لارڈ میکالے کی پیدا کردہ ذھنیت سے علوم مشرقی کو حقارت کی نظر سے دیکھا جانے لگا تو دوسری طرف انگریزی تعلیم کے اقتصادی منافع کے سبب ترغیب کی سب صورتیں انگریزی تعلیم میں جمع ھوگئیں - اس سے ملک بھر میں علوم دین ، علوم مشرقی اور ملکی زبانوں پر یتیمی اور کس مپرسی کا عالم طاری ھوگیا اور یہ علوم خود اپنے ھی ملک میں ذلیل و خوار سمجھے جانے لگے -

ان حالات میں انجمن پنجاب اور ڈاکٹر لائٹنر کی تعلیمی تحریک حکومت کی مسلّمہ پالیسی کے سراسر خلاف تھی اس لئے کہ انگریزی حکمت عملی جن علوم اور زبانوں کو بالکل دبا دینا چاھتی تھی انجمن انہی کو ابھارنا چاھتی تھی - مگر انصاف یہ ہے کہ انجمن پنجاب کی تحریک اعتدال و توازن کی تحریک تھی جو اس معقول اصول پر قائم تھی کہ دنیا کے تمام مفید علوم پڑھائے جائیں مگر اپنی زبان میں - اس میں اس نظریے کا اعلان تھا کہ علوم کی تعلیم کا قدرتی اور فطری طریقہ یہی ھے کہ اس کے لئے اپنی ھی زبان سے فائدہ اٹھایا جائے اور قدیم و جدید کو اس طرح ملایا جائے کہ قدیم کے فرسودہ حصے کٹ جائیں اور صالح حصے جدید کے ساتھ مل کر ایک نئی زندگی کا پیغام لائیں - یہی انجمن پنجاب کا بنیادی تصور تھا - اور یہی ڈاکٹر لائٹنر کے خیالات تھے - اور آج کسی کو یہ تسلیم کرنے سے انکار نہ ھوگا کہ دراصل انجمن پنجاب ھی کے تعلیمی عقائد ملکی و ملی مقاصد کے مطابق تھے جن کو اس وقت اگر منظور کر لیا جاتا تو آج ھمارا ملک بھی جاپان اور دوسرے ممالک کی طرح ایک ترقی یافتہ ملک ھوتا - اور لوگوں کی علمی حالت آج بدرجہا بہتر ھوتی مگر سیاست کی دیوی بھی تو بڑی ظالم ھوتی ھے اس کی قربان گاہ پر بڑے بڑے اخلاقی اصول بھینٹ چڑھا دئے جاتے ھیں - بہر حال یہ انجمن

کا نظریہ تھا جس کی اصولی صحت و اصابت سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور یہ وہ نظریہ ہے جو آج بھی ہمارے لئے قابل غور ہے۔

اس نظریے کی وضاحت کے لئے میں انجمن پنجاب کے صدر ڈاکٹر لائٹنر کے تعلیمی خیالات کی مزید تشریح کرنا چاہتا ہوں کیونکہ ان کے خیالات کا یہ تجزیہ ہمارے موجودہ مسائل میں بہت کار آمد ثابت ہو سکتا ہے

ڈاکٹر لائٹنر نے بر کتوں کی تعلیم پر جو رسالہ لکھا ہے اس میں انہوں نے تعلیم کا مقصد یہ بتایا ہے کہ

> Education is everywhere the result of the specific national character, laws and Religion, when brought to a practical issue - —The Training of the Rising Generation.

گویا لائٹنر کے نزدیک تعلیم وہ معاشرتی اور تہذیبی مسئلہ ہے جس کو کسی قوم کے خصائص قومی اس کے قوانین اور اس کے مذہب سے جدا نہیں کیا جا سکتا جس کے بغیر تعلیم کی اصلی غرض یعنی نئی نسلوں کی ذہنی تربیت کا مقصد پورا نہیں ہوسکتا ۔ اس کے بغیر نہ کوئی کردار پیدا ہوسکتا ہے نہ اعلیٰ سیرت اور نہ ہی اعلیٰ ذہن و فکر ظہور میں آ سکتا ہے ۔ اسی اہم اصول کے ماتحت ڈاکٹر لائٹنر نے پنجاب میں ایک امتزاجی نظریے کی تبلیغ کی ۔ اور تعلیم کے عملی مقصد یا مقاصد کے ساتھ ساتھ قومی روایات اور تہذیبی پہلوؤں کو بڑی اہمیت دی ۔ اسی خیال کے ماتحت انہوں نے پنجاب میں ایک اورینٹل یونیورسٹی کے قیام کی کوشش کی اور جب یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی تو انہوں نے ایک ایسی یونیورسٹی کے قیام پر زور دیا جو اورینٹل یونیورسٹی کے نصب العین کے زیادہ سے زیادہ قریب تھی ۔ چنانچہ پرانی پنجاب یونیورسٹی میں ان کے ان تصورات کے بہت سے نقوش موجود تھے جو اب موجود نہیں ۔

ڈاکٹر لائٹنر ملکی زبانوں کے ذخیرے کو بہت وسیع کرنا چاہتے تھے اور یہ چاہتے تھے کہ یورپ کی سائنس اور دوسرے علوم و فنون ان میں ڈھال دئے جائیں تاکہ علوم کی اشاعت و تعلیم میں آسانی ہو — مگر

چونکہ وہ مشرقی علوم کو تہذیبی لحاظ سے بہت اہمیت دیتے تھے اس لئے انہوں نے ان علوم کی ترقی کے لئے مشرقی علوم پر زور دیا ۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ ملکی تعلیم کے نظام میں علوم مشرق اور دیسی زبانوں کو اہمیت دی جائے مگر ان کو اس پر بھی اصرار تھا کہ علوم مشرق کی تعلیم کا نظام زیادہ سائنٹفک اور علمی بنیادوں پر قائم کیا جائے تاکہ اس سے عملی فوائد مترتب ہوں اور قومی ترقی میں صحیح امداد ملے ـــ اور یہ تو ظاہر ہے کہ علوم، مشرقی ہوں یا مغربی سب سے صحیح فائدہ تبھی اٹھایا جاسکتا ہے کہ سب سے پہلے ان کی غایت متعین ہو ۔ پھر اس غایت تک پہنچنے کے لئے معقول طریق کار تجویز ہو ـــ اور اس طریق کار کی کامیابی کے لئے صحیح نصاب تجویز ہوں اور پڑھائے جائیں ۔

ڈاکٹر لائٹنر نے علوم مشرقی کی تجدید و اصلاح کے مسئلے پر بھی بڑا غور کیا ـــ اور اس سلسلے میں بہت سی اصلاحیں کیں ـــ! اس کے متعلق انہوں نے اپنی یادداشتوں کے علاوہ اپنی کتابوں میں خصوصاً ترکی میں تعلیم کے متعلق لیکچر میں اپنے خیالات بڑے واضح انداز میں ظاہر کئے ہیں ۔ ڈاکٹر لائٹنر نے لکھا کہ قدیم نظام تعلیم میں جو چیز سب سے زیادہ قابل اصلاح ہے وہ اسکی بےقاعدگی اور وقت کے عنصر سے بے اعتنائی ہے ۔ ڈاکٹر لائٹنر کو یہ بھی شکایت تھی کہ جہاں تک عربی فارسی تعلیم کا تعلق ہے ۔ ان علوم کے طلبا صرف و نحو کو مقصود بالذات سمجھتے ہیں حالانکہ صرف و نحو مقصود بالذات نہیں وہ تو ادب اور زبان کے حصول کا وسیلہ ہیں ۔ انہوں نے لکھا کہ پرانے مدرسوں میں گرامر پر بلا ضرورت زور دیا جاتا ہے ۔ یہاں تک کہ ادب کی ان کتابوں میں بھی جن کا اصلی فن کچھ اور ہے ۔ گرامر کے مسائل کو مرکزی اہمیت دے دی جاتی ہے مثلاً مقامات حریری اور کامل مبرد جو ادب کی کتابیں ہیں اور تفسیر بیضاوی جو تفسیر کی کتاب ہے ان میں بھی یہی طریق کار اختیار کیا گیا ہے ڈاکٹر لائٹنر کو پرانے طریق درس میں یہ کمی بھی نظر آئی کہ اس میں تاریخ کی کتابوں کا فقدان ہے انہوں نے لکھا کہ بہت سے عالم فاضل لوگ جن کے تبحر علمی کے سامنے جھکنا پڑتا ہے عربی ادب اور علوم کے تاریخی پس منظر سے

بے خبر ہونے کے علاوہ معمولی تاریخ کے واقعات سے بھی بیگانہ ہوتے ہیں ۔ انہوں نے اس خیال سے سپیں اسلام کے نام سے ایک کتاب لکھی جس کی تیاری میں مولانا محمد حسین آزاد سے بھی مدد حاصل کی ۔ اس میں انہوں نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی کہ تاریخ اسلام تاریخ عالم کا ایک حصہ ہے اور ادب اور علوم تاریخی مطالعہ کے بغیر اچھی طرح سمجھے نہیں جاسکتے ۔ ان سب باتوں سے زیادہ ان کو اس بات سے رنج ہوتا تھا کہ قدیم نظام تعلیم ، بعض خاص کتابوں سے وابستہ ہو گیا ہے اور علم نے خصوصاً علوم طبعی نے جو ترقی کی ہے اس سے استفادہ کی ضرورت ہی نہیں سمجھی جاتی حالانکہ علم ایک ترقی پذیر شے ہے ۔ کم و بیش یہی وہ نقائص ہیں جن کی اصلاح ڈاکٹر لائٹنر کے پیش نظر تھی ۔

حق یہ ہے کہ موصوف کا نظریۂ اصلاح و تجدید نہایت معقول مفید اور نتیجہ خیز تھا ۔ تقریباً اسی قسم کے خیالات ہمیں ایک اور مصلح تعلیم شبلی نعمانی کی تقریروں اور تحریروں میں بھی ملتے ہیں ۔ شبلی نے بھی درانے نظام تعلیم میں اصلاح و تجدید کی کوشش کی ۔ وہ بھی خالص قدیم تعلیم اور خالص جدید تعلیم کو ناقص اور یک طرفہ مانتے تھے شبلی کے نزدیک بھی قومی تعلیم کا کوئی معقول منصوبہ قومی علوم اور دیسی زبانوں کی مرکزی اہمیت کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا ۔ غرض اس لحاظ سے ڈاکٹر لائٹنر اور مولانا شبلی کے نظریات اصلاح و تجدید بہت قریب قریب معلوم ہوتے ہیں ـــــ گویا یہ وہ سنگم ہے جس پر مشرق و مغرب باہم مل گئے ہیں اگرچہ مشہور یہی ہے کہ مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب اور دونو باہم کبھی مل نہیں سکتے ۔ بہر حال ڈاکٹر لائٹنر ان تصورات اور نظریات کو لے کر آگے بڑھے اور اپنی پرزور وکالت اور خلوص و انہماک سے پنجاب میں ایک ایسے نظام تعلیم کی بنیاد ڈالنا چاہی جس پر اگر عمل درآمد ہو جاتا تو آج ہماری تعلیمی حالت یقیناً بالکل مختلف ہوتی ۔ افسوس ہے کہ اس عظیم ماہر تعلیم کو حکومت کی مخالف حکمت عملی کے سبب پوری کامیابی نہ ہوئی اور وہ کچھ نہ کر سکا تاہم اس کی

کوششوں سے پنجاب میں علوم مشرقی کا ایک ایسا نظام قائم ہو گیا جو ناسازگار فضا ، زمانے کے نشیب و فراز اور لیل و نہار کی گردشوں کے باوجود آج تک قائم ہے ـــــ اور نہ صرف قائم ہے بلکہ ایک خاص انداز فکر اور ایک خاص روایت کو پہلو میں لئے ہوئے بدستور بڑھ رہا ہے اور زندگی کی اس نازک گھڑی میں بھی جب زمانے کی نئی اقدار اس کی سخت جانی کا امتحان لے رہی ہیں وہ ارتقاے حیات کے نئے سلسلوں کو اپنی روایت میں جذب کرنے کی فکر میں ہے اور ایک ایسی تخلیق و تعمیر کے خواب دیکھ رہا ہے جس کی تکمیل موجودہ قومی و ملی مقاصد کے بھی عین مطابق ہے ۔ یہ روایات انجمن پنجاب کے تخیل کی ایک مدھم سی صورت ہے مگر پاکستان کے تعمیری ارادوں کے لئے مفید اور اس کے تنظیمی منصوبوں کے لئے یقیناً ممد ہے ۔

جناب والا ـــــ قوم کی حیات جدید کی تشکیل میں انجمن پنجاب کے مذکورہ بالا نظریے کس شکل میں کام آسکتے ہیں ۔ اس بحث سے پہلے نہایت مختصر طور پر میں اورینٹل کالج کی اس روایت کی چند خصوصیات بیان کرنے کی اجازت چاہتا ہوں جس کا ابھی ذکر ہوا ۔ اس سے میری غرض یہ ثابت کرنا ہے کہ تعلیم کا امتزاجی نظریہ یک طرفہ تعلیم کے پروگرام سے بدرجہا زیادہ نتیجہ خیز اور مفید ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ بعض سخت رکاوٹوں اور آزمائشوں کے باوجود جن میں سے بعض بڑی حوصلہ شکن تھیں ۔ اس کالج سے تربیت و تحقیق کی ایک مستقل تحریک نمودار ہو کر آگے بڑھی اور یہ دراصل کامیابی ہے اس تعلیمی دستور العمل کی جو ڈاکٹر لائٹنر کے پیش نظر تھی ۔

ڈاکٹر لائٹنر نے جو روایت ہمیں دی جہاں تک اورینٹل کالج کا تعلق ہے ہمیں وہ تین صورتوں میں نمایاں نظر آتی ہے ۔

اول ۔ اس علمی انداز نظر میں جو اس درس گاہ کی بنیادی خصوصیت ہے ۔

دوم ۔ اس رنگ تربیت میں جس کا تعلق اورینٹل کالج کے درس و افادہ میں ہمیشہ موجود رہا ۔

سوم ۔ اس طرز تصنیف میں جو اس کالج کے سب مصنفوں کی تحریروں کی بنیاد ہے ۔

جہاں تک علمی نقطۂ نظر کا تعلق ہے اس درس گاہ کی علمی روایت اصولاً کلا سکی ہے ــــــ اس کا سرچشمۂ حیات قدیم روایات قومی ہیں۔ وہ روایات اور کلا سکیت سے بے نیاز نہیں ہو سکتی ــــــ اس کے نزدیک اسکی انفرادیت اسی میں ہے کہ ان کلا سکی قدروں کا تحفظ کرے جن کا زمانی اور مکانی تسلسل عبارت ہے اس عظیم تہذیب و ثقافت سے جس کی عمر صدیوں کے نہیں ہزاروں سال کے پیمانے سے ناپی جا سکتی ہے ــــــ اس کی روایت پرستی کسی بے بصیرت گروہ کی کھوکھلی رسم پرستی کے مرادف نہیں بلکہ اس احساس کی پیداوار ہے کہ قوموں کی زندگی جھیل نہیں جوئے رواں ہے جس کی انتہا ــــــ ابتدا سے بے نیاز نہیں ہو سکتی جس کا انجام آغاز سے منقطع نہیں ہو سکتا ــــــ! اور آج، یہ تشبیہ اگرچہ کچھ اوپری اور اوپری سی معلوم ہو گی مگر یہ ضرور کہوں گا کہ اس کالج کی انفرادیت بھی کچھ کچھ اسی طرح کی ہے جس طرح مثلاً آکسفورڈ کی، جس کی روایت پرستی ہی اس کی زندگی ہے اوریئنٹل کالج کا امتیاز بھی روایات کی پیروی میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی سرگرمیوں میں تاریخ و تہذیب کا مطالعہ ہمیشہ اہم رہا ــــــ علمی لحاظ سے ڈاکٹر لائٹنر نے یہ سکھایا تھا کہ علم انسانی تنوع کے باوجود ناقابل تقسیم ہے ــــــ گویا علم ایک آفتاب ہے جس کی شعاعیں ہر طرف پھیل رہی ہیں اسلئے قدیم و جدید کے دو مختلف کیمپ ان کی روایت کے تصور میں کبھی نہیں آئے۔ اسی سبب سے جب کبھی علم کو اعلیٰ اور ادنیٰ دو طبقوں میں تقسیم کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس کالج کی روایت نے بلاخوف اسکے خلاف آواز بلند کی۔ اسکے نزدیک سب علوم برحق اور ضروری ہیں بشرطیکہ ان کی علمی غایت سچائی کی تلاش اور اعلیٰ صداقتوں کی جستجو اور اصلاح و تطہیر حیات ہو ــــــ تعلیم اور اس کے مختلف شعبے دراصل تقسیم فرائض حیات اور تقسیم عمل کا نام ہے ان سب کا مقصد ایک ہے ــــــ اور وہ مقصد ہے حسن عمل اور ادراک حقائق۔ یہی وجہ ہے کہ ان گیلریوں میں اور ان تدریسی کمروں میں قدیم جبہ و عمامہ اور جدید کوٹ پتلون یک جا جمع رہے ہیں ــــــ پرانے انداز کے علمائے متبحر اور

نئے طریقے کے فضلاے منقد باھم مل کر ایک ایسا ذھن تیار کرتے رھے ھیں جس میں کلاسیکیت جدیدیت سے بہت کچھ سیکھتی رھی اور جدیدیت کلاسیکیت سے بہت کچھ استفادہ کرتی رھی - چنانچہ ھمارے برگزیدہ اساتذہ کی صف میں ڈاکٹر لائٹنر اور شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد مولانا فیض الحسن اور ڈاکٹر وولنر اور مہامہوپادادھاے بھنڈاری جی ڈاکٹر سروپ اور پروفیسر محمد اقبال اور سادان بلگرامی ڈاکٹر شفیع اور شیرانی اور مولانا رسول خان اور موھن سنگھ اور بلدیو سنگھ ـــــ ایک ایسے امتزاج کا نمونہ پیش کرتے ھیں جس نے علمی افادہ و استفادہ کی اندرونی تحریک کو ھمیشہ قوت بخشی اور یہ وہ خاص بات ھے جو اس درسگاہ کے لئے ھمیشہ باعث امتیاز رھی ھے - اس درسگاہ میں تدریس کا ایک خاص نظریہ ھمیشہ کام کرتا رھا ھے اور وہ ھے استادانہ تدریس کے معاملے میں شخصی رابطہ اور وقتی پیمانوں کی قید کا نہ ھونا ـــــ یہاں پھر مجھے وہ بات دھرانی پڑتی ھے جو ایک مصنف نے آکسفورڈ کے تربیت کنندہ ٹیوٹروں کے متعلق کہی تھی ـــــ آکسفورڈ کا ٹیوٹر بڑا ھی مظلوم شخص ھوتا ھے اور آکسفورڈ کا طالب العلم بہت خوش قسمت ھوتا ھے کہ اس پر اس کا ٹیوٹر اپنی صحت اور آرام تک قربان کر دیتا ھے - اس کالج کی روایت بھی کچھ اس کے قریب قریب ھے اور شخصی تدریس کا طریقہ یہاں کا ایک عام طریقہ رھا ھے - ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ اور ان سب سے زیادہ کالج کو یہ بھی فخر ھے کہ علامہ اقبال کچھ دیر اس سے وابستہ رھے -

مولانا فیض الحسن سہارنپوری اس درسگاہ کے ایک استاد تھے جن سے شبلی نے کالج سے آتے جاتے تعلیم حاصل کی - سادان بلگرامی کالج کے پابند اوقات کے علاوہ بھی پڑھاتے رھتے تھے چنانچہ سیر کے اوقات میں بھی پڑھانے کی مثالیں موجود ھیں - یہی حال پروفیسر شیرانی اور مولانا رسول خان کا تھا جن کا سارا وقت شاگردوں کی تربیت میں صرف ھوتا تھا - اور یہ بات تقریباً سبھی اساتذہ پر صادق آتی ھے وللاکثر حکم الکل -

اس کالج کی روایت کا تیسرا اھم عنصر تصنیف و تالیف کا ایک خاص

رنک ھے ۔ کالج نے تصانیف کا ایک قابل توجہ ذخیرہ یاد در چھوڑا ھے ۔ اس میں جو تنوع اور افادیت ھے علمی قدر و قیمت کے لحاظ سے اس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اس تصنیفی تحریک نے ملک کی عام ادبی اور علمی فضا اور رجحانات پر بھی اثر ڈالا ھے اور بعض موضوعوں میں تو دنیا کے اھم حلقوں سے اعتراف حاصل کیا ھے ۔

جہاں تک اورینٹل کالج کا تعلق ھے یہاں کے مصنفوں نے مختلف ادوار میں مغرب سے بھی اثر قبول کیا ھے چنانچہ اس نے سر ولیم جونز اور گلکرائسٹ وغیرہ کی روایت کے علاوہ جو بنگال میں کافی ترقی کرچکی تھی انگلستان کے شرقی سماسوں سے بھی فیض حاصل کیا ھے ۔ ڈاکٹر لائٹنر لندن یونیورسٹی میں عربی کے استاد تھے ۔ ڈاکٹر ولنر اور ڈاکٹر سروپ آکسفورڈ کے نمائندہ تھے ۔ ڈاکٹر شیخ ، ڈاکٹر اقبال کیمبرج سے پروفیسر براؤن کے اثرات لائے محمد حسین آزاد ، فیض الحسن سہارنپوری ـــ سادان اور کسی حد تک شیرانی نے ملک کی روایات قدیمہ سے فیض پایا ۔

اردو ادب میں انجمن پنجاب کے مشاعروں اور جلسوں میں مولانا آزاد نے جس نئی تحریک کی داغ بیل ڈالی اور جو عظیم ادب پیدا کیا وہ محتاج تشریح نہیں ۔ مولانا فیض الحسن سہارنپوری کے ذریعے شبلی نے اثر پذیر ہو کر ادبی مطالعہ و تنقید میں جو ایک عظیم انقلاب پیدا کیا اس میں اورینٹل کالج کا بھی حصہ ھے ۔ ڈاکٹر لائٹنر کی کتاب سنین اسلام ھی نے شبلی کو تاریخ نگاری پر ابھارا اور ملک کے عام مصنفوں میں تاریخی شعور پیدا کیا ۔ ڈاکٹر لائٹنر ڈاکٹر وولنر شیرانی ڈاکٹر سروپ اگروال موھن سنگھ سوریا کانت اور بنارسی داس وغیرہ کی کتابوں نے لسانیاتی تحقیق کا ذوق پیدا کیا اور اس سے ایک تحریک پیدا ھوئی ۔ یہ سب وہ امور ھیں جن سے اھل علم اچھی طرح باخبر ھیں ۔ پروفیسر شیرانی کی پنجاب میں اردو کے بعد ، دکن میں اردو گجرات میں اردو سندھ میں اردو ۔ اور اب بنگال میں اردو اور سرحد میں اردو کا جو سلسلہ اب تک جاری ھے وہ شیرانی کی اولیت و امتیاز کا کافی ثبوت ھے ۔ ادب میں تاریخی تنقید و مطالعہ کے متعلق اور تاریخی تحقیق کی تحریک میں ان کا بڑا حصہ ھے ۔ ۱۹۲۰ء کے بعد جو تصنیفی سرگرمیاں خاص طور سے منظم ھوئیں وہ تین مختلف صورتوں

میں ظاہر ہوئیں ۔ اول کلاسیکل ادب کے شاہکاروں کی تصحیح و اشاعت ۔ دوم محض لسانیاتی تحقیق کی بجائے تاریخ و تہذیب اور تاریخی تنقید کی طرف توجہ ۔ سوم ادبی تنقید کا رجحان ۔ ان میں پہلا اور دوسرا عنصر ڈاکٹر سمیع پروفیسر شیرانی اور پروفیسر اقبال کا رہین منت ہے اور تیسرا کالج کے نئے مصنفین کا ۔ کالج کی طویل تصنیفی تاریخ میں یہ سب تنوعات ملتے ہیں مگر ان میں قدر مشترک جس کو میں ڈاکٹر لائٹنر کی روایت سمجھتا ہوں مطالعہ و تصنیف میں تاریخی شعور کا استعمال ہے ۔ کالج کی ساری تحقیقی کاوشوں میں یہاں تک کہ لسانیاتی تحقیق میں فلسفہ کی بجائے تاریخ اور واقعات کی صحت ہی عموماً پیش نظر رہی —— اسی طرح قطعیت اور جزئیات کی صحت اور ماخذ کے ساتھ کامل وفاداری ۔ یہ بھی ہمارے مصنفوں کا بڑا محبوب نصب العین رہا ہے —— انہوں نے اس پر اصرار کیا اور ان سے بے نیاز ہو کر محض اسلوب بیان کو چنداں اہمیت نہیں دی وہ کہنے کے انداز کی بجائے کام کی بات کہہ ڈالنے کے موید رہے ہیں ۔ یہاں کے مصنفوں نے فلسفی اور حکیم بننے کی بھی کبھی ہوس نہیں کی اگرچہ ڈاکٹر وولنز پروفیسر محمد اقبال اور پروفیسر شیرانی کا طریق کار کہیں کہیں فلسفیانہ ہے ۔ مگر یہ بزرگ اکثر حالات میں زبان دان اور مؤرخ ہی تھے ۔

کالج کی پرانی تصنیفی روایت تو یہی ہے مگر نیا زمانہ نئے رجحانات لایا ہے جس سے ہمارے نئے لکھنے والے بھی متاثر ہو رہے ہیں یعنی ملک میں سائنٹیفک ادبی تنقید کی جو زبردست تحریک چل رہی ہے اس میں جہاں اور کام کرنے والوں کا تذکرہ ہوتا ہے وہاں اس درسگاہ کے خاموش کارکن بھی عموماً یاد کرلئے جاتے ہیں ۔

جناب والا —— یہ وہ اہم تصورات و روایات ہیں جو اوریئنٹل کالج کی تاریخ حیات سے ہمیشہ وابستہ رہی ہیں ۔ ان تصورات میں اہل نظر کو کچھ خامیاں بھی نظر آئیں گی اور ان کے نتائج میں کچھ نقائص بھی ضرور ہونگے مگر مستقل عملی نتائج جن کا اس خطبے میں تذکرہ ہوا یقیناً ایسے ہیں کہ کوئی انصاف پسند شخص ان کی اہمیت سے انکار نہیں کریگا ۔ مگر

جیسا کہ ابتدا میں عرض ہوا میرا مقصود اس تفصیلی تبصرے سے ماضی کی مدح سرائی نہیں۔ میرا مقصد تو صرف یہ ہے کہ ماضی سے حال کی تعمیر اور مستقبل کی تخلیق میں کچھ مدد لی جائے اور تاریخ کے تجربات کو نئے مسائل کے حل میں صرف کیا جائے۔ یہی ایک عملی راستہ ہے اور اسی سے ہم حیات کے تسلسل کا سامان پیدا کرسکتے ہیں۔ چنانچہ اب میں ماضی کے حوالے سے اپنے موجودہ مسائل تعلیمی پر کچھ اظہار خیال کرتا ہوں۔

حضرات! تعلیم کا مسئلہ زندہ قوموں کے نزدیک بڑا اہم مسئلہ ہے۔ دولت خدا داد پاکستان بھی دنیا کی دوسری زندہ اقوام کی طرح اس بنیادی مسئلے کی اہمیت سے باخبر ہے اور کسی ایسے تعلیمی منصوبے کی تلاش میں ہے جو اس کی ملکی ضرورتوں اور قومی تقاضوں کے عین مطابق ہو۔ اس سلسلے میں حکومت نے کئی کمیشن بٹھائے اور کئی کمیٹیوں کی تشکیل ہوئی ہے جن کی انفرادی اور مشترکہ کوششوں سے تعلیمی عقدوں کے حل ہونے کی پوری توقع ہے۔ اور اس بات کی کامل امید ہے کہ ہمارے ماہرین تعلیمی مسئلے کے تمام پہلوؤں پر مفکرانہ اور محققانہ انداز میں غور کرینگے اور جلد کسی نتیجے پر پہنچیں گے تا ہم پرانے تجربات کا جائزہ لے لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

اب عام طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ جدید تعلیم اطمینان بخش ثابت نہیں ہوئی اور مختلف کمیشنوں اور کمیٹیوں کے تمرر نے بھی یہ ثابت کردیا ہے کہ اس میں اصلاح کی ضرورت ہے خصوصاً قیام پاکستان کے بعد اس کے نظام میں تبدیلی کی خاص ضرورت محسوس کی گئی ہے۔ موجودہ یونیورسٹی کی تعلیم میں دو کمزوریاں بتائی جاتی ہیں ایک تو یہ کہ اس سے سیرت و شخصیت کی تعمیر نہیں ہوتی دوسری یہ کہ اس میں سطحیت اور ہرفن مولائیت کے سبب کھوکھلا پن پایا جاتا ہے اور علمی گہرائی پیدا نہیں ہوتی جس کے نتیجے کے طور پر ماہرین اور متخصصین کی تعداد ملک میں روز بروز کم ہوتی جارہی ہے اور آزاد غور و فکر اور ایجاد و اختراع کا مادہ بالکل مفقود ہوگیا ہے۔ ہماری یونیورسٹیوں نے یوں تو اپنے

دائرۂ اخبارمیں تعلیم کی بڑی خدمت کی ہے اور تعلیم یافتہ طبقے کی توسیع میں ان کا بڑا حصہ ہے جس کو نظر انداز نہیں کیاجا سکتا ۔ مگر ہماری یونیورسٹیاں روزاول سے داخلی اورخارجی تضاد کا شکار رہی ہیں۔ اس بنا پر یہ یونیورسٹیاں (جہاں تک میں غور کرسکا) آج تک کوئی بڑی علمی اور مجلسی روایت پیدا نہیں کر سکیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری یونیورسٹیوں سے فیض پانے والوں میں عموماً اجتہاد و اختراع کی صلاحیت پیدا نہیں ہوئی نہ اس سے کسی ایسی فکری بلندی کے غیر معمولی آثار نمودار ہوئے جن سے اس کے فیض یافتگان میں کوئی احساس سربلندی پیدا ہوتا ہو ۔ مگر ان خامیوں کا باعث صرف تضاد نہیں (کیونکہ ذرا سا تضاد تو ہر جگہ کسی نہ کسی مرحلے پر پیدا ہو ہی جاتا ہے ۔ چنانچہ آکسفورڈ کے متعلق تو یہاں تک کہہ دیا گیا ہے :

An interpretation of Oxford could be written in epigrams but also in parodoxes . . . .
Oxford is indeed a paradox or rather a series of paradoxes'' (*Universities of the World* by C. Franklin Thwing, pp 1-2)

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بڑی روایت کا فقدان محض تضاد کا نتیجہ نہیں بلکہ اس کے اسباب کچھ اور بھی ہیں جن کے باعث یہ ظاہری تضاد آکسفورڈ کی طرح انفرادی امتیازات میں تبدیل نہیں ہو سکے ۔ اس کا سبب میرے نزدیک ایک تو یہ ہے کہ ہندوستان کی یونیورسٹیاں از ابتدا تا انتہا حاکموں کی دلی توجہ سے محروم رہی ہیں اور اندرونی تضادات کی وجہ سے ان کی مثال ایک ایسی عمارت کی رہی ہے جس کے کئی مالک ہوں جن میں سے ہر مالک اپنے اپنے خیال کے مطابق جہاں جس کا بس چلے ایک ایک کمرہ بڑھاتا جائے۔ بس جو شکل اس عمارت کی ہو سکتی ہے وہی شکل ہماری یونیورسٹیوں کی بنتی رہی ہے ایسی حالت میں ''یونیورسٹی لائف'' کی ان برکات کا پیدا ہونا جن سے کوئی امتیازی روایت آبھرتی ہو ناممکن تھا اور سچ پوچھئے تو مسٹر کہ ہندوستان کی بہت بڑی یونیورسٹیوں (مثلاً کلکتہ اور بمبئی) میں بھی آکسفورڈ اور کیمبرج کی سی روایات پیدا نہیں ہوسکیں ۔

دنیا کی بڑی یونیورسٹیوں کا مقصد یا نو صحائی کی جستجو اور اس کی اشاعت ھے ۔ بعض یونیورسٹیاں فکری صلاحیتوں کو ابھار کر اعلیٰ اور کامل شخصیتوں کی تعمیر و تخلیق در نظر رکھتی ھیں ۔ ایک تیسری قسم کی یونیورسٹیاں وہ ھیں جن میں '' کامیاب زندگی کا فن '' سکھایا جاتا ھے جس کے سہارے دنیوی زیرکی اور ھوس مندی پیدا ھوتی ھے ۔ ھماری اکثر یونیورسٹیاں اس آخری صف میں تھیں جو سب سے نیچے کی صف ھے اور اس کا بڑا سبب تھا تعلیم میں کسی قومی نظرئے کا نہ ھونا اور غیر ملکی حکومت کا وجود ۔

پاکستان کے تعلیمی احیا کے وقت یہ دیکھنا ضروری ھے کہ آئندہ کے تعلیمی منصوبے بھی ان کمزوریوں کا شکار نہ ھو جائیں جن میں مبتلا ھو کر پچھلی یونیورسٹیاں ناکام رھیں ۔ میرے نزدیک پاکستان میں یونیورسٹی تعلیم کے ہر نئے منصوبے میں چند اھم اصول مد نظر رھنے چاھئیں سب سے پہلے پاکستان کے تعلیمی پروگرام کی تشکیل میں پاکستانی قوم کے مخصوص ذھن ، مزاج اور روایات کا ضرور خیال رکھنا چاھیے ۔ اس کے لئے ضروری ھے کہ ھمارا تعلیمی دستور العمل ھمارا اپنا تعلیمی دستور العمل ھو اکسفورڈ لنڈن امریکہ اور دوسرے ممالک کے نمونوں کی بے جا تقلید نہیں کرنی چاھئے ۔ ڈاکٹر لائٹنر کا یہ نظریہ کہ

"Education is everywhere the result of the specific national character, laws and religion."

آج بھی اسی طرح ایک محکم اساس کا درجہ رکھتا ھے جس طرح ایک صدی قبل قابل توجہ تھا ۔ اس میں ھمارے لئے یہ مفید مشورہ موجود ھے کہ ملکی تعلیم کے لئے اپنا مخصوص نظریہ ھونا چاھئے جس میں کسی کی تقلید ضروری نہیں ملکی تعلیم قومی تہذیب و ثقافت کے تقاضوں سے منقطع نہیں ھونی چاھئے ورنہ ملک ذھنی انتشار اور فوضویت میں مبتلا ھو جائے گا ۔ اور اس طرح جو قوم تعلیم پا کر نکلے گی وہ ایسی ھوگی جو خود کے احساس و شعور سے بیگانہ اور علمی افلاس اور ذھنی یتیمی میں ھمیشہ مبتلا رھے گی ۔

نصابوں میں جہاں تدریجی تخصص (Specialisation) کا اصول مدنظر رہنا چاہئے وہاں اعلیٰ ادنیٰ کی تقسیم و تفریق بھی روا نہ رکھی جائے۔ میں تخصص پر بھی زور دیتا ہوں۔ تعلیم کا منصوبہ اس طرح تیار کیا جائے جو میٹرک کے بعد زیادہ سے زیادہ تخصص کی طرف بڑھتا جائے۔ مگر یہ تخصص مساوات کے اصول پر قائم ہو یعنی جو شخص علم کی جو شاخ اختیار کرنا چاہے اختیار کرے اور حکومت اور یونیورسٹی کی نظر میں علم کی سب شاخیں یکساں طور پر وقیع ہوں۔ ہماری موجودہ تعلیم میں تخصص کی منزل بی۔ اے کے بعد آتی ہے اور وہ بھی بے ڈھنگی سی۔ یہ صحیح نہیں۔

محکومی کے دور میں علم کو اعلیٰ اور ادنی طبقوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ خاصی مدت تک کالجوں میں عربی فارسی اور سنسکرت کے لکچراروں کو بی ای ایس کے قابل اس لئے نہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ عربی فارسی اور سنسکرت کے فارغ التحصیل تھے۔ تعلیم کے ہرنئے دستور العمل کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس میں علوم مشرق کو نمایاں مقام حاصل ہو چنانچہ لوئر سکنڈری درجے کے بعد تخصص کا ایک تدریجی پروگرام نافذ ہو جس میں مختلف گروپ ہوں اور ان گروپوں میں ایک گروپ علوم مشرق اور علوم دینی کا بھی ہو اور جو طلبا اس گروپ کو اختیار کریں ان کا درجہ حکومت اور یونیورسٹی میں دوسرے گروپوں سے کسی طرح کم نہ ہو۔ اس کے علاوہ قومی تہذیب اور قومی تاریخ کا عنصر پرائمری سے لے کر انتہائی درجے تک مجموعی تعلیمی منصوبے میں شامل کیا جائے خصوصاً پرائمری اور مڈل کے درجوں تک اس کی بنیاد زیادہ مضبوط ہو اس کے بعد کی منزلوں میں کسی معقول پیرائے میں یہ عنصر اسطرح شامل کیا جائے کہ اس سے تخصص کی ضرورتوں پر برا اثر نہ پڑے۔

ڈاکٹر لائٹنر کے تعلیمی تجربوں سے ہمیں یہ بھی سبق ملتا ہے کہ یونیورسٹی تعلیم میں متوازی تخصص کا اصول نافذ کیا جائے، آج متوازی تخصص کے بغیر مختلف علوم میں ماہرین کامل کا فقدان ہوتا جا رہا

ہے اور ایک ایسا گروہ بڑھتا جا رہا ہے جس پر " پسں ملا طبیب اور پیس طبیب ملا اور پسں ہر دو ہیچ اور پیس ہیچ ہر دو" کی پھبتی خوب چسپاں ہوتی ہے - اس ہر فن مولائیت سے اعلیٰ تعلیم اور خواندگی کے درمیانی فاصلے بہت کم ہوگئے ہیں غیر معمولی شخصیتوں کی تعداد بالکل گھٹ رہی ہے - میں سمجھتا ہوں کہ طالب العلم کو بے شمار مضمونوں کے طوفان میں اس طرح نہ ڈال دیا جائے کہ آخر میں وہ یہ بھی نہ بتا سکے کہ اس کا وہ خاص مضمون کونسا ہے جس نے اس کے دل و دماغ پر خاص طور سے قبضہ کیا ہوا ہے ، شاید یہ کہہ دیا جائے کہ امریکہ میں ایسا ہوتا ہے مگر امریکہ کا ہر عمل ضروری نہیں کہ ہمارے لئے مفید ہی ہو - اور یہ عموم البلوی تو بے حد مضر معلوم ہوتا ہے -

میں اس موقع پر علوم مشرقیہ کے پرانے نظام اور علوم دینی کے پرانے نطامات کے متعلق بھی یہ عرض کروں گا کہ ان علوم کے پرانے نظام کی بھی سرپرستی کی جائے - علوم مشرق کے دینی حصے کی سرپرستی انگریزی حکومت کے زمانے میں نہیں ہوئی اور یہ خدمت غریب عالمان دین اور غریب عوام تنہا ہی انجام دیتے رہے ہیں - اب اپنی حکومت میں ان علوم کی سرپرستی ایک فرض عین ہے - علوم دین کو پرانے پس منظر میں دیکھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے اگرچہ ان کی تعبیر و تشریح کے لئے جدید نقطہ نظر اور نئے طریقہ ھائے فکر سے فائدہ اٹھانے میں کوئی نقصان نہیں بلکہ سراسر فائدہ ہے - مگر دینی علوم کو بالکل اپنے حال پر چھوڑ دینا قومی فرائض سے کوتاہی ہے - اس لئے ہمارے تعلیمی نگران کبھی کبھی مسجد کے حجروں تک بھی پہنچ جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں - علوم مشرقی کا وہ نظام جس کو انگریزی حکومت کی سرپرستی حاصل رہی ہے مناسب یہی ہوگا کہ اپنی حکومت کے زمانے میں اس کی بھی پوری پوری حوصلہ افزائی کی جائے اور اگر اس میں اصلاح و ترمیم کی ضرورت ہو تو وہ بھی کر لی جائے - اگرچہ میری شکایت یہ ہے کہ علوم مشرق کے معترض اکثر

اصلاح کا مطالبہ کرتے رہے ہیں لیکن جب اصلاح کا پروگرام پیش کیا جاتا ہے تو اس کو قبول نہیں کرتے۔ بہر حال اصلاح و ترمیم تو زندگی کا اصول ہے اس لئے اس سے کسی کو بھی انکار نہ ہوگا مگر شرط یہ ہے کہ علوم مشرق کو دوسرے علوم کے ساتھ برابر کی رعایتیں دی جائیں اور اس کے فارغ التحصیل لوگوں کے لئے وہ سب راستے کھولے جائیں جو دوسروں کے لئے کھلے ہیں۔

جناب والا !

اب میں نظام تعلیم میں قومی زبان کا ذکر کرتا ہوں اور اس سلسلے میں پھر ان نظریات تعلیمی کا حوالہ دیتا ہوں جن پر انجمن پنجاب اور ڈاکٹر لائٹنر نے اصرار کیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ تعلیم میں قومی زبان کی اہمیت اتنی واضح اور تسلیم شدہ ہے کہ اس پر زیادہ بحث تحصیل حاصل سے کم نہیں ہو گی۔ کوئی قوم قوم نہیں جس کی کوئی اپنی زبان نہ ہو۔ یہاں تک کہ نبی کیلئے بھی لسان قوم کی شرط قرآن مجید میں موجود ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہماری حکومت قومی زبان کے مسئلے کو اسی طرح محسوس کر رہی ہے جس طرح ہم محسوس کر رہے ہیں اسلئے مجھے یقین ہے کہ ملک کے نئے تعلیمی منصوبوں میں بلکہ دفتر اور سرکار میں بھی قومی زبان کا حق فوقیت اب ضرور تسلیم کر لیا جائے گا اور اس کو تعلیم عدالت اور کاروبار میں وہ جگہ عملی طور پر دے دی جائیگی جس پر آج ملک کا ہر با شعور فرد مصر ہے۔ خصوصاً مغربی پاکستان کی وحدت کے بعد تو ایک ایسی مشترک قومی زبان کا وجود نا گزیر ہے جو علاقائی زبانوں سے ہمدردی رکھتی ہو اور ان سے قوت بھی حاصل کر سکتی ہو، ظاہر ہے کہ اس قومی زبان سے وحدت ملک کی بنیادیں اور بھی مستحکم ہوں گی اور تعلیم اشاعت علوم کی دشواریاں بھی دور ہو جائیں گی۔ جہاں تک اردو میں علوم کی تعلیم کا سوال ہے یہ تو مسلم ہے کہ اس بارے میں اصول وہی درست ہے جس پر انجمن پنجاب نے قریباً ایک صدی قبل اصرار کیا تھا یعنی علوم اپنی ہی زبان میں پڑھائے جائیں مگر اگر اس معاملے میں سائنس کے ماہرین کے شکوک

اور بعض استادوں کی سہل انگاری سدّ راہ ثابت ہوتی ہو تو مناسب یہ ہے
کہ ذریعہ تعلیم کے بدلنے کا ایک معقول پلان تیار کیا جائے - جس کی
رو سے ذریعۂ تعلیم کو بتدریج ایک معین مدت کے اندر اندر بدل دیا جائے -
میں انگریزی زبان و ادب کے مداحوں میں سے ہوں مگر مجھے اس سے
اتفاق نہیں کہ سائنس کی تعلیم ہمیشہ ہمیشہ غیر ملکی زبان میں ہوتی رہے
یہ چیز قومی خود داری احساس خود اعتمادی اور فطری اصول تعلیم کے خلاف
ہے - اس سلسلے میں کتابوں کی دقّت کا بھی اکثر ذکر کیا جاتا ہے - مگر
میری عاجزانہ گزارش یہ ہے کہ یہ دقّت تو دور کرنے سے ہی دور
ہوگی - صرف سوچنے سے تو دور نہیں ہو سکتی - اس کے لئے ایک
اکیڈمی کی تشکیل کی بیحد ضرورت ہے مگر یہ یاد رہے کہ اس معاملے میں
بھی ڈاکٹر لائٹنر کی یہ نصیحت مد نظر رکھنی پڑے گی کہ مغربی
علوم کو انگریزی میں پڑھانے کیلئے ترجموں کی ضرورت اتنی نہیں -
جتنی مخلص استادوں اور مصنفوں کی ضرورت ہے اور ڈاکٹر لائٹنر کا تو یہ
عقیدہ تھا کہ علمی کتابوں کے ترجمے ہو ہی نہیں سکتے - کیونکہ اصطلاحی
الفاظ کے اردو مرادفات اکثر حالات میں نا قابل فہم ہی رہتے ہیں -
ایک اصطلاح ترجمہ ہو کر خاصی مدت کے بعد اپنے مفہوم کا سکہ دلوں پر
بٹھاتی ہے اور شروع شروع میں اکثر بیکار ہی ہوتی ہے اسلئے وہ اصطلاح
کے ترجمے کے خلاف تھے - وہ یہ چاہتے تھے کہ اصطلاح بہت سے
لفظوں میں واضح کی جائے - خیر ان کے اس خیال سے اختلاف بھی
کیا جاسکتا ہے مگر ان کے اس مشورے میں بڑا وزن معلوم ہوتا ہے
کہ اردو میں علمی کتابوں کے محض ترجمے نہ کئے جائیں - بلکہ مستقل
کتابیں لکھی جائیں جن میں متعلقہ علوم کے اہم مطالب مغربی کتابوں سے
لے کر اپنی زبان میں ڈھال دیئے جائیں - چنانچہ انہوں نے سنین اسلام کے
دیباچے میں لکھا ہے :

Most European books cannot be translated
at all . . . .
They have to be re-written . . . . .

In Urdu we do not want translations we want adaptation. (دیباچہ سنین اسلام)

ڈاکٹر لائٹنر کی ان تصریحات میں ترمیم و اضافہ کی گنجائش سہی مگر اصولاً ان کی رائے وسیع معلوم ہوتی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اصطلاحات کے بین الافوامی ذخیرے کو اکثر حالات میں جوں کا توں اردو میں ڈھال کر علوم کی مستقل کتابیں اردو میں اگر لکھی جائیں تو تعلیم کا مسئلہ بہت حد تک حل ہو جاتا ہے مگر اس کے لئے ایک ایسی اکیڈمی کی ضرورت ہے جسکے پاس روپیہ ہو اور اس پر حکومت کا سایہ بھی ہو جس کے نیچے مصنف امن و اطمینان سے بیٹھکر کتابیں لکھ سکیں۔ اطمینان کے بغیر تو دنیا کا کوئی بڑا کام انجام نہیں پاسکتا۔

حضرات — یہ ہے تعلیم کی کہانی کچھ میری کچھ لائٹنر کی زبانی! افسوس ہے کہ میرے خیالات اختصار کی پوری کوشش کے باوجود تکلیف‌دہ حد تک پھیل سے گئے ہیں میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے طول کلام سے میرے محترم سامعین کچھ پریشان بھی ہوئے مگر میری ہوس تھی کہ مدعا کی ساری بات کہدوں بہر حال میں معذرت خواہ بھی ہوں اور شکر گزار بھی۔ میں نے آپ کی اجازت سے تعلیم کا وہ نظریہ آپ کے سامنے رکھدیا ہے جو سابقہ پنجاب یونیورسٹی خصوصاً اوریئنٹل کالج کی تأسیس کا محرک ہوا تھا۔ مگر تقریباً ایک صدی گزر جانے پر بھی اس کی بہت سی باتیں مجھے کار آمد ہی نظر آئی ہیں کم از کم میں قومی اور تہذیبی لحاظ سے ان میں سے بعض نظریات میں بڑی تازگی پاتا ہوں۔ میں نے اس امید سے ان کو آپ کے سامنے دھرا بھی دیا ہے کہ کل کے تجربوں سے آج کے کاموں میں شاید کچھ مدد مل جائے۔ اور۔ جہاں تک اس کالج کا تعلق ہے سو اس کے خاموش کارکن تعمیر ملت کے ہر پروگرام میں ملک کی ہر خدمت کے لئے تیار ہیں بشرطیکہ ان کو ان کی اصلی روایات۔ کلاسیکی علوم اور تصنیفی کاموں کے لئے وقت و

اطمینان ملتا رھے ـ اس طرح وہ ملک اور قوم کی خدمت بھی کرتے رھیں گے اور اپنے کالج کی قدیم ارواح پاک کو بھی خوش رکھ سکیں گے جن میں سے اکثر میری نظر سے دیکھئے تو اس وقت ـ وہ سامنے کالج کے باھر برگد کے پھیلے ھوئے بڑ کی گھنی شاخوں کے سائے میں میری تقریر پر گوش بر آواز ھیں اور ملک کے روشن مستقبل کے لئے دست بدعا ھیں اور زبان حال سے گویا ھیں :

تلك آثار نا تدلّ علينا

فانظروا بعدنا الى الآثار

حضرات ! میں ایک بار پھر آپ کا شکریہ ادا کرتا ھوں اور آپ سے رخصت ھوتا ھوں -

مطبوعہ رہبر پرنٹنگ پریس ، لاھور باھتمام مرزا محمد صادق

خطبہ صدارت

ڈاکٹر رضی الدین صدیقی — وائس چانسلر پشاور یونیورسٹی
جو کالج کے یوم تاسیس ۱۹۵۵ء کے موقعہ پر پڑھا گیا

اس اجلاس میں شرکت میرے لئے اس وجہ سے بھی باعث مسرت ہے کہ جس عظیم الشان دانشگاہ سے اس کالج کا تعلق ہے اس کی دوسری درسگاہ کا میں بھی ایک خادم ہوں اور میرا ایمان ہے کہ دونوں درس گاہوں میں ممکن اشتراک عمل ہونا چاہئیے تاکہ ملک کے مخصوص حالات کے پیش نظر علم و فن کی صحیح خدمت ہوسکے۔

اگرچہ حالات نے مجھے سائنس اور اس کے بعض مخصوص علوم کے ساتھ وابستہ کردیا ہے لیکن میں کوشش کرتا ہوں کہ کبھی کبھی ماحول سے نکل کر جو حقیقت میں مادی اقدار کا ماحول ہے ایسی فضا میں قدم رکھوں جہاں اخلاق اور روحانی اقدار غالب ہوں۔ یہ دنیا کس قدر خوش آئند ہے اس کا اندازہ آپ شاید مشکل سے کرسکیں گے۔

جن لوگوں نے نوع انسان کی موجودہ حالت اور کش مکش پر غور کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ اس کی زیادہ تر وجہ عمرانی اور ثقافتی علوم کی پستی ہے کیونکہ یہ علوم طبی سائنس کی ترقی کا ساتھ نہیں دے سکے۔ انسان لگاتار مادی دنیا کے اسرار بے نقاب کرتا چلا جا رہا ہے لیکن ستاروں کی گذرگاہوں کا یہ متلاشی خود اپنے افکار کی دنیا میں سفر کرنے اور اپنی شخصیت کے متعلق انکشافات کرنے کو اتنا اہم اور ضروری نہیں سمجھتا۔ ایسے ہی ایک انسان سے مخاطب ہو کر علامہ اقبال نے کہا تھا۔

دانش اندوختہ دل زکف انداختہ داغ‌ زان نقد گران مایا کہ درباختہ

علامہ مرحوم نے اس کا علاج یہ بتایا کہ ؎

زیرکی از عشق گردد حق شناس کار عشق از زیرکی محکم اساس

عشق چون با زیرکی هم بر شود نقش بند عالم دیگر شود
خیز و نقش عالم دیگر بنه عشق را با زیرکی آمیز ده

سائینس نے انسانوں کو تسخیر فطرت کا گر بتایا لیکن خود غرض انسانوں نے اس قوت کو غلط استعمال کیا ۔ اور سائنس کو جو خدا کی ایک بڑی نعمت تھی ۔ تباھی اور بربادی کا ذریعہ بنا دیا اسی لئے خود مغربی ممالک کے بڑے مقتدر سائنس دان اور رھنما بھی اب اس کا اعتراف کرتے ھیں ۔ کہ انسانوں کو محض علوم طبعی کی دنیا ھی کافی نہیں ھے بلکہ ان کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کو متوازن طور پر ترقی دینے کے لئے انہیں ثقافتی اور عمرانی علوم بھی ضرور پڑھانے چاھئیں ۔

لبرل ایجوکیشن کا بھی جس کا آج کل یورپ اور امریکہ میں اس قدر چرچا ھے یہی مقصد ھے ۔ یہی عمرانی علوم ھیں جنہیں ھمارے ھاں عام اصطلاح میں علوم مشرقی کہا جاتا ھے ۔

یہی علوم ھیں جنہوں نے زندگی کے ھر انتشار اور اضطراب میں اور انسانی ، روحانی اور اخلاقی اقدار کی افراتفری میں انسان کو سہارا دیا ھے ۔ اسے زندگی کی سیدھی اور سچی راہ دکھائی ھے عبد اور معبود کے تعلق کا مفہوم واضع کیا ھے اور زندگی کی مختلف سطحوں پر انسان کو انسان بننا اور دوسرے انسانوں سے ان کے حق اور رتبہ کے مطابق رشتے قائم کرنے کا سبق سکھایا ھے یہی علوم انسان کی تہذیب و تزکیہ نفس کا وسیلہ بنے ھیں انہی علوم نے فکر و تخیل کو استواری و ھمواری کی راھوں پر لگایا ھے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ انہیں علوم کے بعض شعبوں اور شاخوں نے دل کو سرمایہ سرور و انبساط بہم پہنچایا ھے ۔

یہی اسباب ھیں کہ سائینس کا ایک طالب علم ھونے کے باوجود مجھے کوئی ایسی صحبت ، جہاں علوم مشرقی اور ان کی روایتوں سے قرب کا موقع ملے بڑی غنیمت معلوم ھوتی ھے یہ علوم جو عربی فارسی اور اردو کی وساطت سے ھمیں ملے ھیں ھماری تہذیبی زندگی میں بڑی اھمیت رکھتے ھیں ۔ عربی کے ذریعے ھمارے دینی اور اخلاقی علوم کا سرمایہ ھم تک پہنچا ھے ۔ اور اس سرمایہ میں ایک مخصوص تہذیب کے انداز فکر اور

اسلوب تخیل کے بیش بہا خزانے پوشیدہ ہیں اور ان خزانوں کی روشنی میں قدم قدم پر انسانیت کا صحیح جلوہ دکھائی دیتا ہے۔

فارسی میں ہماری تاریخ کے ایک نئے دور کا تہذیبی سرمایہ محفوظ ہے زندگی کے مختلف شعبوں کا سارا حسن فارسی کی نثر اور نظم کے ذریعہ ہم تک منتقل ہوا ہے اور اردو نے اس سارے حسن کو ایک نئے رنگ اور نئی مہک کے ساتھ اپنے دامن میں سمیٹا ہے۔ اس طرح عربی فارسی اور اردو کا یہ مشترک تہذیبی اثاثہ ماضی کے ساتھ اور اس کی ان روایتوں کے ساتھ جو ایک مخصوص تہذیب، اخلاق، فکر اور تخیل سے وابستہ ہیں ہمارے رشتے مضبوط و استوار کرتا ہے ہمیں اپنی تاریخ میں، اپنے فلسفہ میں، اپنے ادب میں اور اپنے شعر میں ماضی کے وہ سارے نقوش صاف دکھائی دیتے ہیں جن سے ہمارے حال کی تعمیر و تشکیل ہوئی ہے —وہ سارے نقوش جو اجتماعی حیثیت سے اور انفرادی طور پر ہمارا سرمایہ ہیں، وہ نقوش جن کی مہر ہمارے ظاہر اور باطن دونوں پر ثبت ہے اور وہ نقوش جو ہر آنے والے زمانے میں ہمیں اپنے ماضی کے ساتھ وابستہ و منسلک رکھیں گے۔ اور ان کی بدولت ہماری اس زندگی کا تسلسل قائم رہے گا جو صدیوں کی روایتوں کو اپنے دامن میں سمیٹ کر عرب اور ایران کی راہوں سے ہم تک پہنچی ہے۔

علوم مشرق کی یہی دینی، اخلاقی، معاشرتی اور تہذیبی حیثیت اور اہمیت ہے جس کی بنا پر تاریخ ہند کے اسلامی دور میں ہم نے اپنے تعلیمی نصاب میں عربی اور فارسی کو ایک نمایاں جگہ دی تھی اور اس نصاب کا پورا خاکہ اس طرح مرتب کیا تھا کہ اس کی تکمیل کے بعد پڑھنے والے ذہنی و فکری اعتبار سے ایک خاص سطح تک پہنچ سکیں اور ان کی اخلاقی اور عملی زندگی ایک مخصوص رنگ اور اسلوب کی حامل بن سکے۔

اس نصاب تعلیم میں اس زمانہ کی ضروریات کے مطابق دینی اور تہذیبی علوم کا اتنا موزوں امتزاج تھا کہ اسے مکمل کرنے والوں کے اذہان و افکار کے علاوہ ان کے طبائع اور ان کی سیرتیں بھی اس سے متاثر ہوئی تھیں۔ اس طرح کے نصاب کی تعلیم و تدریس کے لئے ملک کے مختلف حصوں میں

ایسے تعلیمی ادارے قائم تھے جو اچھے استادوں اور موزوں ماحول کے ذریعے تحصیل علم کرنے والوں کی ذہنی اور اخلاقی تربیت اور نشوونما کر سکیں ۔ لیکن تاریخ کا وہ دور ختم ہوا تو آہستہ آہستہ ان اداروں پر بھی زوال آیا اور غیر ملکی حکومت کے مصالح نے عربی و فارسی کی درس گاہوں اور مشرقی علوم کی درس و تدریس کو ایک رسمی انداز دے دیا اور رفتہ رفتہ وہ علوم جو بجا طور پر انسان کو انسان بنا دینے کی صلاحیت کے دعویدار تھے محض ملمع سازی کی خدمت انجام دینے لگے ۔

آپ مجھے معاف فرمائیں گے اگر میں عرض کروں کہ ہمارے علوم اب بھی ملمع سازی کی یہ خدمت انجام دے رہے ہیں ۔ ہم نے بہت کم اس بات کی کوشش کی ہے کہ سیاست کے مصالح کے پھندوں سے نکل کر اپنے علوم سے وہی کام لینے کی کوشش کریں جو ہمارے اسلاف نے ان سے لیا تھا ۔ ہماری طرف سے ان علوم کے معاملے میں ایک سخت کوتاہی اور بھی ہوئی ہے جس کا خمیازہ آج ان علوم کو بھی بھگتنا پڑ رہا ہے اور جس کا شکار وہ سارا حلقہ ہے جس نے اپنے آپ کو ان علوم کے ساتھ وابستہ کر رکھا ہے

اس کوتاہی کی ابتدا کسی حد تک تو خود ہمارے اسلاف ہی نے کی تھی لیکن ہم نے اپنے بزرگوں کی معمولی سی کوتاہی کی بنیاد پر جو عمارت کھڑی کی ہے وہ بلندی میں گو ثریا تک پہنچتی ہے لیکن اس بلندی میں ایک ایسی کجی ہے جس نے اس کے سارے شکوہ کو ختم کردیا ہے ۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مشرقی علوم کے علم برداروں نے اپنے علوم کو دین ، اخلاق اور تزکیہ نفس کا حامل بنانے کے ساتھ ساتھ اس معاملہ میں خاصہ اہتمام کیا کہ یہ علوم دنیاوی آلائشوں سے پاک رہیں ۔ وہ روح کے ساتھ اپنا رشتہ ہموار و استوار کریں اور مادیت سے کوئی تعلق نہ رکھیں ۔ گوشہ‌گیری و گوشہ نشینی ان علوم کے علمبرداروں کا شیوہ و شعار رہا ۔ انہوں نے خورشید کی شعاعوں کو اپنی تنہائیوں میں مخل ہونے کی اجازت نہیں دی ۔ گو ان کا فکر و تخیل اس تنہائی میں بھی ماہ و خورشید کی بلندیوں تک پہنچا اور ان سے کسب نور کیا لیکن بدقسمتی سے فکر و تخیل کی یہ ساری پرواز عملی زندگی سے حقائق کی ٹھوس زندگی

سے بعد و بیگانگی کی علامت تھی اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہئیے تھا کہ انسان اس طرح کی تعلیم حاصل کر کے روح کی پاکیزگی اور تزکیہ نفس کے مفہوم سے آسنا ہو کر بھی زندگی کی سختیوں اور تلخیوں سے بیگانہ و نا آسنا رہے اور زندگی انسان کو قدم قدم پر جن آزمائشوں سے دو چار کرتی ہے وہ اس کے دائرہ فکر و عمل سے قطعی خارج رہیں ۔ اپنے ماحول کے ساتھ مطابقت وہم آہنگی پیدا کرنا اور اسے اپنے مقاصد کے سانچے میں ڈھالنا انسان کا بلند ترین منصب ہے ۔ مشرقی فکر اور مشرقی علم نے اس حقیقت کو نظر انداز کر کے اس سے جو بے اعتنائی برتی ہے مگر وہ ہمارے فکر و عمل کی روایت میں داخل ہو گئی ہے اور ہمارے علوم کا موجودہ نصاب اس بے عمل روایت کی ایک کڑی ہے ۔

علوم کی اہمیت اب بھی مسلم ہے عربی اور فارسی کی تہذیبی صلاحیتیں اب بھی آن کا طرۂ امتیاز ہیں ہمارے شاندار ماضی کے ساتھ اب بھی ہمیں گہرا لگاؤ ہے لیکن ضرورت اس کی ہے کہ اسی شاندار ماضی کو اپنی موجودہ ضرورتوں کے سانچے میں ڈھالیں ضرورت اس کی ہے کہ عربی اور فارسی کے سینوں میں علم و فن کے جو خزانے پوشیدہ ہیں انہیں نئے زمانے کی ضرورتوں اور نئے ماحول کے تقاضوں کی روشنی میں پرکھیں اور اپنے علوم کو محض سلف کی یادگار بنا کر سینوں سے چمٹائے رکھنے کے بجائے آن کی ترتیب و تدوین اس اسلوب سے کریں کہ وہ ہمارے زمانہ میں جو یقیناً ماضی کے ہر دور کے مقابلہ میں زیادہ سختیوں اور زیادہ آزمائشوں کا زمانہ ہے ہماری اسی طرح رہنمائی کر سکیں جیسی وہ ہمیشہ سے کرتے آئے ہیں ۔ ہمارے علوم ہی ہیں جو بے بس انسانیت کی پکار سن کر اسے فنا ہونے سے بچا سکتے ہیں لیکن ایک شرط ہے اور یہ شرط یقیناً بہت بڑی ہے ۔

یہ کڑی اور بڑی شرط یہی ہے کہ ہم اپنے علوم کی ان روایتوں کے ساتھ جو یقیناً ہمارے ماضی کی حسین یادگاریں ہیں اس طرح کا جذباتی لگاؤ باقی رکھنے کی عادت ترک کر دیں جس میں کسی معقول پسندی کو دخل نہیں ہوتا ۔ ماضی کی روایت بڑی محترم بلکہ مقدس شے ہے لیکن جب

روایت پسندی اور روایت پرستی کا احترام اور تقدیس ، زندگی کی ترقی کے راستوں میں حامل ہونے لگے تو ہمیں یہ سوچنے کی عادت ڈالی چاہیے کہ اس روایت کو کس طرح نئے اسلوب دے کر اور نئے سانچوں میں ڈھال کر زندگی کے لئے اور انسان و انسانیت کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید اور کار آمد بنایا جاسکتا ہے ۔

مجھے آپ کے جذبات ، خیالات و تصورات کا احترام ہے اور علوم مشرق کے بہت بڑے محسن ڈاکٹر لائٹنر کے ان تصورات کو بھی عزت کی نظر سے دیکھتا ہوں ۔ جن کی وضاحت آپ نے بڑی خوبی سے فرمائی ہے لیکن مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ علوم مشرقی کے جس اسلوب اور اس کی جس روایت کے آپ حامی اور علم بردار ہیں وہ محض ظاہری وضع قطع کی تبدیلی یا محض عماموں اور کوٹ پتلونوں کی یکجائی سے زمانہ کے ساتھ ہم آہنگ نہیں بن سکتی ۔ آپ کی تحقیق ، آپ کے انداز تصنیف و تالیف اور اس کی بنیادوں پر قائم کیا ہوا اسلوب درس، تدریس علمی حیثیت سے یقیناً مستحسن ہے لیکن اس عملی حیثیت کو زیادہ مستحکم بنانے کے لئے اور نئے زمانے میں اس کا جواز پیدا کرنے کے لئے اشد ضروری ہے کہ آپ تحقیق و تدقیق ، تصنیف و تالیف اور درس و تدریس میں ایسی تبدیلیاں کریں جو نئی ضرورتوں ، نئے تقاضوں اور نئے فکر و تخیل کا ساتھ دے سکیں ۔ تبدیلیوں کا اندازہ کیا ہو اور اس میں قدیم و جدید کا امتزاج کس طرح کیا جائے یہ بتانا میرا منصب نہیں میں تو اتنا جانتا ہوں کہ یہ کام آپ سے بہتر کوئی اور نہیں کر سکتا ۔ اس کے اونچ نیچ اور اس کی نزاکتوں سے جتنے واقف آپ خود ہیں کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا ۔ آپ کو اپنا علم عزیز ہے ۔ آپ کو عربی ، فارسی اور اردو کی روائتیں اور ان کا ماضی پیارا ہے ۔ آپ کے اسلاف نے یہ عزیز علم اور اس عزیز علم کی حسین روائتیں آپ کو دی ہیں ۔ اب آپ کا فرض ہے ۔ کہ ان روایات کو فرسودگی کے الزام سے بچا کر انہیں زیادہ حسین و جمیل اور اس سے بھی زیادہ مفید اور کار آمد بنا کر آنے والی نسلوں کے سپرد کریں ۔ تبدیلی کے اس عمل میں آپ کو حد درجہ کی فراخ دلی سے کام لینا چاہیے ۔ جو لوگ آپ کے علوم اور اس کے نظام کو فرسودہ کہتے ہیں ۔ ان کی

باتوں پر ٹھنڈے دل سے سوچئیے اور اپنے علوم کو قدامت اور فرسودگی کے الزام سے بچائیے۔اس میں شک نہیں کہ یہ کام ہے بڑا دشوار اس لئے کہ اعتراض کرنیوالے کبھی کبھی اعتراض ایسے لہجے میں کرتے ہیں کہ سننے والوں کو ان کے خلوص میں شبہ ہونے لگتا ہے ۔ اور وہ ان کی بات کو قابل اعتنا سمجھنے کے بجائے اس کی طرف سے منہ موڑنے پر مجبور ہوتے ہیں لیکن جہاں تک مجھے علم ہے اعتراض کرنے والوں کی نیتیں پاک اور صاف ہیں۔ علوم کی وہ اہمیت جس کا دوست و دشمن سب کو اعتراف و احترام کرنا چاہیے انہیں اصلاح کے خیال کی طرف مائل کرتی ہے اور شدت احساس سے ان کے لہجہ میں تلخی پیدا ہو جاتی ہے آپ تند و تیز لہجے میں سے اپنے کام کی بات نکال لیجئیے کہ آپ کے علوم کی روایت نے آپ کو یہ سبق بھی دیا ہے اور اس کے بعد آپ یہیں کر لیجئیے کہ علوم کی روایت میں مناسب ترمیم اور اس کے نصاب اور درس و تدریس میں موزوں تبدیلیاں ہو جانے کے بعد معترض مطمئن اور خاموش ہو جائیں گے اور اگر یہ سب کچھ ہو جانے کے بعد بھی آپ کو کوئی ایسا نظر آئے جو حقیقت میں آپ کے علوم کا دشمن ہے اور جو انہیں مٹانے کے درپے ہے تو آپ یقین رکھئیے کہ آپ کے علوم میں وہ جان ہے کہ کسی کے مٹائے مٹ نہیں سکتے ۔ تاریخ ، تہذیب ، تمدن اخلاق اور معاشرت کی روایتوں کے سلسلے کو مٹانا کسی کے بس کی بات نہیں ۔ یہاں دیے سے دیا جلتا ہے اور ماضی کی مشعلیں حال کو روشن کرتی ہوئی مستقبل کو منور کرنے کی ضامن بنتی ہیں لیکن اس شرط کے ساتھ کہ ماضی ہمیشہ اپنے آپ کو حال کے سانچے میں ڈھال کر مستقبل کی رہنمائی کی تیاری کرتا رہے ۔

آپ مجھے اس تلخ نوائی کے لئے معاف فرمائیں لیکن تلخ نوائی اس لئے ہے کہ میرے دل کا درد سوا ہے جو علوم مشرق ، جو عربی ، جو فارسی اور جو اردو مجھے عزیز ہے اس کی زبوں حالی اور رسوائی مجھ سے دیکھی نہیں جاتی لیکن اس ساری تلخ نوائی کے پیچھے سکون و اطمینان کی ایک ایسی لہر بھی ہے جو اس تلخی کو کم کرتی ہے ۔ امید کی ایک کرن ہے جس نے ایک روشن مستقبل کی جھلک دیکھائی ہے ۔ سکون و اطمینان کی یہ لہر اور

امید کی یہ کرن آپ کے کالج کا وجود ہے جس نے ۸۶ برس تک ہر طرح کی دشواریوں میں علم و فن کی خدمت کی ہے اورینٹل کالج نے علوم مشرق کی روایت کو زندہ رکھنے، انہیں ترقی دینے اور بدلتے ہوئے حالات سے ہم آہنگ رکھنے کی جو بیش بہا خدمت انجام دی ہے اس کی شہادت قدیم و جدید تصانیف اور تحقیقات کا وہ ذخیرہ ہے جو اس وقت ایک سیدھی سادی لیکن جلیل القدر نمائش کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے میری درخواست ہے کہ ماضی میں کالج کے اساتذہ اور طلباء نے اپنے علوم کی روشنی کو عام کرنے کا جو منصب اپنے ذمہ لیا تھا موجودہ زمانہ کے استاد اور طالب علم اسے بوجوہ احسن پورا کر سکیں گے اور ہمت و استقلال کے ساتھ دینگے۔ اخلاق، تہذیب و تمدن کی روایتوں کے پرچم کو ہمیشہ کی طرح اونچا رکھیں گے ۔ ماضی اور حال کا یہ علمی رابطہ اور تسلسل بہت ضروری ہے اس لئے کہ عربی فارسی اور اردو کو ثقافتی اور تہذیبی تقاضوں کا حامل بنانے کے لئے ہمیں ماضی کی اساس پر کام کرنا پڑے گا ۔ یہ یونیورسٹی اورینٹل کالج میرے نزدیک پاکستان میں مشرقی علوم کا سب سے بڑا مرکز اور اساس ہے جسے مستقبل کے بڑے بڑے ثقافتی تہذیبی اور علمی منصوبے کی بنیاد بنایا جاسکتا ہے دوسرے لوگ اس اہم مرکز اور مضبوط اساس سے وہ کام لیں گے جو انہیں لینا چاہیے لیکن آپ خود ان ضمنی چیزوں سے بے نیاز ہوکر اپنی اس روایت سے جس کی پاسبانی کا شرف آپ کو حاصل ہے ایسا کام لیجئے جو دوسروں کو آپ کی طرف دیکھنے اور آپ کے کام کو اپنے لئے شمع ہدایت بنانے پر مجبور کرے

اس ضمن میں سب سے پہلے تو عربی اور فارسی کے ان علوم کو محفوظ کرنے، ترقی دینے اور نئے سانچوں میں ڈھالنے کا سوال ہے جن کا ذکر میں اب تک کرتا رہا ہوں اور یہ سمجھ کر کرتا رہا ہوں کہ میری طرح آپ کے ذہن میں بھی یہ بات اچھی طرح موجود ہے کہ قیام پاکستان نے ہمارے لئے ان علوم کی دینی تاریخی، ثقافتی اور تہذیبی اہمیت میں کئی گنا اضافہ کر دیا ہے اور ان کے تحفظ و ترقی کا مسئلہ ہمارے لئے پہلے سے کہیں زیادہ مقدس فریضہ بن گیا ہے نہ صرف یہ بلکہ یہ علوم اب خالص

دنیاوی ، مادی ، سیاسی اور معاشرتی نقطہ نظر سے بھی بہت اہم بن گئے ہیں ۔ انہی کی وساطت سے ہم اپنے ہمسایہ ملکوں کے دلوں میں قرب حاصل کرسکتے ہیں ۔

دوسرا سوال اپنے نئے ملک کے لئے ایک ایسی زبان کے اختیار کرنے کا ہے جو تہذیبی اور ثقافتی اہمیت کی حامل ہونے کے علاوہ ہماری دنیاوی ضروریات کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو بلا شبہ یہ زبان اردو ہے لیکن جس طرح ایک حلقہ عربی و فارسی کو فرسودہ کہہ کر اس کی اہمیت گھٹاتا ہے اسی طرح اردو کے امکانات کی طرف سے بھی شبہات کا اظہار کرتا ہے اس طبقہ کا خیال ہے کہ اردو میں ابھی اتنی صلاحیت نہیں کہ وہ سرکاری کاروباری اور تعلیمی کاموں میں اظہار کا موزوں اور موثر وسیلہ بن سکے ۔ ایسے لوگوں کو بحث و تمحیص سے قائل کرنے کی کوشش سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ ہم اپنے پچھلے تجربات کی بنا پر اردو سے وہ سب کام لیں جو وہ ہندوستان کے بعض حصوں میں (اور خصوصاً حیدرآباد میں) بڑی کامیابی سے انجام دیتی رہی ہے۔ میرا ذاتی تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ اردو نے سرکاری کاروباری اور تعلیمی ضروریات کو بڑے موثر انداز میں پورا کیا اور اس سے ایسے نتیجے برآمد ہوئے جو نہ صرف اردو والوں کے لئے باعث فخر و امتیاز ہیں بلکہ اس نقطۂ نظر سے بے حد اہم ہیں کہ اس سے اردو کی غیر معمولی افادی صلاحیت اور عملی امکانات پر روشنی پڑتی ہے حیدر آباد کا یہ وسیع تجربہ ہمارے شبہات دور کرنے کے لئے کافی ہے لیکن ایک بات البتہ ہے ۔ ہماری موجودہ ضرورتیں حیدرآباد کی ضرورتوں سے ذرا مختلف ہیں اور ان کا انداز یقیناً وسیع تر ہے ۔ سرکاری اور تعلیمی ضرورتوں کے لئے ہمیں الفاظ کے سرمائے کو بڑھانے اور اظہار کے اسالیب میں وسعت پیدا کرنے کی ضرورت ہوگی ۔ اور قدم قدم پر اردو کی لچک اور ہمہ گیری کا امتحان لینا پڑے گا ۔ یہ کام ان لوگوں کا ہے جو اردو لکھنے پڑھنے کے کاموں میں مصروف ہیں ۔ اس سلسلے میں میری نظر سب سے پہلے آپ کے کالج پر پڑتی ہے اردو کو پاکستان میں اس مرتبہ پر فائز اور مستحکم کرنے کے لئے جو اسے تہذیبی و ثقافتی اعتبار سے حاصل ہے ہمیں اپنی

تصنیف و تالیف اور تحقیق و تدقیق کا انداز بدلنے کی ضرورت ہے اور اس بدلے ہوئے انداز کے ماتحت اردو کے نصاب کی از سر نو ترتیب کی طرف متوجہ ہونا ہے۔ تا کہ اردو جو بزم سازی اور انجمن آرائی کے سارے محاسن سے مزین ہے اس قابل بھی ہوسکے کہ بزم و انجمن سے نکل کر دنیاوی کاروبار اور مدرسہ و خانقاہ میں بھی اپنا مقام پیدا کر سکے۔ تاریخ ، فلسفہ ، نفسیات اور الٰہیات کے علوم ہم اب تک کامیابی سے پڑھاتے رہے ہیں سائنس اور ریاضی کی تدریس کے سلسلے میں بھی کامیاب تجربے ہوچکے ہیں لیکن ہمیں اس بات پر غور کرنا ہے کہ ہم کس طرح اردو کو اس قابل بنائیں کہ وہ سائینس کے بڑھتے ہوئے علم کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کے قابل ہو سکے۔ یہ سارے کام کسی ایک ادارے یا کسی محدود یا مخصوص جماعت کے کرنے کے نہیں اور اس لئے ظاہر ہے کہ قوم یہ سارا بوجھ آپ پر اور آپ کے عدیم المثال علمی ، تحقیقی اور تعلیمی ادارے پر نہیں ڈالے گی لیکن وہ ہر طرح کی رہنمائی کے لئے آپ کی طرف نگراں ضرور ہو گی۔ قوم اور ملک کی اس توقع کو پورا کرنا آپ کا فرض ہے مجھے یقین ہے کہ آپ نے جس طرح ماضی میں ان علوم کی شاندار روایت کے تحفظ کا بار اٹھایا ہے اسی طرح حال اور مستقبل میں بھی اس کے تحفظ کے امین بنیں گے۔ خدا آپ کو آپ کے منصوبوں میں کامیاب کرے اور آپ کے ماضی اور حال کے درمیان صحیح ربط پیدا کرنے کی وہ خدمت لے جس کے آپ بجا طور پر اہل اور حق دار ہیں آمین۔

ڈاکٹر سید عبداللہ

استاد بزرگ میری نظر میں

ڈاکٹر مولوی محمد سمیع کی ذات گونا گوں کمالات اور خوبیوں کا مجموعہ ہے اور وہ سیرت اور علمی فضلیت کے لحاظ سے مشرق جدید کی ممتاز ترین علمی شخصیتوں میں شمار کئے جاسکتے ہیں اور شمار کئے جا چکے ہیں۔

ڈاکٹر شفیع صاحب اپنی زندگی میں بہت سے مناصب پر فائز رہے۔ مگر منصب بذات خود کوئی بڑا کارنامہ نہیں ہوسکتا۔ قابل فخر چیز یہ ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں بہت سی نمایاں اور اہم علمی خدمات انجام دیں۔ اورکارکردگی خلوص اورمحبت کی وہ مثالیں پیش کی ہیں جن کی نظیر کم ملتی ہے۔ سیرت اور طبعیت کی بعض نادر خصوصیات کے علاوہ، علمی تحقیق، طرز تدریس اور طریق تربیت کے لحاظ سے بھی انہوں نے ایک ایسا نمونہ قائم کیا ہے جوموجودہ اور آئندہ نسلوں کے لئے ہرطرح قابل تقلید ہے۔ ان کی شخصیت عظیم اور ان کے کار نامے عظیم تر ہیں۔!

میں اس موقعہ پر ان کے علمی کارناموں کی چند خصوصیات اور ان کی سیرت کے بعض امتیازی پہلوؤں پر نظر ڈالتا ہوں۔ مجھے یہ حق اسلئے پہنچتا ہے کہ میں نے عمر کا بیشتر حصہ آن کی خدمت میں بسر کیا ہے اور علمی لحاظ سے میرے پاس جو کچھ ہے وہ بہت حد تک ان کے فیضان کا نتیجہ ہے۔

سب سے پہلے ڈاکٹرشفیع صاحب کے تعلیمی اورعلمی کارنامے! اولاًوہ ایک مقتدراوربلند پایہ استاد ہیں اورتدریس میں ایک طرزخاص کےمالک ہیں۔ ان کی ذات میں مغربی انداز نقد و نظر اورمشرقی تبحرکا نادر المثال اجتماع ہے۔ وہ اپنے طلبہ کی تنقیدی صلاحیتوں کی تربیت پر خاص نظر رکھتے ہیں۔ ان کے لیکچروں میں جامعیت اور ایجاز کی عجیب و غریب آمیزش ہوتی ہے۔ جہاں تک عربی زبان اور ادب کی تدریس کا سوال ہے وہ اس میں اسلامی تاریخ اور اسلامی روایات سے بڑی مدد لیتے ہیں۔ ان کا نقطۂ نظر ادبی اور لسانی

کم اور تہذیبی اور تاریخی زیادہ ہے ۔ کلاسوں میں ان کا یہ خاص طریقہ ہے
کہ وہ پڑھاتے وقت طلبہ کو ماخذ و مصادر سے ضرور روشناس کراتے ہیں
اس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ طلبہ متن کے اندر مقید نہ رہیں بلکہ ان کی
نظر وسیع ہوجائے اور ان میں متن سے باہر نکل کر تحقیق اور وسیع تر
مطالعہ کا ذوق پیدا ہوسکے ۔ اس طرز تدریس سے ان کے شاگردوں اور تربیت
پانے والوں کو بڑا فائدہ ہوا ۔

ڈاکٹر شفیع صاحب کے مدرسانہ کمال کا ایک زمانہ معترف ہے اور یہ اعتراف
بجا بھی ہے ۔ مگر ان کے فیض کا میدان اظہار صرف ایم ۔ اے کی تدریس نہیں بلکہ
ایم ۔ اے کے بعد کی تربیت بھی ہے ! اس تربیت کے معاملے میں شفیع صاحب
انتخاب کے قائل ہیں ۔ کیونکہ وہ ہر شخص کو علمی تحقیق کا اہل نہیں
سمجھتے ۔ چنانچہ اس انتخاب کے لئے ان کے معیار نہایت سخت ہوتے ہیں ۔ اور
جو شخص ان پر پورا نہیں اترتا وہ اسکی حوصلہ افزائی نہیں کرتے ۔

ان کی ''تحقیقی'' تربیت کا ایک خاص اصول یہ ہے کہ وہ تدریج کو
ضروری سمجھتے ہیں ۔ اور آغاز کار میں طلبہ کو محنت اور ''رجوع'' کا عادی
بناتے ہیں تاکہ مصادر و ماخذ سے فائدہ اٹھانے کا ملکہ پیدا ہو جائے ۔
انڈکس بنانا ۔ کتاب ایڈٹ کرانا ۔ نسخوں کا مقابلہ کرانا ۔ وہ ابتدا میں طلبہ
کو اس قسم کے کاموں پر لگاتے ہیں ۔ مستقل عنوانات پر مقالات کی تیاری کا
نمبر اس کے بعد آتا ہے ۔ اس سلسلے میں وہ بڑی محنت اور جامعیت کے قائل
ہیں اور معمولی اور عام مقالات سے کبھی مطمئن نہیں ہوتے ۔

تصنیف اور طرز تحقیق کے معاملے میں ڈاکٹر شفیع صاحب ''اورینٹل کالج کی
قدیم علمی روایات کے نہ صرف پابند بلکہ بعض روایات کے خالق اور بانی
بھی ہیں ۔ ''اورینٹل کالج کے محققین'' کی سب سے بڑی خصوصیات تاریخی
تحقیق ہے ۔ مستشرقین یورپ کی طرح اس کالج کے مصنفین بھی فنی اور
ادبی حسن کی بجائے تاریخی حقیقت کی تلاش پر اصرار کرتے ہیں ۔ (ہر چند
کہ حسن اور تاریخی صداقتیں اپنی انتہائی بلندیوں پر پہنچکر ایک ہو جاتی
ہیں اور دونو کو ایک دوسرے کی ضد قرار نہیں دیا جاسکتا مگر تلاش کے
مراحل میں دونو کے طریق کار جدا جدا ہیں) ۔ مجموعی اعتبار سے اورینٹل کالج

کے مصنفین مؤرخ ہیں ۔ ان کا طریق کار سائینس دانوں کا طریق کار ہے ۔ وہ مواد کی تلاش میں بڑا وقت صرف کرتے ہیں ۔ اور فراہم شدہ مواد سے مؤرخانہ انداز میں نتائج اخذ کرنے کے عادی ہیں ۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ تنقید میں ادبی حسن سے بہت کم بحث کرتے ہیں ۔ سبب اس کا یہ کہ وہ اصولاً مؤرخ ہیں ۔ اس وجہ سے ان کی تنقید مؤرخانہ ہوتی ہے جمالیاتی نہیں ہوتی ۔ وہ ادب سے واسطہ رکھتے ہیں مگر ادب کے جمال پر نظر نہیں ڈالتے اور صرف ادب کی رفتار اس کے ماحول اور اسکی تاریخ پر نگہ رکھتے ہیں ۔ اس جماعت کے افراد نے اسلوب کی کبھی پرستش نہیں کی ہمیشہ مواد کو مقدم رکھا ۔ ''وہ ٹھوس واقعات'' کے شائق ہیں ۔ جمال آرائی کے دل دادہ نہیں ۔ انہوں نے صاحب اسلوب مصنمون کے لئے مواد بہم پہنچایا خود اسلوب کی پروا نہیں کی ۔ انکشاف و اکتشاف ان کا میدان خاص ہے محض ادیب اور انشا پرداز بننا انہیں گوارا نہیں ۔

اورینٹل کالج کے مصنفین اس صحافتی رنگ تصنف کے شدید مخالف ہیں جو مضمون اور مواد سے بے نیاز ہو کر (یا ناقص مواد کو لے کر) محض دلکش انداز بیان کے بل پر آگے بڑھنا چاہتا ہے ۔ مآخذ یا حوالہ ایک ایسی بنیادی چیز ہے کہ اس کے بغیر بیان یا روایت کی صحت کا یقین کیا ہی نہیں جاسکتا اسی لئے اس مدرسۂ تصنیف کے نزدیک مآخذ کا حوالہ دیانت داری کا اولین قدم ہے ۔ ''اوریجنل'' مآخذ کی تلاش اور ان سے استفادہ ــــــــ ان دونوں چیزوں پر یہاں بڑا اصرار کیا جاتا ہے ۔ لمبے لمبے اقتباس ، ہر ہر فقرے پرحوالوں کے نشان ، راویوں اور مؤرخوں کا اعتراف ، سنین کی پوری پوری پابندی ، واقعہ کی ہر ہر جزئی چیز کا مفصل بیان ــــــــ یہ سب خصوصیات اس جماعت کی تصانیف و مقالات میں کم و بیش ہر جگہ پائی جاتی ہیں ۔

شفیع صاحب اسی علمی مسلک کے خاص نمائندہ و ترجمان ہیں ۔ ان کی کوششوں سے ملک میں قدیم ادب اور اس کے شاہکاروں کے متعلق غیر معمولی دلچسپی پیدا ہوئی ۔ ملک میں وہ پرانی تصانیف جو پردۂ گمنامی میں روپوش تھیں منظر عام پر آگئیں ۔ قلمی کتابوں کی تلاش اور مطالعے کا

ذوق و شوق بیدار ھوا ۔ اس کلاسیکی مذاق کے زیر اثر قدرتاً تنقید ، خصوصاً جمالیاتی تنقید اور عام پسند تصنیف کو فروغ حاصل نہ ھوا مگر عربی فارسی ادب ، اسلامی تاریخ اور عام مستشرقات کے مطالعے کی تحریک کو بڑی ترقی ھوئی ۔ یہ علمی روایت ، شفیع صاحب سے پہلے بھی موجود تھی جس کے بڑے نمایندے اور علمبردار ڈاکٹر لائٹنر ، سر آرل سٹائن ، میکڈانلڈ اور ڈاکٹر ولنر تھے مگر شفیع صاحب نے اپنی بے نظیر قوت عمل اور بے مثال تنقیدی صلاحیتوں کی وجہ سے اس تحریک کو اتنی وسعت دی کہ ان سے پہلے اس کی مثال نہیں ملتی ۔

ڈاکٹر شفیع صاحب کے مقالات اور تصانیف کی مکمل فہرست مجموعے کے شروع میں موجود ھے ۔ اس پر نظر ڈالنے سے ان کے دل پسند موضوعوں کا پتہ چل سکتا ھے ۔ ان میں سے بہت سے کام ''ایڈٹنگ'' سے متعلق ھیں مگر اس میں ان کی عالمانہ تحقیق اور محققانہ جستجو کے نمایاں اور شاندار ثبوت ملتے ھیں ۔ عقد الفرید لا بن عبد ربہٖ کا تفصیلی اور تشریحی اشاریہ (انڈکس) ان کی تلاش اور جہان بین پر شاھد صادق کی حیثیت رکھتا ھے ۔ انہوں نے اس سلسلے میں عربی ادب اور اسلامی تاریخ کے ھزارھا رجال و مقامات کی تعیین و تشخص کی جن کے لئے انہیں اسلامی تاریخ کی بڑی ورق گردانی کرنی پڑی ۔ اور ان کا یہ وہ عظیم کارنامہ ھے جس پر دنیا بھر کے فضلا نے انہیں نہایت شاندار الفاظ میں خراج تحسین ادا کیا ھے ۔ اس کے علاوہ تتمہ صوان الحکمۃ رسائل رشید الدین فضل اللہ ۔ مے خانہ عبدالنبی مطلع سعدین ، بدائع وقائع اور چھوٹے بڑے چند اور متن بھی انہوں نے ایڈٹ کئے جو ان کی تحقیق ، محنت جان پروھی اور تنقیدی نظر کی زندۂ جاوید یادگاریں ھیں ۔

ڈاکٹر شفیع صاحب کی تحقیق کے موضوع بہت سے ھیں۔ ان میں سے بعض اھم اور نمایاں ھیں ۔ اجمالاً ۔ انہوں نے ایران اور ھندوستان کی '' کلچرل'' اور علمی تاریخ میں منگولوں اور تیموریوں کے دور کا خاص مطالعہ کیا ھے ۔ آل تیمور میں سے سلطان حسین بایقرا کا عہد خصوصیت سے ان کی توجہ کا

مرکز ہے ۔ انہوں نے اس زمانے کی علمی، ادبی اور فنی سرگرمیوں پر گہری نظر ڈالی ہے۔ خصوصاً خطاطی اور خط کے ارتقا میں جو حصہ اس زمانے کے فن کاروں اور خطاطوں نے لیا ہے اس کا بامعان نظر مطالعہ کیا ہے ۔ انہوں نے فرقۂ نور بخشی کے حالات و کوائف پر نئی روشنی ڈالی ہے اور اس دلچسپ جماعت کو جس تفصیل سے از سر نو متعارف کرایا ہے اس سے ہمارے مذہبی تاریخی ادب میں بڑا اضافہ ہوا ہے ۔

ہندوستان کی تاریخ میں ان کو سب سے زیادہ دلچسپی پنجاب اور لاہور کی تاریخ سے ہے ۔ انہوں نے علمی کتابوں کی فراہمی میں بھی اس بات کو خاص طور سے مد نظر رکھا ہے کہ پنجاب خصوصاً لاہور کی تاریخ کا زیادہ سے زیادہ مواد جمع ہو جائے ۔ انہوں نے اس موضوع پر خود بھی چند مقالات لکھے اور اپنے ہم کاروں اور شاگردوں کو بھی اس کی طرف توجہ دلائی ۔ اس لحاظ سے وہ بڑے ''پنجاب دوست'' ہیں کہ ہندوستان کی علمی اور تہذیبی تاریخ میں پنجاب نے جو حصہ لیا ہے انہوں نے اس کو منصۂ شہود پر لانے کی خاص کوشش کی ۔ ''پنجاب میں اردو کا تخیل (یا نظریہ) جو شیرانی صاحب نے پیش کیا اس کی تشکیل اور تکمیل میں (کون جانتا ہے کہ) شفیع صاحب کا کتنا حصہ ہے ؟ شیرانی صاحب کو اس امر کا خود اعتراف تھا کہ اگر شفیع نہ ہوتے تو شاید میری تحقیق کا رخ کسی اور طرف ہوتا !

قصور ، (پنجاب) شفیع صاحب کا اپنا وطن ہے ۔ اس کی تاریخ بھی ان کے لئے باعث کشش رہی ہے ۔ افغانان قصور کے متعلق ان کے گراں قدر مقالے اسلامک کلچر اور اورینٹل کالج میگزین میں چھپ چکے ہیں ۔

اسلامی خطاطی ان کا ایک محبوب موضوع ہے ۔ انہوں نے قلمی نوادر کی مدد سے خط کے ارتقا اور خطاطوں کے حالات پر فاضلانہ مقالات لکھے ہیں ۔ اس سلسلے میں انہوں نے خط کے موضوع پر بے شمار نئی معلومات کا اضافہ کیا ہے ۔

ڈاکٹر شفیع صاحب کو نوادر کے انکشاف سے بڑی دلچسپی ہے اور نادر اور کم یاب کتابوں کا موضوع تو ان کا خاص موضوع ہے

سکہ شناسی اور کتبات کے پڑھنے اور سمجھنے میں بھی وہ امام وقت ھیں چنانچہ اس سلسلہ میں آثار قدیمہ کے ماھرین نزدیک اور دور سے انھی کی طرف رجوع کرتے ھیں ۔

شفیع صاحب کے عظیم تحقیقی کاموں کو دیکھ کر یہ محسوس ھوتا ھے کہ ان کے ذھن کو ''عظیم'' ادبی اور علمی مہمات سے خاص دلبستگی ھے ۔ وہ ادنیٰ ، پس پا افتادہ اور معمولی موضوعوں اور علمی منصوبوں کو در خور اعتنا نہیں سمجھتے ۔ اس معاملے میں وہ کسی حد تک سر سید احمد خان سے مشابہت رکھتے ھیں ۔ خداوند تعالیٰ نے ان کو عظیم جسم کے ساتھ عظیم دماغ بھی عطا کیا ھے جس کے سبب وہ محض مہمات عظیمہ کے انصرام پر توجہ صرف کرتے ھیں چنانچہ ان کے علمی کام اس کی شہادت دیتے ھیں ۔

شفیع صاحب کا ایک خاصہ یہ ھے کہ ان کا ذھن حقائق سے زیادہ واقعات کی طرف راغب ھے ۔ وہ تاریخ میں بھی واقعات کے طالب ھیں فلسفۂ واقعات سے دلچسپی نہیں رکھتے ۔ ان کے کسی علمی کام میں فلسفیانہ '' تعمق'' نہیں پایا جاتا ۔ وہ جزئیات کی جمع آوری اور سنوں ، مہینوں اور دنوں کی تعیین سے کبھی نہیں تھکتے کیونکہ واقعہ ــــــ جس رنگ اور جس طرح کا ھو ــــــ ان کی دل پسند چیز ھے ۔ یہی وجہ ھے کہ ان کے نتائج میں قیاس یا خیال بہت کم دخل انداز ھوتا ھے ــــ پروفیسر شیرانی بھی طبعاً اور عملاً مؤرخ تھے مگر ھم دیکھتے ھیں کہ ان کی تحقیق تخیل کے اثرات سے مبرا نہیں ۔ قیاس اور خیال چنانچہ دخیل ھو ھی جاتے ھیں ۔ مگر شفیع صاحب تاریخ میں بے آمیز صداقت کے قائل ھیں اس لئے وہ 'واقعہ' کی حد سے ذرہ برابر بھی باھر نہیں جاتے ۔

اس رجحان خاص کا نتیجہ یہ ھے کہ آن کی تحریروں میں وہ رنگینی موجود نہیں جو تخیل کی آمیزش کے بغیر پیدا نہیں ھو سکتی ان کے مقالے ریاضی دانوں کے مقالوں کی طرح ٹھوس اور قطعی ، معلومات سے لبریز ھوتے ھیں ــــــ صداقتیں اور حقیقتیں واقعات کے سانچوں میں چست اور پیوست ــــــ ! اور حق یہ ھے کہ ایک سچے اور دیانت دار مؤرخ سے اس

سے کم توقع بھی نہیں رکھنی چاھئے ! مگر شفیع صاحب کی تحریروں میں (قطعیت کے باوجود) دلکشی کا ایک پہلو ایسا ھے جو ان کی ''عجائب پسندی'' سے پیدا ھوتا ھے - نئی معلومات کے ساتھ ساتھ انہیں تاریخ کی 'دلچسپ' اورعجیب و غریب جزئیات سے بھی دلچسپی ھے - جس کی وجہ سے ساعتوں میں ڈھلی ھوئی ، قطعیت کی بہت حد تک تلافی ھو جاتی ھے -

شفیع صاحب کے طرز بیان کے بعض پہلو سر سیّد کے انداز تحریر سے مماثل معلوم ھوتے ھیں - مثلاً معلومات کو جس سائنٹفک انداز میں شفیع صاحب مرتب کرتے ھیں اور مضمون کے منطقی رنگ کو قائم اور برقرار رکھنے میں جس اھتمام کا ثبوت دیتے ھیں اس کو دیکھ کر سر سید کی منطقیت یاد آجاتی ھے البتہ یہ امتیاز ضرور باقی رھتا ھے کہ دونوں کے موضوع بالکل الگ الگ ھیں اس کے علاوہ ماحول اور نصب العین بھی جدا ھے - پس تحریر کی اندرونی روح اور داخلی سپرٹ مختلف رھتی ھے - شفیع صاحب محض ''علم'' کے داعی اور پرستار ھیں اور ان کا مقصد اور نصب العین خالصتاً علمی ھے - لہٰذا سر سید کی تحریروں میں جو تلقینی اور تبلیغی رنگ پایا جاتا ھے وہ یہاں موجود نہیں - غرض شفیع صاحب کی تحریر کا سب سے بڑا خاصہ امر واقعہ کا کماھی اظہار ھے - اور یہ وہ خصوصیت ھے جس میں مشرق جدید کا کوئی عالم اور مؤرخ ان کی حد تک پہنچا ھوا معلوم نہیں ھوتا -

ڈاکٹر شفیع صاحب کے اھم علمی کارناموں میں اورینٹل کالج میگزین کا اجرا بھی ھے - یہ علمی مجلہ سنہ ۲۵ء میں جاری ھؤا اور ان کے سبکدوش ھونے تک (یعنی سنہ ۴۲ء تک) ان کے زیر ادارت نکلتا رھا اس کا ضمیمہ اب بھی ان کے زیر ادارت شائع ھورھا ھے - اس مجلہ کی بڑی خصوصیت یہ ھے کہ اس نے سرسری ، سطحی اور ارزاں مقالہ نگاری کو نظروں سے گرادیا - تحقیق میں ''امر واقعہ'' کی مکمل جستجو کا سائنٹفک طرز بہت حد تک اسی مجلہ کے ذریعے ملک میں مقبول ھوا اور اس رجحان کو ترقی دینے کا فخر ترجیحاً اس کے فاضل مدیر پروفیسر محمد شفیع کو حاصل ھے جن کی گہری تنقیدی نظر اور جزئیاتی چھان بین کی وجہ سے

اس میگزین کے اکثر مقالہ نگاروں نے ذمہ دارانہ مقالہ نگاری کا سبق سیکھا ۔ شفیع صاحب اب انجمن عربی و فارسی پنجاب یونیورسٹی (جس کے وہ صدر بھی ھیں) کے جرنل (مجلہ) کے ایڈیٹر ھیں ۔ اس میں بھی تدوین ، ترتیب اور چھان بین کی وھی خصوصیات جلوہ گر ھیں جن کے لئے اوینٹل کالج میگزین دنیا بھر کے مستشرقین میں قبول عام اور امتیاز خاص حاصل کر چکا ھے ۔

شفیع صاحب کی اھم علمی خدمات میں یہ بھی ھے کہ انہوں نے اپنی پروفیسری کے زمانے میں یونیورسٹی لائبریری کے شعبہ عربی و فارسی کو نوادر علمی سے مالا مال کر دیا ـــــ ان کی محنت ، تلاش اور کوشش کی بدولت یہ کتب خانہ تحقیقی مواد کے اعتبار سے شاید دنیا کے بہترین کتاب خانوں میں سے ھے ۔

شفیع صاحب کی اس قومی خدمت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے پنجاب یونیورسٹی میں علوم مشرقیہ (عربی فارسی) وغیرہ کو بڑی عزت کا مقام دلوایا اور ان سے متعلق زبانوں کو ان کے اس مسند امتیاز سے محروم نہ ھونے دیا جس پر متمکن ھونے کا فائق حق انہیں حاصل تھا ۔ اس کے لئے حالات کچھ زیادہ سازگار نہ تھے مگر سفیع صاحب کے خلوص اور تدبر نے ھمیشہ ان علوم کی پاسبانی کی جس کی وجہ سے پنجاب یونیورسٹی میں آج بھی ان علوم کو نمایاں اور بلند رتبہ ملا ھوا ھے ۔

اب ان کی سیرت ! میری رائے میں ان کی سیرت کا سب سے روشن اور قابل ھزار تحسین وصف ان کا بے نظیر احساس فرض ھے ۔ انہوں نے اپنی ملازمت کے دوران میں جس ایمانداری اور دیانت سے اپنے فرائض انجام دئے اس کی ادنیٰ مثال یہ ھے کہ یونیورسٹی کی پچیس سالہ ملازمت میں انہوں نے کالج سے شاید ایک دن کی رخصت بھی نہیں لی ۔ وہ تقریباً چوبیس سال تک یونیورسٹی کی سنڈیکیٹ کے رکن رھے مگر اس عرصہ میں ایک دو دن کی جبری غیر حاضری کے سوا وہ اس مجلس سے کبھی غیر حاضر نہیں ھوئے ۔ تدریسی مشاغل میں بھی ان کی فرض شناسی اور با قاعدگی کا یہی حال رھا ! اس معاملے میں ان کی پابندی ھماری یونیورسٹی میں

اب ضرب المثل ہے۔

ادائے فرض میں شفیع صاحب جتنے خود مستعد اور دیانت دار ہیں اتنا ہی وہ اوروں کو مستعد اور دیانت دار دیکھنا چاہتے ہیں۔ مگر لوگوں کی عام سہل انگاری کے پیش نظر شفیع صاحب کو (جب تک منصب پر فائز رہے) اکثر سختی اور سخت گیری سے کام لینا پڑتا تھا۔۔۔چنانچہ وہ جابر اور متشدد منتظم خیال کئے جاتے تھے۔۔۔ اس معاملے میں وہ ذاتی مراسم کی کچھ پرواہ نہ کیا کرتے تھے پروفیسر اقبال پروفیسر شیرانی اور مولانا نجم الدین سے ان کے تعلقات بہت اچھے تھے مگر ادائے فرض میں آنانکہ نزدیک ترانہ دور ترانند کے مصداق آن کے احباب کو اوروں سے کچھ زیادہ آزمایشوں سے گزرنا پڑتا تھا۔

نظم و ضبط یوں بھی ایک مشکل اور نازک مسئلہ ہے مگر جہاں نظام زندگی ذرا ڈھیلا ہو وہاں مشکلات اور بھی بڑھ جاتی ہیں اور یہ بالکل ظاہر ہے کہ ایک فرض سناس شخص (جو انصرام امور میں تساہل کی کسی شکل کو برداشت نہ کرتا ہو) ہر دل عزیز نہیں ہو سکتا۔ اس بنا پر اور ان معنوں میں شمیع صاحب بھی ہر دل عزیز نہ تھے۔ اور ان کو اس بات کا احساس بھی تھا مگر اس کے باوجو انہیں ارزاں ہر دل عزیزی کی کبھی تمنا نہیں ہوئی۔ اور ایسے تحسین عام کو انہوں نے کبھی قبلہ مقصود اور کعبہ مراد قرار نہیں دیا جس کی قیمت اصول کا خون اور دیانت کی موت ہو۔ ڈاکٹر شفیع صاحب کی سیرت کا ایک اور مفید المثال پہلو ان کی ان تھک محنت اور سخت کوشی ہے۔ آن کو اس معاملے میں عربی انگریزی قاموس کے مرتّب لین سے مشابہت دی جاسکتی ہے جس نے تیس سال قاہرہ میں رہ کر اپنی لغت کی تدوین کی اور اس عرصے میں (جمعے کے سوا) ہر روز مسلسل اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے کام کیا شفیع صاحب کی سیرت کا یہ پہلو بڑا قابل رشک ہے۔ سفر ہو یا حضر، گرمی ہو یا سردی، ہر وقت اور ہر حالت میں وہ سعی پیہم کے قائل اور کوشش مسلسل پر عامل رہے۔ اور اس وقت بھی ہیں (جبکہ ان کی عمر ۷۰ ویں منزل سے گزر

چکی ہے) وہ اب بھی کم از کم سولہ سترہ گھنٹے مطالعے کی میز پر صرف کرتے ہیں۔

شفیع صاحب کو زندگی اور عمل کے ہر شعبے میں جس خاص رجحان سے بڑی ضد رہی ہے وہ کم کوشی اور سعی ناتمام ہے۔ وہ ادھورے کام کے سخت مخالف ہیں۔ کام اپنا ہو یا دوسروں کا۔ انہیں ہر صورت میں تکمیل کی جستجو رہتی ہے۔ پھر تکمیل کے معاملے میں بھی ان کا نظریہ نہایت بلند ہے۔ اتنا بلند کہ معمولی صلاحیتوں کا آدمی اس کی بلندیوں تک ذرا مشکل سے ہی پہنچ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معمولی کوششیں ان کی بارگاہ سے کبھی سند قبول نہیں کر سکتیں۔ ان کی اعلیٰ پسندی اور تکمیل پسندی کی حد یہ ہے کہ ان کی طرف سے خاموش اطمینان کا اظہار بھی گویا بہت بڑی تحسین ہے۔

جن لوگوں نے زندگی میں شفیع صاحب کے ساتھ یا ان کے ماتحت کام کیا ہے۔ انہوں نے ان سے مکمل کوشش اور حسن تکمیل کا سبق ضرور سیکھا ہے کیونکہ وہ اپنے رفقا کے کاموں کی کڑی نگرانی کرتے ہیں اور ضرورت کے وقت احتساب اور باز پرس سے نہیں چوکتے۔ اس سے بعض اوقات رنجشیں بھی پیدا ہو جاتی ہیں اور لوگوں کو یہ شکایت بھی پیدا ہوجاتی ہے کہ شفیع صاحب تدگہای سے کام لیتے ہیں مگر مکمل کام کے بغیر ان کی جانب سے داد کا ملنا ناممکنات میں سے ہے۔

اس تکمیل پسندی کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انہیں دوسروں کے کاموں کی تکمیل پر بھی اپنا وقت صرف کرنا پڑتا ہے۔ ہم لوگوں میں ادھورا کام کرنے کا جو رجحان ہے اس کا انہیں کچھ یقین سا ہے۔ اس لئے وہ مطمئن اسی وقت ہوتے ہیں جب چیز کو خود بھی دیکھ بھال لیے ہیں۔ ڈاکٹر سوریا کانت (سابق ریڈر سنسکرت پنجاب یونیورسٹی) راوی ہیں کہ مسٹر اے۔ سی۔ ولنر (سابق پرنسپل اوریئنٹل کالج) کے یادگاری مجموعے کی تدوین و طباعت کے وقت۔ دوسرے مضامین نو۔در کنار سنسکرت کے مضامین کے پروفوں پر خاص پروف ریڈر کے علاوہ وہ خود بھی نظر ڈالا کرتے تھے۔ حالانکہ سنسکرت نہیں جانتے مگر محض نظر سے اشکال و حروف کے

پیچ و خم کا مقابلہ اصل سنسکرت مسودہ سے کرلیا کرتے تھے اور تعجب یہ ہے کہ بعض اوقات پروف پڑھنے والے کی فروگزاستوں کا سراغ بھی لگا لیتے تھے ۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سوریا کانت نے اپنا بھی ایک واقعہ سنایا جو بڑا تعجب انگیز اور دلچسپ ہے ۔

سفیع صاحب طبعاً کم آمیز آدمی ھیں ۔ یہ رجحان ان کی بے اندازہ مصروفیات کے سبب سے کچھ اور بھی نمایاں ہوگیا تھا ۔ عام درباری اور گرمئے محفل کے لئے ان کے پاس وقت نہیں ہوتا ۔ اور اب بھی وہ باقاعدہ ملازمت سے سبکدوش ہو چکے ھیں۔ محفل آرائی انہیں پسند نہیں وہ جب تک ملازمت میں رہے انہوں نے اپنے منصب کی عزت اور وقار کا بڑا خیال رکھا۔ اس وجہ سے یونیورسٹی اورکالج میں ان کا بڑا رعب تھا۔ ان سے انٹرویو کرنے والے ملاقات کرنے سے پہلے کئی دن تک متوقع گفتگو کے ''صغرے'' ''کبرے'' تیار کرتے رہتے تھے اور منشی فاضل کے ایک محترم استاد مولانا محمد دین مختار کے پاس دو اس قسم کے تحریری مسودے دیکھے گئے جو ان کی اور شفیع صاحب کی باھمی ملاقات سے متعلق تھے ۔

ان سب حالات کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ان کے متعلق دلوں پر سب سے زیادہ خوف اور دھشت کا جذبہ ھی غالب رھتا تھا ۔ محبت کا جذبہ صرف اس وقت نمودار ہوتا تھا جب کوئی شخص بے آمیز عقیدت کے سہارے بڑے مجاھدے کے بعد ان کے قریب پہنچنے کی سعادت حاصل کر لیتا تھا ۔ اُن کی شخصیت در اصل ایک قلعہ بند شخصیت ہے وہ ایک ایسے مہیب قلعے کی طرح ھیں ۔ جس کی ظاھری کرختگی اور سختی کو دیکھ کر ھرشخص مرعوب ہوتا ہے اور اس کے آھنی دروازوں اور سنگین دیواروں سے ھیبت زدہ ہو کر اندر جانے کی ھمت نہیں کرتا مگر جب حوصلہ دکھا کو دروازے کے پاس پہنچ جاتا ہے تو یکایک پھاٹک کھل جاتا ہے اور وہ اپنے آپ کو ایک ایسے خوش منظر مقام میں موجود پاتا ہے جس کی دلکشی اور دلکشائی کو دیکھ کر اسے ظاھری سختی اور کرختگی بھول جاتی ہے ۔ یہی حال شفیع صاحب کا ہے ۔ جن لوگوں نے شفیع صاحب کو قریب سے دیکھا ہے ان کا متفقہ احساس یہ ہے کہ شفیع صاحب اسی وقت تک سخت معلوم ہوتے ھیں جب تک ان

سے ملاقات نہیں ہوتی مگر جب ان سے ملنے کا موقع مل جاتا ہے تو ان کی ملاقات نہ صرف علمی لحاظ سے بلکہ مجلسی نقطہ نظر سے بھی بڑی مسرت بخش اور فرحت انگیز ہوتی ہے ۔ ان کا قلب عام انسانی ہمدردی اور خیر اندیشی کے جذبات سے معمور ہے اور دوستی اور دوست داری کی جتنی پاسداری ان میں موجود ہے اس کی مثالیں ذرا کم ہی ملتی ہیں ۔ ان میں ظرافت اور نکتہ آفرینی کا وہ جوہر پایا جاتا ہے جو ان کی علمی اور ادبی معلومات کے ساتھ مل کر مخاطب کے لئے نہایت خوشگوار ثابت ہوتا ہے ۔ اور علمی گفتگوؤں میں تو حالت یہ ہوتی ہے کہ جس مسئلہ کے متعلق بھی ان سے مشورہ لیا جائے اس پر وہ اپنی سیر حاصل ، تشفی بخش اور خیال افروز گفتگو کرتے ہیں کہ دل و دماغ علم کی وسیع شاہراہوں کا نشان پالیتا ہے ۔ مجھے آج تک کوئی ایسا شخص نہ ملا جو ان سے اس غرض سے ملا ہو اور سیراب اور فیضیاب ہو کر واپس نہ گیا ہو ۔ غیر معمولی حافظہ کے ساتھ وسعت معلومات اور تبحر ! اس لحاظ سے آپ کو اگر علم و فضل کا ایک ناپیدا کنار سمندر کہہ دیا جائے تو شاید بے جا نہ ہوگا ۔ وہ بلا شائبہ مبالغہ ان اعاظم رجال میں سے ہیں جن کے وجود پر کسی قوم اور کسی زمانے کو بجا طور پر ناز ہوسکتا ہے !

[مأخوذ از ' ارمغان علمی ']

پروفیسر کے - ڈوی

جاپانی شاعری

جاپانی ادب آٹھویں صدی عیسوی سے شروع ہوتا ہے - اور اس سے پہلے جو کچھ ہوا وہ تحریر میں نہ آسکا - چینی حروف کا علم اہل جاپان کو تیسری صدی عیسوی میں ہو گیا تھا - مگر انہوں نے اسکا استعمال شروع نہیں کیا تھا - ۸۵۰ میں جب بدھ مذہب کی کتابیں جاپان میں پہونچیں تو بادشاہ کو اور درباری امراء کو پڑھنے لکھنے کا شوق ہوا بہت سے امراء نے نیا مذہب اختیار کرلیا اور کچھ دنوں بعد بادشاہ بھی بدھ مذہب کا پیرو ہو گیا - اس کے ساتھ ساتھ لوگوں کی توجہ علم‌وادب کی طرف بھی پھری - چین میں سفیر بھیجے گئے اور بہت سے طلباء بھی گئے - چین سے بھی معلّم اور صناع آئے اور رفتہ رفتہ ان کی تعداد بڑھتی گئی -

شروع میں بادشاہ اور امراء چینی زبان میں اپنے خیالات تحریر کرتے تھے جاپان کی سب سے پرانی کتاب ''کوجیکی'' چینی زبان میں لکھی گئی ہے - اس کتاب میں جاپان کی پرانی نظمیں بھی ہیں ان کی زبان چینی نہیں ہے - بلکہ چینی حروف کے ذریعہ سے جاپانی تلفظ ظاہر کیا گیا ہے - رفتہ رفتہ جاپانی زبان لکھنے کا یہ طریقہ رائج ہو گیا -

جاپان میں سب سے قدیم نظموں کا مجموعہ ''مانیوسو'' کے نام سے تحریر میں آیا - جو ۷۵۰ کے بعد لکھا گیا یہ بیس جلدوں میں منقسم ہے اور اسمیں ۲۶۲ طویل نظمیں چار ہزار تہتر ''داکا'' اور اکسٹھ ''سیدوکا'' ہیں کل ملا کر چار ہزار سات سو چھیانوے نظمیں ہوتی ہیں اس مجموعہ میں صرف شاہی خاندان والوں اور امراء کی نظمیں نہیں ہیں بلکہ عوام الناس کی نظمیں شامل ہیں مثلاً چھوٹے عہدیدار ماہی گیر اور دیگر پیشہ ور - یہ نظمیں بہت سیدھی سادی ہیں اور ہر موضوع پر لکھی گئیں ہیں - ''داکا'' نظم بہت عام ہے دو ایک نمونہ ملاحظہ کیجئے - ''کاکینوموتونوھیتومارو'' اس زمانے کے بہت بڑے شاعر تھے ان کی لمبی نظمیں بہت مشہور ہیں اپنے

وطن ''ایوا مینو کونی'' سے بیوی سے جدا ہو کر پایہ تخت جاتے وقت کہتے ہیں ۔

''ایواسی'' کا سمندر ''خلیج تونو''
کسکو اچھا نہ لگے ۔
کسیکو اچھا نہ لگے ۔
اچھا نہ لگے تو نہ سہی
اچھا نہ لگے تو نہ سہی
مگر کیا ہوا یہ بیقرار دل میرا
جانے کیوں دیس کو لوٹ جاتا ہے ہمیشہ
آتی ہے ''وبانو'' کے ویران ساحل پر
ہرے رنگ کی زمرد جیسی بحری گھاس
صبح کو ہوا میں لہراتی ہوئی
شام کو موجوں پر تیرتی ہوئی
موجوں کے ساتھ ساتھ ادھر آدھر سے
اسی بحری گھاس جیسی بالوں والی
اپنی پیاری بیوی کو چھوڑ آیا ہوں اپنے وطن میں
راستہ کے ہر موڑ پر
مڑ مڑ کے دیکھتا ہوں پیچھے کی طرف
بہت دور ہو گیا ہے میرا وطن
آیا ہوں اونچے اونچے پہاڑوں کو عبور کر کے
گرمی کی گھاس کی طرح مرجھا گیا ہے میرا دل
بیوی اب تک کھڑی ہوگی پھاٹک پر
دیکھنا چاہتا ہوں اسے ۔ اے پہاڑو جھکا دو سر

''سامنیو شو'' کے ہاں ایک خاص بات یہ نظر آتی ہے ۔ کہ طویل نظم کے بعد ''داکا'' بھی موجود ہے جسمیں اس کا خلاصہ یا نچوڑ ہے بعض اوقات ایسی ''داکا'' میں ایسے خیالات بھی پائے جاتے ہیں جو کسی وجہ سے طویل نظم میں ادا نہوسکے ''داکا'' کے معنی ہیں جاپانی نظم ۔ یہ بہت

چھوٹی نظم ھوتی ھے جسمیں صرف اکتیس بول ھوتے ھیں -

ملاحظه فرمائیے
بہار کا کھیت -
بنفشہ کے پھول چننے آیا تھا میں
پسند آیا کھیت بہت زیادہ
سو گیا وھاں رات بھر

دوسرے عہد کو ''عہد نساں'' کہتے ھیں جو نویں صدی سے بارھویں صدی تک رھا اس زمانےمیں امراء اور رؤسا عیش و عشرت میں پڑ گئے تھے اس دور میں طویل نظمیں بالکل غائب ھو گئیں اور صرف داکا باقی رہ گئی اس زمانکی ''داکاؤں'' کا سب سے بڑا مجموعه ''کوکین سو'' کہلاتا ھے جو ۹۰۵ء میں بادشاہ کے حکم سے مرتب ھوا اسمیں بھی بیس جلدیں ھیں اور تقریباً گیارہ سو داکا شامل ھیں - اس زمانے میں طرز تحریر میں بہت اصلاح ھوئی اور طرز ادا میں بہت ترقی ھوگئی زبان میں‌شائستگی آگئی مانیو سو کے مقابلے میں ان نظموں میں بہت ذھنی نشوو نما ھوئی ھے -

جب سے نیند نے
عاشق کو دکھایا
میرے خوابوں میں
تب سے مجھے ھوگیا ھے
پورا بھروسه خوابوں پر
بہار کی بارش گویا آنسو ھیں لوگوں کے
سکورا کے پھول گر رھے ھیں
بہت رنج ھے سب لوگوں کو

دیگر : بہار کی رات
بالکل اندھیرا ھے
دکھائی نہیں دیتے آلو بخارہ کے پھول
پھر بھی کیونکر چھپ سکتی ھے ان کی خوشبو

تمہارے سوا اور کسے دکھاؤں
یہ آلو بخارے کے پھول
اصلی رنگ اصلی مہک کے
تمہیں جوہری ہو

داکا کا رواج بعد کے زمانے یعنی عہد کاکورا یوروماچی کے شروع تک بڑھتا رہا۔ تیرھویں صدی عیسوی میں بادشاہ کے حکم سے ''شین کوکین شو'' نامی مجموعہ بھی مرتب ہوا۔ مگر اس زمانے میں بادشاہ اور درباری امراء کی قوت بہت کم ہوگئی تھی اور سمورائیوں یعنی سپاہی زادوں کو عروج ہوگیا تھا۔ ان کے ساتھ ساتھ تاجر اور صنّاع بھی کافی دولت مند بن گئے تھے۔ یہ بھی علم و ادب میں حصہ لینے لگے تھے۔ مگر وہ لوگ اتنے پڑھے لکھے نہ تھے۔

داکا لکھنا بہت مشکل ہے۔ اس وجہ سے عوام‌الناس ھائی کائی رنگا لکھنے لگے۔ یہ نظم شکل میں داکا کی طرح ہے مگر اس میں داکا کے قواعد نرم کردئے گئے ہیں اور مذاق کا پہلو نمایاں ہوگیا ہے رنگا کے معنی لگائی ہوئی داکا یعنی پہلا حصہ۔ ایک شاعر نے کہا تو دوسرا حصہ دوسرے شاعر نے لگادیا۔

کاموئگادا ندی کو
سارس جیسی پتلی ٹانگ دکھاکر پار کرتا ہے
شکاری پاجامہ بھگونیکے ڈر سے

اس میں مذاق یہ ہے کہ کاموگادا ندی کا نام ہے مگر کامو کے معنی ہیں جنگلی بطخ کی ندی کو سارس جیسی ٹانگ سے پار کرتا ہے۔ اس طرح سیدھی سادی آسان داکا لکھنے کی ابتدا ہوگئی بعد کے زمانے میں یعنی سترھویں اور اٹھارویں صدی میں جب تاجروں اور صناعوں کا زور بڑھ گیا اور انہیں نظمیں لکھنے کا شوق پیدا ہوا تو داکا میں آسانیاں پیدا کرنے کی ترکیبیں نکالی گئیں۔ شعرا رنگا کا صرف پہلا حصہ کہنے لگے جس کا نام ھائیکو پڑ گیا۔ پہلے یہ نظم بھی مذاقیہ تھی مگر نیشی اور تاشو

۱٦۴۴ء تا ۱٦۹۴ء نے اس کو اونچے درجہ کی نظم تک پہنچا دیا ۔ ھائیکو میں روز مرہ کا محاورہ باندھا جاتا ھے ۔

سفید شبنم
کانٹے دار جھاڑی کے کانٹوں پر
ایک ایک قطرہ

دیگر : پت جھڑ تسرا پہر
کوا چپ بیٹھا ھے
سوکھی ڈالی پر

دیگر : یہاں بھی نہ چھوڑا
دھول کھلا تھا پگڈنڈی پر
چر گیا اک گزرتا گھوڑا

دیگر : تھر تھر کانپ اٹھا میں
خوابگہ میں پاؤں پڑگیا
مرحوم بیوی کی کنگھی پر

دیگر : میرے ساتھ آکر کھیلو
یتیم چڑیو
میں بھی یتیم دیسیر

دیگر : ظالم لوگ بہت ھیں
بڈھے مینڈک پتھر کھا کر ھمت نہ ھارو
ساتھ تمہارے ایک دوست ھوں میں

عہد میجی میں یعنی ۱۸٦۸ء سے جاپان میں نیا دور سروع ھوا ۔ اور یورپی علم و ادب کا اثر پڑنے لگا ۔ تو پھر طویل نظمیں لکھی جانے لگیں ۔ لوگ کہتے تھے کہ داکا اور ھائیکو چونکہ بہت چھوٹی ھیں ان میں پورے خیال کا اظہار ناممکن ھے اس لئے پورا خیال ظاھر کرنے کے لئے لمبی طرز کی نظم چاھیے ۔ لوگ پھر طویل نظموں کی طرف متوجہ ھوئے ۔ سب سے پہلے ۱۸۸۲ء میں اقتصادیات اور فلسفہ کے علماء نے غیر ممالک کی نظموں کا ترجمہ کیا ان کا بہت گہرا اثر پڑا ۔ اور ۱۸۹۷ء سے جدید

جاپانی شاعری شروع ہوگئی سب سے پہلے ساعر شیمازاکی تولوں تھے ۔ ان کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو ۔

سفید دیوار
کون جانتا ہے پھولوں کے نزدیک
اونچے قلعہ پر چڑھ کر میں نے
بیقرار اور دکھ کا حال
لکھدیا سفید دیوار پر
بھوک سے لکھے تھے وہ حروف
مٹ گئے ہیں کسی کے دیکھنے سے پہلے
ھائے ھائے سفید دیوار پر
میرا دکھ ہے میرے آنسو ہیں

اس میں خصوصیت یہ تھی کہ ایک ایک مصرعہ سات اور پانچ بولوں سے بنا تھا ۔ اس کے بعد جاپان میں نثر میں شاعری کرنا شروع ہوا جیسے

رس بھریاں
پگڈنڈی کے کنارے کے جنگل میں
لگی ہیں رس بھریاں بہت ہی ساری
انگلی سے توڑنے پر گر جاتی ہیں یہ سفاف
لال لال گولیوں کی پرسکون میٹھی تراوٹ کو
میرے ساتھ نہ چوسوگے بولتی کوئل کے اس پہاڑی علاقے میں
آج ہر پہاڑ سے اٹھ رہے ہیں بخارات بہت
ماہ جولائی کی ہریالی بڑھ گئی ہر طرف دن بدن
پہلے پھولوں کی شگفتہ چراگاہ کی باڑھوں کے بہت قریب
دور دور کی شمالی ایپلس کی چوٹیوں نے بھی اخبار کی گرمی کی صورت
گرم دھوپ بھی مستقل قائم رہنے والی تراوت لانے والی ہوا بھی اچھی

پکی رس بھری خود بخود بن جاتی ھے سراب زمین کو مست
کرنے والی

قسمت نے رھنمائی کی زندگی نے ھمیشہ ساتھ دیا
میرا بڑھاپا بھی بن گیا ھے تیز سراب کی مانند

اس سے یہ نہ سمجھنا چاھئے کہ داکا اور ھائیکو بالکل غائب ھوگئی ھیں۔ بر خلاف اس کے آج کل لوگ بڑے شوق سے دونوں نظموں پر طبع آزمائی کر رھے ھیں۔ یہ کہنا بجا ھوگا کہ جاپان کا ھر آدمی داکا اور ھائیکو کہتا ھے۔

اپنی خانگی زندگی پر تحریر سدہ ایک ھائیکو اور دالی ملاحظہ فرمائیے :

خزاں کے مچھر بھنبھناتے ھیں
سینے کی مسین کے گرد
اس کی آخری قسط ادا کردی گئی

کیسی خوب صورت ھے
زمین پر پکی ھوئی یہ چیز
ھاتھ میں لے لیا
لال لال دانوں کو

حضرت شیخ کا وطیرہ یہ تھا کہ عرسوں کی امداد اور کئی دوسرے نیک کام سرانجام دینے کے لئے امیروں سے روپیہ مانگ لاتے تھے اور چونکہ خدا کو آن کا یہ مسلک پسند تھا اس لئے مسبب الاسباب اسے وسائل بہم پہنچاتا کہ یہ آدھار لیا ہوا روپیہ کچھ عرصہ کے بعد واپس لوٹا دیتے ۔

بود شیخی دائما او وام دار از جوانمردی که بود آن نامدار
ده هزاران وام کردی از جهان خرج کردی بر فقیران جهان
هم بوام او خانقاهی ساخته جان و مال و خانقه در باخته
وام او را حق زهر جا می‌گزارد کرد حق بهر خلیل از ریگ آرد
شیخ وامی سالها این کار کرد می‌ستد میداد همچون نامرد

یہی کام کرتے کرتے حضرت شیخ کی عمر بسر ہوئی اور بالآخر جب روز اجل قریب آ پہنچا تو قرضخواہوں نے ایک دن شیخ کو گھیرے میں لے لیا ۔

تخمها می کاشت تا روز اجل تا بود روز اجل میر اجل
چونک عمر شیخ را آخر رسید در وجود خود نشان مرگ دید
شیخ بر خود خوش گداران همچو شمع وام خواهان گرد او بنشسته جمع

قرضے کی کل مقدار چار سو دینار تھی ۔ جب قرضخواہ شیخ کے گھر پر آس کے گرد جمع ہو کر مایوسی اور ترشی کا اظہار کرنے لگے تو شیخ نے کہا : ان بدگمانوں کو دیکھو ۔ کیا خدا کے پاس میرا قرضہ ادا کرنے کے لئے چار سو دینار بھی نہیں ہیں ؟

وام خواهان گشته نومید و ترش درد دلها یارشد با درد شُش
شیخ گفت این بدگمانان را نگر نیست حق را چار صد دینار زر ؟

قابل ملاحظہ یہ حقیقت ہے کہ حضرت شیخ چونکہ ایک روحانی رہنما تھے اور آنھوں نے اپنا لائحۂ یہ عمل بنا لیا تھا کہ امور خیریہ سر انجام

شیخ نے کہا میں تو عدم کو سدھار رہا ہوں ۔ تمہیں دام کہاں سے دوں ؟

سیخ گفتا از کجا آرم درم وام دارم میروم سوی عدم

بچے نے یہ سنا تو اس نے تھال زمین پر پھینکا اور واویلا کرنے لگا ۔ کہ اگر میں دام لے کر واپس نہ لوٹا تو میرا مالک مجھے جان سے مار ڈالیگا ۔ بچے کی آہ و فغاں سن کر اور لوگ بھی جمع ہو گئے ۔ بچے نے دلاں دبی لوگوں نے طعن و تشنیع کی ۔ یہاں تک کہ قرضخواہوں نے بھی کہا کہ ہمارا مال تو کھایا تھا اس غریب بچے کو لوٹنے کا کیا مقصد تھا ؟ لیکن حضرت سیخ خاموش تھے ۔ یہاں تک کہ نماز دیگر کا وقت آ گیا ۔

سیخ فارغ از جفا و از خلاف در کشیده روی چون مه در لحاف
با ازل خوش با اجل خوش شادکام فارغ از تشنیع وگفت خاص و عام
آنکه جان در روی او خندد چوقند از ترش رویی خلقش چه گزند
آنکه جان بوسه دهد بر چشم او کی خورد غم از فلک وزخشم او

در شب مهتاب مه را بر سماک از سگان و عو عو ایشان چه باک
سگ وظیفهٔ خود بجا می آورد مه وظیفهٔ خود برخ می گسترد
کارک خود میگزارد هر کسی آب نگذارد صفا بهرخسی
خس خسانه میرود بر روی آب آب صافی میرود بی اضطراب
مصطفی مه میشکافد نیم شب ژاژ میخاید ز کینه بولهب
آن مسیحا مرده زنده میکند وان جهود از خشم سبلت میکند

نفس مطمئن و بی ریا لوگوں کی ترش روئی اور خشم فلک سے بے نیازی کا جو مظاہرہ کرتا ہے اس کی کتنی دلکش اور حسین تصویر مولانا نے ان اشعار میں کھینچی ہے اور یہ ترغیب دلائی ہے کہ کمینے آدمیوں کے منہ لگنے کی بجائے ان کی طعن و تشنیع کے جواب میں خاموش رہنا افضل تر ہے ۔ کیونکہ نیک نیتی سے کام کرنے والے آدمیوں کے لئے اللہ تعالیٰ خود ایسے حالات پیدا کرتا ہے کہ انہیں مصائب برداشت کرنے اور دشوار گذار مراحل کو طے کرنے میں کوئی دقت محسوس نہیں

دینے کے لئے وہ قرض بھی مانگ لایا کریںگے اس لئے اپنی زندگی کی آخری منزل تک وہ اس منصوبے پر عمل پیرا رہے یہاں تک کہ آن کے قرضخواہ آن کو موت کے قریب دیکھ کر سوحس ہونے لگے - لیکن روحانی اقدار کے حامل کو اپنی نیک نیتی اور اپنے مسبب الاسباب کی کار فرمائی پر اس قدر اعتماد اور ناز تھا کہ اپنی موت سامنے اور قرضخواہوں کی سر گرم جستی دیکھتے ہوئے بھی آنھوں نے کہا تو صرف یہ کہ ان بدگمانوں کو دیکھو جو میرے خدا کو چارسو دینار کا قرضہ ادا کرنے پر بھی قادر نہیں سمجھتے ! اور بات صرف یہیں ختم نہ ہوئی بلکہ اپنے مسلک ، عمدہ اور خدا پر مزید بھروسہ کرتے ہوئے آنھوں نے ایک حلوہ فروش بچے سے حلوہ قرض لے کر ان قرضخواہوں کو کھلا دیا - یہاں سے حکایت ایک لطف اور مزاحیہ موڑ پر پہنچ جاتی ہے - جس سے ہمیں ایک بار پھر مولانا کے عوامی مشاہدہ کا ثبوت ملتا ہے -

قرضخواہ قرضہ کے لئے جھگڑ ہی رہے تھے کہ ایک حلوا فروش بچے نے ”حلوا لے لو“ کی ہانک لگائی اور نفع حاصل کرنے کی غرض سے دو چار لفظ تعریف کے بھی کہے - جب حضرت شیخ کے کان میں آواز پڑی تو آنھوں نے خادم کو اشارہ کیا کہ بچے سے سارا حلوا لے آؤ تاکہ قرضخواہ حلوا کھا کر کچھ دیر چین سے بیٹھیں -

کودکی حلوا ز بیرون بانگ زد	لاف حلوا بر امید دانگ زد
شیخ اشارت کرد خادم را بسر	کہ برو آن جملہ حلوا را بخر
تا غریمان چونک آن حلوا خورند	یک زمانی تلخ در من ننگرند
در زمان خادم برون آمد ز در	تا خرد او جملہ حلوا زان پسر
گفت او را کاین ہمہ حلوا بچند	گفت کودک نیم دیناری و اند
گفت نی از صوفیان افزون مجو	نیم دینارت دہم دیگر مگو

خادم اس طرح بچے کے ساتھ سودا کر کے حلوے کا تھال آدھے دینار میں خرید کر اندر لے آیا - حضرت شیخ نے قرضخواہوں سے کہا کہ آپ حلوا کھائیں - جب سب لوگ حلوا کھا چکے تو بچے نے قیمت کا مطالبہ کیا -

ھوتی چنانچه حضرت شیخ کے لئے بھی مسبب الاسباب نے یه حل نکالا که جب قرضخواھوں اور حلوا فروس انھیں مطعون کر رھا تھا اسی وقت ایک واقف حال مرید نے ایک تھال ان کی خدمت میں بھیجا جس میں ایک طرف تو چار صد دینار رکھے ھوئے تھے اور ان سے علحدہ ایک ورق میں آدھا دینار لپٹا ھوا تھا ۔ حاضرین نے یه منظر دیکھا تو دنگ رہ گئے ۔

صاحب مالی و حالی پیس پیر ھدیه بفرستاد کزوی بد خبر
چار صد دینار در گوشهٔ طبق نیم دینار دگر اندر ورق
اور حضرت شیخ سے اپنی گستاخی کے لئے معافی مانگنے لگے ۔

مولوی نے اس موقعه پر اس تصویر کو مکمل کرنے کے لئے پھر ایک ماھر نفسیات کی طرح ایک نفسیاتی خط لگایا ھے اور حاضرین سے ان کے اظہار ندامت کے لئے یه کہلوایا ھے :

ما که کورانه عصاھا میزنیم لا جرم قندیلها را بشکنیم
ماچو کرّان ناشنیده یک خطاب ھرزه‌گویان از قیاس خود جواب
ما ز موسی پند نگرفتیم کو گشت از انکار خضری زرد رو

لیکن حضرت شیخ صاحب حال و قال تھے ان کی نگاہ دور رس ظاھر بین حضار سے کہیں مختلف تھی ۔ انھوں نے کسی قسم کے تکبر یا غرور کے احساس کے بغیر حاضرین کو پھر اھم بنیادی مسائل حیات کی طرف متوجه کیا اور ارشاد فرمایا :

سرّ این آن بود کز حق خواستم لا جرم بنمود راہ راستم
گرچه این دینار بسیار اندکست لیک موقوف غریو کودکست
تانگرید کودک حلوا فروش بحر رحمت در نمی آید بجوش
(۲ : ۳۸۰—۴۴۳)

اچھے کاموں کی تقلید کے لئے مصلحین قوم عوام کو ھمیشه آمادہ کرتے رھے ھیں لیکن افعال قبیحه اور کورانه تقلید سے بچنے کی تلقین بھی بزرگوں کا شعار رھا ھے ۔ مولوی نے اندھا دھند تقلید سے باز رھنے کی ترغیب دلانے کے لئے ایک مزاحیه اور دلچسپ واقعه بیان کیا ھے ۔ اور

ثابت کیا ھے کہ حرص و ھوا کے بندوں کی تقلید کرتے ھوئے نیک منس انسان بھی ضلالت اور گمراھی کے غار میں جا گرتا ھے اور اس تقلید سے صرف اُسی کی ذات کو نقصان پہنچتا ھے اور آلودگان کثافت اور گمراہ کرنے والے اشرار سر سے صاف بچ کر نکل جاتے ھیں - یہ حکایت اس نیک منس لیکن کورانہ تقلید کرنے والے مسافر صوفی کی ھے - جس نے ایک رات ایک خانقاہ کے اصطبل میں اپنا گدھا لا کر باندھ دیا تا کہ رات خانقاہ میں بسر کر کے اگلی صبح کو اپنا سفر جاری رکھ سکے - لیکن اس صوفی کے علی‌الرغم جس کا ذکر پہلے ھوچکا ھے اس نے اپنے گدھے کو خود گھاس اور چارہ کھلایا - اور ھر طرح اس کی احتیاط کرنے کے بعد خود خانقاہ کے اندر چلا گیا- اتفاق کی بات کہ اس خانقاہ میں کچھ اور صوفی بھی جمع تھے جو ازحد مفلس اور نادار تھے انہوں نے کھانا حاصل کرنے اور محفل سماع منعقد کرنے کے لئے مسافر صوفی کا گدھا بیچ ڈالا - کیونکہ مسلمانوں کے ایک عقیدہ کے مطابق فاقہ کشی کی حالت میں مردار کھا لینا بھی مباح ھے - مولوی نے حیلہ جوئی سے مردار خوری پر اس موقع پر ایک بڑی لطیف طنز معاشرہ پر کی ھے :-

کز ضرورت هست مرداری مباح بس فسادی کز ضرورت شد صلاح

اور حقیقت بھی یہی ھے کہ مسلمانوں نے مجبوری میں مراعات کے جواز کو اس طرح توڑا مروڑا ھے کہ اس سے معاشرے میں فساد عظیم برپا ھوگیا ھے اور اخلاقی اقدار بے معنی حرف بن کر رہ گئی ھیں - بہر صورت صوفیوں نے مسافر کا گدھا بیچ کر اس کی بڑی تواضع کی اور کھانے کے بعد سماع شروع کردیا - مسافر بھی دوسرے صوفیوں کے ساتھ ھر کام میں برابر کا شریک تھا - سماع شروع ھوا تو مطرب نے " خر برفت و خر برفت " کی دھن نکالی اور آخر تک اسے ھی بجاتا رھا - تمام صوفی اسی دھن پر ناچتے اور تالیاں بجاتے ھوئے " خر برفت - خر برفت " گاتے رھے :

چون سماع آمد ز اول تا کران مطرب آغازید یک ضرب گران
خر برفت و خر برفت آغاز کرد زین حرارت جمله را انباز کرد
زین حرارت پای کوبان تا سحر کف زنان خر رفت و خر رفت ای پسر

مسافر صوفی نے یہ دھن سنی تو سوچے سمجھے بغیر یہ بھی دوسروں کی تقلید کرتے ہوئے ان کے ساتھ شامل ہوگیا اور پوری قوت سے '' خر رفت '' کا ترانہ گانے لگا ۔

از رہ تقلید آن صوفی ہمین   خر برفت آغاز کرد اندر حنین

صبح ہوئی تو تمام صوفیوں نے اپنی اپنی راہ لی ۔ مسافر صوفی بھی اپنا سامان باندھ کر اصطبل کی طرف بڑھا تاکہ گدھے پر اسے لاد کر سفر شروع کرے لیکن گدھا وہاں ہوتا تو ملتا ۔ ادھر ادھر تلاش کرنے کے بعد اس نے خادم سے ناراض ہو کر کہا ۔

گفت من خررا بتو بسپرده ام   من ترا بر خر موکل کرده ام
بحث با توجیه کن حجت میار   آنچ بسپردم ترا واپس سپار
از تو خواهم آن من دادم بتو   باز ده آنچ فرستادم بتو
گفت پیغمبر که دستت هر چه برد   بایدش در عاقبت واپس سپرد
ور نهٔ از سرکشی راضی بدین   نک من و تو خانهٔ قاضی دین

خادم نے جواب دیا کہ صوفیوں نے ملکر مجھ پر حملہ کر دیا تھا اور میں نے جان کے خوف سے انہیں گدھا دے دیا ۔

اس پر صوفی اور بگڑا اور بولا : کم از کم تمہیں یہ تو کرنا چاہیے تھا کہ مجھے آ کر بتا دیتے ۔ کہ وہ تمہارا گدھا لئے جا رہے ہیں ۔ تا کہ میں اسے واپس حاصل کرنے کی کوشش کرتا ۔ اور جب تک وہ یہاں موجود تھے اس مصیبت کا کچھ نہ کچھ علاج کیا جاسکتا تھا اب میں کسے پکڑوں اور کسے قاضی کے پاس لے جاؤں کیونکہ صوفی تو اپنی اپنی راہ چل دیئے ۔

اس موقع پر یہ راز کھلا کہ اس نقصان کے لئے دراصل صوفی خود بھی ذمہ دار تھا ۔ کیونکہ خادم نے بتایا کہ میں بارہا تمہیں اس حادثہ کی اطلاع دینے کے لئے محفل سماع میں آیا ۔ لیکن ہر بار جب میں یہاں پہنچا تو تم دوسرے صوفیوں کے ساتھ ملکر سب سے زیادہ زور دار آواز میں ''خررفت''

کا نغمہ الاپ رہے تھے - میں نے سوچا تم مرد عارف ہو تمہیں سارے واقعہ کی اطلاع ہو ہی گئی ہے اسلئے میرا کہنا کیا ضرور ہے کیونکہ تم اس پر بڑے مطمئن نظر آتے تھے -

گفت و اللہ آمدم من بار ها   تاترا واقف کنم زین کار ها
تو همی گفتی که خر رفت ای پسر   از همه گویندگان باذوق تر
باز میگشتم که او خود واقف است   زین قضا راضیست مرد عارف است

اس پر صوفی نے اپنا سر پیٹ لیا - اور اس نے یہ محسوس کیا کہ رات کی کورانہ تقلید نے مجھے برباد کیا - اور تقلید بھی ان کمینے آدمیوں کی جنہوں نے روٹی کے لئے مجھے اس قدر مصیبت میں پھنسا دیا -

گفت آنرا جمله میگفتند خوش   مر مرا هم ذوق آمد گفتنش
مر مرا تقلید شان برباد داد   که دو صد لعنت بر این تقلید باد
خاصه تقلید چنین بی حاصلان   کآبرو را ریختند از بهر نان

(۲ : ۵۲۰—۵۷۰)

جاہل اور نادان کی دوستی سے تحصیل آزار کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوتا - بظاہر یہ سادہ سا مقولہ ہے اور دوسروں کو اس مقولہ کی صداقت تسلیم کرانے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی - لیکن مولوی نے اس ایک انسان کا قصہ بیان کرکے جس نے خرس کے تملق و وفا پر اعتماد کرکے جان گنوا دی تھی کچھ اس قسم کی نفسیاتی ترغیب دلائی ہے کہ کوئی ذی شعور آدمی یہ حکایات جاننے کے بعد خرس نما انسانوں کی دوستی پر اعتماد نہیں کر سکتا - فہم و شعور کے لحاظ سے جانوروں کا مرتبہ انسانوں سے یوں بھی کمتر ہے لیکن اس حکایت میں جہالت اور نادانی کی تجسیم کرنے کے لئے مولوی نے جانوروں میں ریچھ کے کردار کا جو انتخاب کیا ہے وہ فنی لحاظ سے اور مشاہدہ کے اعتبار سے مولوی کی صناعی کی ایک روشن مثال ہے - انسان کا نادان دوست ایک ابلہ انسان سے لے کر کوئی جانور دکھایا جا سکتا تھا اور حکایت مکمل کرنے کے لئے انسان یا کسی جانور کو آزار رسانی کے آلہ کے طور پر استعمال کیا جا

سکتا تھا لیکن مولوی کی نظر انتخاب اس سلسلے میں صرف ریچھ پر پڑی ہے ۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تمثیل کی اس تصویر میں تمثال خرس نے جو رنگ بھرا ہے وہ اثر اور کسی طرح بھی پیدا نہیں کیا جا سکتا تھا ۔ حکایت سنیے ۔

ایک ریچھ کو کسی اردھا نے پکڑ رکھا تھا اتفاق سے ایک شیر مرد کا گذر اُس طرف سے ہوا ۔ اور اُس نے ریچھ کو اردھا سے چھڑوا لیا ۔

خرس هم از اردها چون وارهید
وان کرم زان مرد مردانه بدید
چون سگ اصحاب کهف آن خرس زار
شد ملازم در پی آن برد بار

اور اس کے بعد یہ انسان اور ریچھ اکٹھے رہنے لگے ۔ ایک اور آدمی نے ان دونوں کو اکٹھا دیکھا تو اُس نے اس کی توجیہ چاہی ۔ ریچھ والے انسان نے اردھا اور ریچھ کا قصہ کہہ سنایا ۔ اس پر دوسرے آدمی نے انسان سے کہا کہ تمہیں ریچھ کو اپنے آپ سے الگ کر دینا چاہئے کیونکہ ناداں کی دوستی سے کوئی فائدہ نہیں :

دوستی زابله بتر از دشمنیست	او بہر حیله که دانی راندنیست
هی بیا با من بران این خرس را	خرس را مگزین مهل هم جنس را

ریچھ والے نے سمجھا کہ یہ آدمی محض جسارت کی وجہ سے ایسی تبلیغ کر رہا ہے ۔ لیکن دوسرا آدمی بھی بڑا ضدی تھا ۔ اُس نے یہاں تک کہہ دیا کہ میری دشمنی بھی اس کی دوستی سے بہتر ہے ۔ بلکہ اگر تمہیں ریچھ جیسے انسان سے ہی دوستی رکھنا ہے تو ریچھ کو ترک کرکے میرے دوست بن جاؤ کیونکہ میں بھی ریچھ سے کم نہیں :

گفت مهر ابلهان عشوه ده است	این حسودیّ من از مهرش بهست
من کم از خرسی نباشم ای شریف	ترک او کن تا منت باشم حریف
بر تو دل میلرزدم ز اندیشهٔ	با چنین خرسی مرو در بیشهٔ

لیکن ریچھ والے پر کسی بات کا اثر نہ ہوا ۔ بلکہ اس نے دوسرے آدمی کو جھڑک کر کہا : جاؤ اپنا کام کرو اور مجھے سونے دو ۔ اور یہ کہہ کر لیٹ گیا ۔ ابھی اس کی آنکھ لگی ہی تھی کہ ایک مکھی آ کر اس کے منہ پر بھنبھانے لگی ۔ ریچھ نے مکھی اڑانے کی کوشش کی لیکن جب اس میں کامیاب نہ ہوا تو بپھّا گیا ۔ اور اپنی عقل کے مطابق تدبیر سوچ کر پہاڑ سے ایک بڑا سا پتھر اٹھا لایا ۔ مکھی اس وقت سوئے ہوئے جوان کے منہ پر بیٹھی ہوئی تھی ۔ اس نے مکھی کو تاک کر یہ پتھر اس زور سے اس کے منہ پر مارا کہ جوان کا چہرہ خشخاش ہی ہو بن گیا :

خشمگین شد با مگس خرس و برفت   بر گرفت از کوه سنگی سخت زفت
سنگ آورد و مگس را دید باز   بر رخ خفته گرفته جای ساز
بر گرفت آن آسیا سنگ و بزد   بر مگس تا آن مگس واپس خزد
سنگ روی خفته را خشخاش کرد   این مثل بر جمله عالم فاش کرد
مہر ابلہ مہر خرس آمد یقین   کین او مہرست و مہر اوست کین
(۲ : ۱۹۳۷ — ۲۱۵)

بسا اوقات مولوی نے مختلف عقاید کی تبلیغ کرنے اور بیک وقت مختلف ترغیبات دلانے کے لئے ایک ہی حکایت نظم کر دی ہے ۔ مثال کے طور پر ذیل کی حکایت پیش کی جاسکتی ہے ۔ جس میں جہاں ایک طرف تو اس خیال کی اشاعت کی گئی ہے کہ اپنے ہمنواؤں اور مخلص دوستوں کو اغیار کے کہنے سے بر مردود نہ گردانا چاہیے ۔ وہاں ساتھ ہی ساتھ یہ حقیقت بھی واضع کی گئی ہے کہ دشمنوں کی تعداد اگر زیادہ ہو اور وہ تم سے قوی ہوں تو ان سے کامیاب طور پر نبٹنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ان کو ایک دوسرے کے خلاف آمادہ پیکار کیا جائے ۔ تاریخ اقوام عالم اس بات کی شاہد ہے کہ بین الملی جنگوں میں یہ حیلہ جوئی (Strategy) ہرحربہ سے زیادہ کامیاب رہی ہے اور جب کسی کمزور قوم یا ملک نے متحدہ دشمنوں میں اختلاف پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے اس نے الگ الگ اپنے تمام دشمنوں کو بھی پچھاڑا ہے ۔

یہ ایک باغبان کا قصہ ہے۔ جس نے اپنے باغ میں تین مضبوط چور دیکھے ۔ جن میں سے ایک صوفی تھا ایک فقیہ اور ایک علوی ۔ باغبان نے سوچا اگر میں ان تینوں سے بیک وقت جھگڑا کرتا ہوں تو یہ مجھے پیٹینگے ۔ ہونہو کسی طرح سے ان کو الگ الگ کیا جائے اور پھر میں ان میں سے ہر ایک کی مونچھیں نوچ لونگا ۔

بر نیایم یک تنه با سه نفر پس بہرمسان نخست از همد گر
هر یکی را زان دگر تنها کنم چو نکه تنها سد سبالس بر کنم

یہ سوچ کر وہ آگے بڑھا اور صوفی کو مخاطب کرکے کہنے لگا : ذرا دوڑ کر میری کوٹھڑی سے اپنے دوستوں کے ایک لئے نمدہ تو لے آؤ ۔ صوفی نمدہ لینے گیا تو باغبان نے فقیہ اور علوی سے کہا آپ فقیہ ہیں اور یہ سریف نامدار ۔ ہم تو روٹی بھی آپ کے فتوے سے کھاتے ہیں اور یہ خاندان مصطفی کے فرد یعنی سید ہیں ۔ لیکن یہ کنجوس شکم پرور صوفی کون ہے ۔ جسے آپ ساتھ لوالائے ہیں آپ جیسے بادشاہوں کے ساتھ ایسا دوست نہیں سجتا ۔ آپ اسے بھگا دیں اورمیرے باغ میں ایک ہفتہ بیٹھے رہیں ۔ اور باغ کا کیا ذکر آپ کے لئے تو میری جان بھی حاضر ہے ۔

رفت صوفی گفت خلوت با دو یار تو فقیہی این شریف نامدار
ما بفتوی تو نانی میخورم ما بپر دانش تو میپرم
وین دگر شه زاده و سلطان ماست سیدست از خاندان مصطفی‌است
کیست این صوفی شکم‌خوار خسیس تا بود با چون شما شاهان جلیس
چون بیاید مر ورا پنبه کنید هفتهٔ بر باغ و راغ من زنید
باغ چه بود جان من آن شماست ای شما بوده مرا چون چشم راست

اس خوشامد اور تبلیغ کا خاطر خواہ اثر ہوتا دیکھ کر باغبان صوفی کے تعاقب میں گیا اور موٹے ڈنڈے سے اس کی خوب مرمت کی اور کہا یہ باغ میں چوری کرنا تمہیں جنید اور بایزید نے سکھایا ہے ۔ یا تمہارے پیرو مرشد نے؟

این جنیدت ره نمود و بایزید از کدامین شیخ و پیرت این رسید

صوفی نے دوستوں سے استمداد کے لئے بہت شور مچایا لکن دوستوں کی نگاہیں اب بدل چکی تھیں ۔ اس نے انہیں بہتیرا سمجھایا کہ تمہارا حشر بھی برا ہونے والا ہے اور میرے ساتھ تم نے باغبان کے کہے سنے پر جو بےوفائی کی ہے اس کی سزا تمہیں بھگتنی پڑیگی لیکن دوستوں پر اس کی الحاح وزاری اور فہمایش کا کوئی اثر نہ ہوا ۔

باغبان نے صوفی سے فارغ ہو کر ایک نیا بہانہ تراشا اس نے سید سے کہا ۔ آپ میری کوٹھڑی میں تشریف لے جائیے میں نے دوپہر کا کھانا تیار کیا ہوا ہے ۔ آپ کنیز سے کہیں کہ روٹی اور مرغابی یہاں لے آئے ۔

کای شریف من برو سوی وثاق ٭ که ز بهر چاشت پختم من رُقاق
بر در خانه بگو قیماز را ٭ تا بیارد آن رقاق و قاز را

سید چلا گیا تو باغبان نے فقیہ کو بھکانا شروع کیا :

تو فقیهی ظاهرست این و یقین ٭ چون بره گردش بگفت این مرد دین
او شریفی میکند دعوی سرد ٭ مادر او را که میداند که کرد
بر زن و برفعل زن دل می نهد ٭ عقل ناقص و آنگهانی اعتمد
خویشتن را بر علی و بر نبی ٭ بسته است و در زمانه بس غبی
هر که باشد از زنا و زانیان ٭ این برد ظن در حق ربانیان
هر که برگردد سرش از چرخها ٭ همچو خود گردنده بیند خانه را

سید کے مشتبہ نسب کا افسون جو باغبان نے بڑھا تو فقیہ بھی چکمے میں آ گیا ۔ بس پھر کیا تھا ۔ باغبان نے سید کو آڑے ہاتھوں لیا اور کہا :

دزدی از پیغمبرت میراث ماند ٭ گفت ای خر اندرین باغت که خواند
شیر را بچه همی ماند بدو ٭ تو بپیغمبر چه مانی بگو

یہ کہہ کر اس پر پل پڑا اور اسے پیٹ کر باغ سے باہر نکال دیا ۔ سید نے جاتے جاتے فقیہ سے کہہ دیا :

پای دار اکنون که ماندی فرد و کم ٭ چون دهل شو زخم میخور بر شکم
گر شریف و لایق و همدم نیم ٭ از چنین ظالم ترا من کم نیم

چنانچہ اُس کی پیشگوئی درست ثابت ہوئی ۔ باغبان نے سد سے فارغ ہو کر فقیہ سے پوچھا : کیا تیرا فتویٰ یہی کہتا ہے کہ مالک کی اجازت لئے بغیر اُس کے باغ میں گھس جانا چاہئے ؟ کیا اس قسم کی اجازت کا ذکر تو نے ''وسیط'' میں پڑھا ہے یا ''محیط'' میں ؟

سند ازو فارغ بیامد کای فقیہ چہ فقیہی ای تو ننگ ہر سفیہ

فتویت اینست ای بریدہ دست کاندر آیی و نگوی امر ہست

این چنین رخصت بخواندی در وسیط یا بُدست این مسئلہ اندر محیط

یہ کہہ کر اُس نے فقیہ کو بھی باغ سے بھگ دیا ۔ جو پٹا ہوا اور کف افسوس ملتا ہوا یہ کہہ کر روانہ ہوا :

گفت حقست بزن دستت رسید این سزای آنک از یاران برید

حرامخوری سے باز رکھنے کے لئے اور دوسروں کا مال ہضم کرنے کےخلاف وعظ تو اکثر لوگ کرتے چلے آئے ہیں ۔ لیکن مولوی نے جس واضح انداز میں اس انفرادی اور اجتماعی عیب سے بچنے کی ترغیب دلائی ہے اُس کا جواب نہیں ۔ قصہ کا محیط بجا طور پر ہندوستان منتخب کیا گیا ہے ۔ جس کا اس وقت پاکستان بھی حصہ تھا ۔ اور جس میں عصر حاضر کی طرح دزدان ملت بس رہے تھے ۔ اسی ہندوستان میں ایک دانا نے اپنے چار مسافر دوستوں کو دیکھا جو سفر کی صعوبت اور بےسروسامانی کے مصائب سے نڈھال ہو رہے تھے اور خیر سگالی کے جذبہ سے متاثر ہو کر ان سے کہہ دیا : بھائی مجھے معلوم ہے کہ تم پر بڑا مشکل وقت آپڑا ہے ۔ اور تمہاری گرسنگی اور ضرورت حد سے زیادہ بڑھی ہوئی ہے ۔ لیکن جس راستے پر تم جا رہے ہو ۔ اس راستے میں ایک ہاتھی رہتا ہے ۔ اور اس کے بچے بھی ہیں ۔ خدا کے لئے ہاتھی کا کوئی بچہ بھون کر نہ کھا جانا کیونکہ ان کی ماں تاک میں رہتی ہے اور سو فرسنگ سے آ کر بھی حملہ کردیتی ہے ۔ اور یہ ہتھنی بھی ایسی ہے جس کی سونڈ سے آگ اور دھواں نکلتا ہے ۔ وہ ہر ایک آدمی کا منہ سونگھتی ہے ۔ اور جس آدمی نے اس کے بچے کے کباب کھائے ہوں اُس کا معدہ نکال لیتی ہے ۔ بہتر یہ ہوگا کہ دوران سفر میں آپ برگ و گیاہ پر ہی قناعت کریں ۔ اور ہاتھی کے بچوں کا شکار نہ کریں ۔ یہ کہہ کر اس نے انہیں خیرباد کہی ۔

چاروں دوست راستے پر چل رہے تھے کہ انہیں ہاتھی کا ایک بچہ دکھائی دیا۔ جو نہایت فربہ اور نوزادہ تھا۔ یہ اس پر گرگان مست کی طرح پل پڑے اور دم زدن میں بھون کر کھا گئے۔ صرف ان کے ایک ساتھی نے دوست کی نصیحت کو یاد رکھتے ہوئے ہاتھی کے بچے کے کباب کھانے سے انکار کر دیا :

آن یکی همره نخورد و پند داد که حدیث آن فقیرش بود یاد
از کبابش مانع آمد آن سخن بخت نو بخشد ترا عقل کهن

اور پھر یہ چاروں دوست پڑ کر سو رہے۔ اتنے میں ہتھنی بچے کو ڈھونڈتی ہوئی وہاں آپہنچی اور اس نے تین بار اس سوتے ہوئے آدمی کے منہ کو سونگھا جس نے کباب نہیں کھائے تھے۔ پھر وہ چند بار اس کے گرد گھومی اور اسے آزار پہنچائے بغیر دوسرے آدمیوں کے پاس جا پہنچی۔ اس نے ان تینوں کے منہ سونگھے اور کباب کھانے والوں کو چیر پھاڑ کر مار ڈالا۔ اور پھر ہوا میں اس قدر بلند اچھالا۔ کہ جب ان کی لاش زمین پر گری تو اس میں شگاف پڑ گیا :

بر هوا انداخت بریک را گزاف تا همی زد بر زمین میشد شگاف

اس طرح سے ان تینوں مسافروں کا یہ حسرتناک انجام ہوا۔

مولوی اس حکایت سے حرامخوروں اور غاصبوں کو ڈراتے ہوئے کہتے ہیں :

ای خورندهٔ خون خلق از راه برد تا نه آرد خون ایشانت نبرد
مال ایشان خون ایشان دان یقین زانک مال از زور آید در یمین
مادر آن پیل بچگان کین کشد پیل بچه خواره را کیفر کشد
پیل بچه میخوری ای پاره خوار هم بر آرد خصم پیل از تو دمار
بوی رسوا کرد مکر اندیش را پیل داند بوی طفل خویش را
آنکه یابد بوی حق را از یمن چون نیابد بوی باطل را ز من
تو همی خسپی و بوی آن حرام میزند بر آسمان سبز فام
همره انفاس زشتت میشود تا ببو گیران گردون میرود

بوی کبر و بوی حرص و بوی آز　　در سخن گفتن بیاید چون پیاز
گر خوری سوگند من کی خورده ام　　از پیاز و سیر و تقوی کرده ام
آن دم سوگند غمازی کند　　بر دماغ همنشینان بر زند
(۳ : ۷۰—۱۶۸)

یہ اشعار کچھ اس قسم کے ہیں جن کو ترجمہ کے ساتھ تمام تعلیمی اور دولتی اداروں میں آویزاں کرنا چاہیے۔

کچھ آدمی آپ کے افق حیات پر جب ظہور پذیر ہوتے ہیں تو ان کی رفتار و کردار کچھ اس قسم کے ہوتے ہیں کہ آپ ان کی ہر ایک طرح کی مدد کرنے پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔ اور بعض دفعہ آپ کی عنایات و الطاف کا سلسلہ اس قدر طول پکڑتا ہے کہ آپ یہ سراسر فراموش کر بیٹھتے ہیں کہ کن حالات میں اس شخص سے آپ کا واسطہ پڑا تھا جو آپ کے جود و سخا سے متمتع ہو رہا ہے۔اور حقیقت یہ ہے کہ اچھے انسانوں کی یہ صفت ازل سے چلی آئی ہے کہ وہ اپنے احسان کے لئے بدلہ یا ستائش کی تمنا کے بغیر اپنے دست نوال سے لوگوں کو نوازتے چلے آئے ہیں مولوی کے ہاں ایسے انسانوں کے لئے بے پناہ ارادت اور تکریم کے جذبات کا اظہار ملتا ہے۔ لیکن اس مشاہدہ نگار نے اہل سخاوت کے اس رویہ کی تعریف کرتے ہوئے انہیں اس خوفناک حقیقت سے بھی روشناس کرایا ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ ہر ایک مرہون احسان اس احسان کا بدلہ بھی چکا سکے۔ بلکہ اگر کوئی ایسا آدمی اس کا ادعا بھی کرے تو اس کے شفاہی دعووں کی تصدیق کرنے کے بغیر اس کی دعوت مروت کو قبول نہیں کرنا چاہئے ورنہ اس سے نہایت مایوس کن نتائج مرتب ہونگے اور وہی انسان جو آپ کے احسان کے زیر بار ہے اپنی مجبوریوں کی وجہ سے آپ سے یوں آنکھیں پھرالیگا اور آپ کو گرداب مصائب میں اس طرح چھوڑ دیگا کہ آپ کے لئے راہ نجات تلاش کرنا دشوار ہوجائیگا۔

یہ ایک دیہاتی کسان کی حکایت ہے جو ہر سال ایک شہری تاجر کا مہمان ہوا کرتا تھا۔

هر حوائج راه که بودیش آنزمان راست کردی مرد شهری رائیگان

شہری تاجر اپنی وسیع النظری اور مہمان نوازی کے جذبہ کی وجہ سے اور کسی قسم کے معاوضہ کے لالچ کے بغیر اس دیہاتی سے حسن سلوک سے پیش آتا تھا ۔ اور دیہاتی چند دن اس شہری کی تواضع سے متمتع ہو کر گاؤں لوٹنے لگتا تو ہر بار یہ تقاضا کرتا :

روبشهری کرد وگفت ای‌خواجه نو هیچ می نائی سوی ده فرجه جو
الله الله جمله فرزندان بیار کین زمان گلشنست و نو بهار
یا بتابستان بیا وقت ثمر تا ببندم خدمتت را من کمر
خیل و فرزندان و قومت را بیار در ده ما باش سه ماه و چهار
که بهاران خطهٔ ده خوش بود کشتزار و لالهٔ دلکش بود

الغرض ہر سال دیہاتی کا یہی تقاضا ہوتا کہ کبھی بہار میں اپنے بال بچوں کو ساتھ لے کر گاؤں آئیے یا گرما میں وہاں تشریف لائیے تا کہ آپ پکے ہوئے پھل کھا سکیں اور تین چار مہینے میرے پاس گذاریں ۔ لیکن شہری ہر سال بات آئندہ سال پر کسی نہ کسی عذر پر ٹال دیتا ۔ کبھی کہتا کہ اس سال ہمارے پاس فلاں مہمان آنے والے ہیں ۔ کبھی کہتا کہ اس سال یہ مصروفیت ہے اگلے سال ضرور آؤں گا ۔ اسی طرح دس سال گذر گئے اور دیہاتی کے متعدد تقاضوں کے باوجود شہری اس کے ہاں نہ جاسکا لیکن دیہاتی اس عرصے میں ہر سال شہر میں آ کر شہری کا مہمان بنتا ۔ اور آخری بار اس نے قسمیں دلا کر شہری سے کہا اس سال آپ اپنے بچوں کو ساتھ لے کر ضرور آئیے ۔

بازسوگندان بدادش کای کریم گیر فرزندان بیا بنگر نعیم
دست او بگرفت سه کرت بعهد کالله زو بیا بنمای جهد

اس دفعہ دیہاتی رخصت ہوا تو شہری کے بچوں نے کہا : ابّا جان ! سفر کے لئے موسم بھی اچھا ہے آپ دس سال سے اس دیہاتی سے وعدہ کر رہے ہیں ہم کیوں نہ اس کے ہاں چلیں ۔ وہ تو آپ سے الگ ہمیں

بھی یہ بات چپکے چپکے کہہ گیا ہے کہ ہم آپ کو اُس کے ہاں ضرور کھینچ کر لے جائیں۔ آپ نے اُس پر اتنے احسان کئے ہیں کہ وہ اب چند احسانوں کا بدلہ چکانا چاہتا ہے۔

کودکان خواجه گفتند ای پدر ماه و ابر و سایه هم دارد سفر
حقها بروی تو ثابت کردهٔ رنجها در کار او بس بردهٔ
او همی خواهد که بعض حق آن واگزارد چون شوی تو میهمان
بس وصیت کرد ما را او نهان که کشیدش سوی ده لابه کنان

باپ نے بچوں سے کہا: یہ صحیح ہے کہ وہ میرے احسانوں کا بدلہ چکانا چاہتا ہے اور تمہاری خواہش بھی بجا ہے۔ لیکن میں ڈرتا ہوں کہ اس سے ہماری دوستی میں فساد نہ آجائے۔ مجھ سے جس طرح بن پڑتا ہے میں اس دوست کی خدمت کرتا ہوں۔ اب اسے امتحان میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ لیکن ادھر بچوں کا تقاضا تھا اور اُدھر دیہاتی دوست کے پیغام پر پیغام آرہے تھے۔ خواجہ شہری نے بہت عذر کئے اور یہاں تک کہا کہ بادشاہ نے ایک نازک کام میرے سپرد کیا ہوا ہے اور ہر صبح و شام اُس کا ایک کرنیل اس کام کے متعلق مجھ سے پوچھنے آتا ہے۔ ان حالات میں میں بادشاہ کا کام ادھورا چھوڑ کر اپنی جان کیسے خطرے میں ڈال سکتا ہوں۔

خواجهٔ حازم بس عذر آورید بس بهانه کرد با دیو مرید
گفت اینکم کار ما دارم مهم گر بیایم آن نگردد منتظم
شاه کار نازکم فرموده است ز انتظارم شاه شب نغنوده است
من نیارم ترک امر شاه کرد من نتانم شد برسه روی زرد
هرصباح و هرمسا سرهنگ خاص میرسد از من همی جوید مناص
تو روا داری که آیم سوی ده تا در ابرو افگند سلطان گره
بعدازان درمان خشمش چون کنم زنده خودرا زاین مگر مدفون کنم
زاین نمط او صد بهانهٔ باز گفت حیلها با حکم حق نفتاد جفت

لیکن بچوں اور دوست کا تقاضا غالب آیا اور خواجۂ شہری اپنے

بال بچوں کو ساتھ لے کر گاؤں جا پہنچا ۔ زمانے کے دستور کے مطابق یہ سارا سفر باربردار جانوروں کے ذریعہ ہوا اور اس پر ایک مہینہ صرف ہوا ۔ لیکن جب یہ سارا کنبہ دیہاتی کے گاؤں میں پہنچا تو اس نے انہیں پہچاننے سے انکار کردیا ۔ شہری نے بہتیرا کہا : میں فلاں شخص ہوں ۔ تم اتنے سالوں سے میرے ہاں مہمان بن کر آتے رہے ہو ۔ میرے ہاں کھانا کھاتے رہے ہو ۔ میں نے تمہارے لئے فلاں فلاں چیزیں خریدیں لیکن دیہاتی کا صرف ایک جواب تھا : میں تمہیں نہیں جانتا ۔

بعد ماهی چون رسیدند آن طرف　　بینوا ایشان ستوران بی علف

روستایی بین که از بدنیتی　　میکند بعد اللتیا والتی

روی پنهان میکند زیشان بروز　　تا سوی باغش بگشایند پوز

او همی دیدش همی کردش سلام　　که فلانم من مرا اینست نام

گفت باشد من چه دانم تو کیی　　یا پلیدی یا قرین پاکیی

گفت اینهم با قیامت شد شبیه　　تا برادر شد یفر من اخیه

شرح میکردش که من آنم که تو　　لوتها خوردی ز خوان من دو تو

آن فلان روزت خریدم آن متاع　　کل سر جاوز الاثنین شاع

دیہاتی پر دوستی کے واسطہ یا الحاح و زاری کا کوئی اثر نہ ہوا کیونکہ درحقیقت وہ بدنیت آدمی تھا اور سارا عرصہ شہری کو دھوکا دیتا رہا تھا ۔ اب شہری کی عجب کیفیت تھی ۔ نه جای ماندن نه پای رفتن ۔ بال بچوں کے ساتھ ایک مہینہ کا سفر کر کے وہ یہاں پہنچا تھا ۔ سفر کی تھکان سے نہ صرف انسان بلکہ حیوان بھی نڈھال ہو رہے تھے ۔ پانچ روز غالباً آسمان کے نیچے گذرے ۔ اس کے بعد بدقسمتی سے بارش شروع ہوگئی ۔ یہ لوگ کہاں جاتے ۔ آخر شہری کو ایک ترکیب سوجھی ۔ پانچ دن چلچلاتی دھوپ میں وقت گذارنے کے بعد جب بارش نے تنگ کیا تو اس نے دیہاتی سے جا کر کہا : بھائی ان پانچ دنوں میں ہم نے پانچ سالوں کی صعوبت برداشت کی ہے ۔ میں اپنے حق سے دستبردار ہوتا ہوں ۔ میں نے تم پر کبھی کوئی احسان نہیں کیا لیکن خدا کے لئے اب اس باد و باراں

کے عذاب سے تو ہمیں بچاؤ اور پناہ لینے کے لئے کوئی جگہ دو۔ دیہاتی نے کہا: میرے پاس اور تو کوئی جگہ نہیں۔ اس باغ میں ایک کونہ ہے۔ جہاں باغبان ہر وقت ہاتھ میں تیر و کمان لے کر کھڑا رہتا ہے تاکہ اگر بھیڑیا اس طرف آئے تو اس کی مدافعت کرے۔ اگر تم یہ خدمت سرانجام دے سکو تو میں باغبان کا کونہ تمہیں دے دوں گا۔ شہری نے کہا: خدا را تیر کمان مجھے دے دو میں یہ خدمت دل و جان سے بجا لاؤں گا۔ اور اگر بھیڑیا آئے گا تو اسے ہلاک کرڈالوں گا۔ ہمارے سر پر بارش برس رہی ہے اور پاؤں دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ہمیں فوراً پناہ دو۔ دیہاتی نے مکان کا گوشہ دکھلایا تو شہری اور اس کا کنبہ اس کونے میں یوں گھسے جیسے ٹڈی دل ایک دوسرے کے اوپر سوار ہوتا ہے۔

گوشۂ خالی شد و او باعیال ۔ رفت آنجا جای تنگ و بے مجال
چون ملخ بر ہمدگر گشته سوار ۔ از نہیب سیل اندر کنج غار

مولوی فرماتے ہیں:—

این سزای آنکه شد یار خسان ۔ یا کسی کرد از برای ناکسان
این سزای آنکه اندر طمع خام ۔ ترک گوید خدمت خاک کرام
خاک پاکان لیسی و دیوار سان ۔ بهتر از عام وز و گلزار شان
بندۂ یک مرد روشن دل شوی ۔ به که بر فرق سر شاهان روی
این سزای آنک بی تدبیر عقل ۔ بانگ غول آمدش بگزید نقل
چون پشیانی زدل سد تا شغاف ۔ زان سپس سودی ندارد اعتراف

پھر صورت شہری اپنے بچوں کو کونہ میں بٹھا کے خود تیر کمان لے کر کھڑا ہوگیا۔ اور لگا بھیڑیے کا انتظار کرنے۔ بادو باران کی تاریک رات اور جان کا خوف اس پر مستزاد۔ شہری کو ہر چیز دور سے بھیڑیا نظر آتی تھی۔ اور پھر دفعتاً ایک اوٹ سے بھیڑیے کی ایک تمثال نے سر نکالا۔ خواجۂ شہری نے فوراً تیر چلایا اور شکار لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑا۔ اور اس کے گرنے کے ساتھ ہی اس کی ہوا سرکی۔ اور دیہاتی نے ہائے ہائے کرتے ہوئے سر پیٹنا شروع کردیا۔ اور کہا: ظالم تو نے

میرے گدھے کے بچے کو ہلاک کردیا ہے ۔ شہری مصر تھا کہ ہلاک ہونیوالا جانور بھیڑیا ہے اور دیہاتی کہے جاتا کہ یہ کرّۂ خر ہے ۔ اور اس کی وجہ یہ بتاتا کہ میں اس ہوا کو پہچانتا ہوں جو اس سے خارج ہوتی ہے :

گفت بی بادی که جست از فرج وی — می شناسم همچنانک آبی ز می
کشتهٔ خر کرّهٔ ام را در ریاض — که مبادت بسط هرگز ز انقباض

شہری نے کہا : رات کا وقت ہے تم خواہ مخواہ شور مچا رہے ہو ۔ ابر و باراں کی تاریکی میں کچھ صاف نظر نہیں آتا ۔ تم پہلے تفحص تو کر لو پھر مجھے الزام دینا ۔ لیکن دیہاتی نے کہا کہ میں تو دس ہواؤں میں سے اس ہوا کو پہچانتا ہوں :

گفت آن بر من چو روز روشنست — می‌شناسم باد خر کرهٔ منست
در میان بیست باد آن باد را — می‌شناسم چون مسافر زاد را

اس پر شہری کو غصہ آ گیا اور اس نے دیہاتی کا گریبان پکڑ لیا ۔ اور کہا : شیطان ! رات ، بادل اور بارش کی تین تاریکیوں میں تم اپنے گدھے کے بچے کی ہوا کو تو پہچان سکتے ہو ۔ اور مجھے نہیں پہچانتے جس کے پاس جا کر تم گذشتہ دس سال سے مہمان ٹھہرتے رہے ہو ۔ کیا تم نے آج بھنگ اور افیون ملا کر پی ہوئی ہے جو اس قسم کی باتیں کر رہے ہو ۔ مجھے تو کل کا کھایا ہوا کھانا یاد نہیں اور تم اس تاریکی میں جانوروں تک کو پہچان رہے ہو اور مجھے پہچاننے سے معذور ہو ۔ یہ بے مروتی کی انتہا نہیں تو کیا ہے ؟ :

خواجه بر جست و بیامد ناشکفت — روستایی را گریبانش گرفت
کابله طرار شید آورده — بنگ و افیون هر دو با هم خورده
در سه تاریکی شناسی باد خر — چون بنشناسی مرا ای خیره سر
آنکه داند نیم شب گوساله را — چون نداند همره ده ساله را
خویشتن را عارف و واله کنی — خاک در چشم مروت میزنی
آنچ دی خوردم از آنم یاد نیست — این دل از غیر تحیّر شاد نیست

(۳ : ۲۳۷—۶۷۵)

بھرم رکھنا ایک فن ہے لیکن بھرم کی حد اگر خالی نمایش تک پہنچ جائے تو بھرم کھل جانے پر بعض دفعہ ایسی مضحکہ خیز صورت پیدا ہوتی ہے کہ انسان ندامت سے اپنا سر نہیں آٹھا سکتا ۔ گویا بھرم رکھنے کے لئے بھی کچھ قیود ہیں جن کی پابندی کرنا ضروری ہے اور بے جا نمایش کے لئے بھرم رکھنا ضروری قرار نہیں دیا گیا ۔ لیکن مشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ عزت نفس یا خودداری کے اظہار کے علاوہ اور کئی وجوہ سے اور صرف نمایش کے لئے بھرم رکھنے کا رواج بھی ہوگیا ہے ۔ مولوی نے ایک حکایت لکھ کر اس بدعت سے باز رہنے کی تلقین کی ہے ۔ قصہ یہ ہے ایک بھوکے آدمی کو کہیں سے دنبے کی کھال مل گئی ۔ اور اس نے اسے اپنی فاقہ مستی کو چھپانے کے لئے نہیں بلکہ اپنی منعمی کی نمایش کرنے کے لئے استعمال کرنا شروع کردیا ۔ اس کی آنتیں قل ھو اللہ پڑھ رہی ہوتیں لیکن وہ دنبے کی کھال پر ایک ھاتھ رگڑ کر چربی موبچھوں کو لگا لیتا اور انہیں تاؤ دیتا ھوا لوگوں سے کہتا : آج میں نے اس قسم کا مرغن کھانا کھایا ہے اور آج میں ان نعائم سے مستفیض ھوا ھوں ۔

پوست دنبہ یافت سخصی مستھان ھر صباحی چرب کردی سبلتان
درمیان منعمان رفتی کہ من لوب چربی خوردہ ام در انجمن
دست بر سبلت نہادی در نوید رمز یعنی سوی سبلت بنگرید
کیں گواہ صدق گفتار مست وین نسان چرب سیرین خوردنست
اشکمش گفتی جواب بی طنین کہ ابادالله کَیدَ الکا فرین

اس حالت میں اس کا پیٹ اس پر لعنت بھیجتا ھوا کہتا کہ کمبخت اس طرح خالی خولی بھرم رکھنے کی بجائے تونے کسی سے حقیقت حال کہی ہوتی تو ساید کوئی کریم النفس رحم کھا کر تمہیں کچھ کھلا دیتا اور اگر تو اس قدر لاف زنی نہ کرتا تو کوئی چارہ گر تمہارے درد کا درمان ڈھونڈھ نکالتا :

لاف تو مارا بر آتش بر نہاد کان سبیل چرب تو بر کندہ باد
گر نبودی لاف زشتت ای گدا یک کریمی رحم افگندی بما

ور نمودی عیب و کژ کم باختی یک طبیبی داروی ما ساختی
اور پھر معدہ نے دعا مانگی :

کانچ پنہان میکند پیداش کن سوخت مارا ای خدا رسواش کن
کای خدا رسواکن این لاف لئام تا بجنبد سوی ما رحم کرام

معدے کی دعا قبول ہوئی اور ایک بلی دنبےکی کھال اٹھا کر لیگئی ۔ لاف زن کا لڑکا بلی کے پیچھے بھاگتا رہا لیکن بلی ھاتھ نہ آئی ۔ بالاخر لڑکا ڈرتا ڈرتا اس محفل میں پہنچا جہاں اس کا باپ بیٹھا ہوا تھا اور وہاں اسنے جا کر برملا کہہ دیا : جس دنبے کی کھال سے آپ ہر صبح ہونٹوں اور مونچھوں کو تر کیا کرتے تھے وہ ایک بلی اٹھا کر لے گئی ھے ۔ ہم اس کے پیچھے بہت دوڑے لیکن یہ کوشش بیکار گئی ۔

از پس گربه دویدند او گریخت کودک از ترس عتابش رنگ ریخت
آمد اندر انجمن آن طفل خرد آب روی مرد لافی را ببرد
گفت آن دنبه که هر صبحی بدان چرب میکردی لبان و سبلتان
گربه آمد ناگهانش در ربود بس دویدیم و نکرد آن جهد سود

پاس بیٹھے ہوئے آدمی یہ بات سن کر ہنسنے لگے ۔ اور بالاخر فاقہ کش آدمی کو اپنا راز ظاہر کرنا پڑا ۔ لیکن بیجا نمایش کو ترک کرنے سے اسے یہ فائدہ ہوا کہ اهل کرم نے اسی وقت دستگیری کی اور اسے پیٹ بھر کر کھانا کھلایا :

خنده آمد حاضرانرا از شگفت رحمها شان باز جنبیدن گرفت
دعوتش کردند و سیرش داشتند تخم رحمت در زمینش کاشتند
او چو ذوق راستی دید از کرام بی تکبر راستی را شد غلام
(۳ : ۷۳۸—۷۷۱)

درمان روحی کے ماہرین کی کارگزینی کا سنگ بنیاد تجزیۂ نفس ھے اور اس علاج تک رسائی حاصل کرنے کے لئے انہوں نے گذشتہ صدی میں بے پناہ نظریات قائم کرنے کے بعد لاتعداد تجربات کی زحمت اٹھائی ھے ۔ تب کہیں جا کر یہ عقدہ کھلا ھے کہ انسان چند ایسے امراض

کا شکار بھی ھونا ھے جن کا تعلق جسم کی بجائے روح سے زیادہ ھے - اور اس قسم کی رنجوری بسا اوقات صرف واھمہ کی تخلیق ھوتی ھے - مولوی نے سات سو سال قبل ھی اس بیماری کی نبض پر ھاتھ رکھ کر اعلان کیا :

عقل جزوی آفتش وهم است و ظن　　زانکه در ظلمات شد اورا وطن
بر زمین گر نیم گز راهی بود　　آدمی بی وهم ایمن میرود
بر سر دیوار عالی گر روی　　گر دو گز عرضش بود کژ میشوی
بلک می افتی ز لرز دل بوهم　　ترس وهمی را نکو بنگر بفهم

اور وھم سے اپنے آپ کو بچانے اور عمل سے کام لینے کی تلقین ایک دلکش حکایت سے کی ھے جس میں مکتب کے چند بچے چھٹی منانے کے لئے اپنے استاد کو مختلف وھموں میں مبتلا کرکے اسے بالاخر بیمار بنا کر بستر پر لٹا دیتے ھیں - ھوا یوں کہ بچے اس استاد سے بہت تنگ تھے - اور سوچتے تھے کہ اگر کبھی یہ بیمار ھوجائے تو اس سے نجات مل سکتی ھے - کچھ دیر تک مشورے ھوتے رھے اور بالآخر زیرک ترین لڑکے کو ایک ترکیب سوجھ گئی - اس نے کہا : دوستو کل جب مکتب کھلے تو میں استاد سے کہونگا : آپ زرد کیوں ھیں ؟ خیر تو ھے آپ کا رنگ ٹھیک نہیں ! یہ موسم یا بخار کا اثر معلوم ھوتا ھے ! پھر دوسرا لڑکا آئے تو وہ بھی یہی سوال دھرائے - پھر تیسرا اور اسی طرح ساری کلاس کے تیس لڑکے -

کودکان مکتبی از اوستاد　　رنج دیدند و ملال از اجتهاد
مشورت کردند در تعویق کار　　تا معلم درفتد در اضطرار
چون نمی آید ورا رنجوریی　　که بگیرد چند روز از دوریی
تا رهیم از حبس و تنگی و زکار　　هست او چون سنگ خارا بر قرار
آن یکی زیرکترین تدبیر کرد　　که بگوید اوستا چونی تو زرد
خیر باشد رنگ تو بر جای نیست　　این اثر یا از هوا یا از تبیست
اندکی اندر خیال افتد ازین　　تو برادر هم مدد کن این چنین
چون در آئی از در مکتب بگو　　خیر باشد اوستاد احوال تو

آن خیالش اندکی افزون شود   کز خیالی عاقلی مجنون شود
آن سوم و آن چارم و پنجم چنین   در پی ما غم نمایند و حنین
تا چوسی کودک تواتر این خبر   متفق گویند یابد مستقر

تمام لڑکوں نے یہ تجویز بہت پسند کی اور پھر اس لڑکے نے سب سے قسم کھانے کو کہا تاکہ کوئی غمازی نہ کر سکے۔

دن چڑھا تو سب لڑکے مکتب کے سامنے جمع ہوگئے اور لگے انتظار کرنے اپنے امام کا۔ یہ لڑکا آیا تو اس نے سوچے سمجھے ہوئے منصوبے کے مطابق آتے ہی آستاد کو سلام کر کے کہا: آپ زرد فام کیوں ہو رہے ہیں؟ آستاد نے جواب دیا: مجھے کوئی تکلف نہیں۔ بیہودہ باتیں نہ کرو جاؤ اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ جاؤ۔ آستاد نے نفی تو کر دی لیکن گوشۂ دل میں وہم نے اپنی جگہ بنالی۔ اتنے میں دوسرا لڑکا آیا اور اس نے بھی وہی سوال دھرایا۔ پھر تیسرے نے اور علی ھذالقیاس ساری کلاس نے۔ بس پھر کیا تھا آستاد سیدھے گھر کو سدھارے۔

روز گشت و آمدند آن کودکان   بر همین فکرت بمکتب شادمان
جمله استادند بیرون منتظر   تا در آید اول آن یار مصر
او در آمد گفت استا را سلام   خیر باشد رنگ رویت زرد فام
گفت استا نیست رنجی مر مرا   تو برو بنشین مگویاوه هلا
نفی کرد اما غبار وهم بد   اندکی اندر دلش ناگاه زد
اندر آمد دیگری گفت این چنین   اندکی آن وهم افزون شد بدین
هم چنین تا وهم او قوت گرفت   ماند اندر حال خود بس درشگفت

حضرت آستاد گھر پہنچ کر خانم سے لڑنے لگے کہ میرا یہ حال ہو رہا ہے اور تمہیں کچھ خبر ہی نہیں۔ تم تو بغض و نفاق سے اندھی ہو رہی ہو۔ تمہاری بلا سے میں جیتا ہوں یا مرتا ہوں۔ بیوی نے کہا: حضور ہوش کی دوا لیں۔ آپ کو کوئی تکلیف نہیں اور اگر یقین نہیں آتا تو آئینے میں اپنا منہ دیکھ لیں۔ لیکن آستاد صاحب بھلا ماننے والے کب تھے وہ بستر پر لیٹ کر کراہنے لگے۔

گشت استا سست از وهم و زبیم | بر جهید و می کشانید او گلیم
خشمگین بازن که مهر اوست سست | من بدین حالم نپرسد و نجست
خود مرا آگه نکرد از رنگ من | قصد دارد تا رهد از ننگ من
او بحسن و جلوهٔ خود مست گشت | بی خبر کز بام افتادم چو طشت
آمد و در را بتندی وا گشاد | کودکان اندر پی آن اوستاد
گفت زن خیرست چون زود آمدی | که مبادا ذات نیکت را بدی
گفت کوری رنگ و حال من ببین | از غمم بیگانگان اندر حنین
تو درون خانه از بغض و نفاق | می نبینی حال من در احتراق
گفت زن ای خواجه عیبی نیست | وهم و ظن لاش بی معنیست
گفتش ای غر تو هنوزی در لجاج | می نبینی این تغیر وارتجاج
گر تو کوری کر شدی ما را چه جرم | مادرش رحیم و در اندوه و گرم
گفت ای خواجه نارم آینه | تا بدانی که ندارم من گنه
گفت رو نه تو رهی نه آینه | دائما در بغض و کینی و عنت
جامهٔ خواب مرا زو گستران | تا بخسپم که سر من شد گران
زن توقف کرد مردش بانگ زد | کای عدو زوتر ترا این می سزد
جامه خواب آورد وگسترد آن عجوز | گفت امکان نی و باطن پرز سوز
گر بگویم متهم دارد مرا | ور نگویم چه سود این ماجرا
جامه خواب افگند و استاد اوفتاد | آه آه و ناله از وی می بزاد

رومی کا مشاہدہ ملاحظہ فرمائیے۔ بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ آستاد شاگردوں کو بھی مکتب سے ساتھ لوا لایا تھا۔ خود بستر میں لیٹ گیا اور ان سے کہا تم سبق پڑھو۔ شاگرد بڑے پریشان ہوئے کہ یہ اچھی مصیبت پڑی۔ ہم مکتب سے بھاگتے تھے۔ یہاں مکان میں قید ہونا پڑا۔

کودکان آنجا نشستند و نهان | درس میخواندند با صد اندهان
کین همه کردیم و ما زندانیم | بد بنای بود و ما بد بانیم

اب کیا کیا جائے۔ پھر زیرک لڑکے کو ایک اور تدبیر سوجھی۔ اس نے ساتھیوں سے کہا: دوستو زور زور سے سبق پڑھو۔ اور خود اونچی

4. History of the Burning Glass, Journal of the Panjab Historical Society, Vol. IX.
5. Study of Sanskrit Literature in Schools. Proceedings of the Panjab Educational Conference, 1926.
6. A newly discovered Prose Romance, Proceedings of the Fifth All India Oriental Conference, Lahore, 1928.
7. Uvat and Mahīdhara. Grierson Commemoration Volume.
8. Queen Poetess of Vijayanagara, Festschrift M. Winterniz, Leipzig.
9. India's Contribution to the World Civilisation : Swami Dayanand Commemoration Volume.
10. The Problem of Textual Criticism of the Nirukta. A Volume of Eastern and Indian Studies in honour of Dr. F. W. Thomas.
11. Is Yaska an Infallible Guide in the Interpretation of the Ṛigveda? Woolner Commemoration Volume.
12. The Rigveda and Mohenjodaro, Indian Culture, Vol. IV.
13. Date of Skandaswāmin, Ganga Nath Jha Commemoration Volume.
14. A Few Parallelisms in Thought in Sanskrit and English Poetry, K. B. Pathak Commemoration Volume, Poona.

his published works and articles contributed to various research Journals is given below :—

(*a*) SANSKRIT

1. An Introduction to the Nirukta. Oxford.
2. The Nighaṇtu and Nirukta (English Translation), Oxford.
3. The Nighantu and the Nirukta (Critical Text), Lahore.
4. Indices and Appendices to the Nirukta, Lahore
5. Fragments of the Commentaries of Skanda and Maheshvara, Lahore.
6. Commentary of Skandasvamin and Maheshvara, 3 Vols, Lahore.
7. Ṛgveda with the commentary of Vankatā Mādhava, Vols, I, II and III, Lahore.
8. The Vision of Vāsavadattā (Critical edition of Bhāsās, Svapnavāsavadatta with English Translation and Notes)
9. A critical edition of Nīlakantha's Kalyānasaugandhika.
10. Editio Princeps of Tirumalāmba's Ambikāparinaya-campu.
11. Thirteen Trivandrum Plays (Translated into English in collaboration with Dr. A. C. Woolner, Lahore.

(*b*) HINDI.

12. Life and Work of Moliere.
13. Vahmi Rogi.
14. Nala Damayanti.
15. Candragupta.

(*c*) URDU

16. Life and Work of Moliere.
17. Nala Damyanti.

(*d*) ARTICLES

1. Notes on the Nirukta—Indian Antiquary, May, 1921.
2. Some Aspects of Slavery, Journal of the Panjab Historical Society, Vol. VIII.
3. Romantic Movement in French Literature: Modern Review, March, 1923.

by very learned introduction, English Translation and critical notes.

2. The Kalyāṇasaugandhika of Nīlakantha, a southern playwright.

3. Ambikāparinayacampu of Tirumalambā, a Vijay Nagar Queen.

In collaboration with Dr. A. C. Woolner, he translated the Thirteen Trivandrum Plays into English. These were published by the Panjab University, Lahore.

Dr. Lakshman Sarup was also greatly interested in enriching Hindi Literature both by original contributions and translations. He wrote two original Plays (1) Nala Damayanti and (2) Chandragupta.

In the latter Play the vitality and superiority of Indian Culture has been clearly brought out.

The Punjab Government awarded a prize on his Hindi translation of Le Malade Imaginaire. He also published in Urdu a book on the life and work of Mollier and an Urdu version of the play Nala Damayanti. An indication of his keenness for the development of Hindi Literature is afforded by his testament. He has bequeathed a sum of Rs. fifteen thousand to the Benares University for the publication of original works and translations in Hindi.

While Dr. Sarup has contributed so much to Sanskrit learning by his own research his contribution is equally great in stimulating research in his Province. It was at his suggestion that the Punjab University introduced thesis as a part of the M.A. Examination in Sanskrit from 1932. As a result of this more than a hundred theses were written by the students of the M.A. Sanskirt class of the Panjab University. Dr. Sarup took a keen interest in guiding the students and supervising their research work.

Dr. Lakshman Sarup played an important part in the academic life outside the Punjab. He was the life member of the Bhandarkar Oriental Research Institute, Poona. He organised the fifth Session of the All India Oriental Conference at Lahore in 1938. He was a member of the Council of the All India Oriental Conference and its Executive Committee as its Treasurer for a number of years. A list of

The next important work undertaken by him was a critical edition of a new commentary on the Ṛgveda by Veṅkṭa Mādhava who is earlier than Sāyana who quotes the former. The discovery of Veṅkaṭa Mādhava's commentary is a landmark in the history of Vedic exegetics as he refers to several predecessors in the field, and thus supplies the links in the history of Vedic interpretation between Yāska and Sāyana. Veṅkaṭa Mādhava gives a very scientific interpretation of the most obscure passages of the Rgveda, and 'reveals the truth that has been hidden for centuries'. His commentary has the additional merit of being non-sectarian. In this edition of the Ṛgveda, Dr. Lakshman Sarup has given the Saṃhitā and Padapātha texts, along with the commentary A special feature of the work are the critical and comparative notes. Wherever V. Mādhava differs from the Brāhmanas, Yāska, Skandasvamin or Sāyana in giving the explanation of Vedic words or passages, the editor has quoted the meanings given by all the other interpretors. Thus the different explanations of Ṛgvedic words, available from all ancient Indian sources, have been collected at one place for ready reference, and greatly facilitate the work of Vedic interpretation. This great work was to be completed in eight volumes Six volumes covering about 5,000 pages were to contain the text and the commentary. Volume VII was to be devoted to the general introduction and Volume VIII was to contain the complete English Translation of the Ṛgveda, in the light of all available information. The project was hailed with great admiration all over the world. Dr. Louis Renou, Dr. J. Bloch, Dr. F E Edgerton, Dr. Stenkonow, Dr. Johnstu, Dr. A. B. Keith, appreciated greatly the importance of the work. The American Oriental Society passed a Resolution recommending financial help for the undertaking. Manuscript copy of the first six volumes had been completed, the first three volumes published and the fourth was in press when the learned editor suddenly expired. The enterprising publishers were keen to publish the remaining two volumes but unfortunately the manuscript was destroyed during the unfortunate happenings that followed the Partition of India. It is a pity that this great work has been left unfinished.

Dr. Lakshman Sarup also brought out critical editions of the following classical texts :

1. Svapnavāsavadattam of Bhāsa. It was accompanied

Oriental Conference, and the same afternoon at about 3 P. M. he died of heart-failure. The fatal attack came so suddenly that he expired before any medical aid could be rendered.

His Work

Dr. Lakshman Sarup's contribution to learning is two-fold: (*a*) his own publications in Sanskrit and Hindi, and (*b*) the impetus which these studies received under his inspiration and guidance.

Of his own research work, the *opus magnum* is formed by the following volumes on the Nirukta of Yaska.—

1. Introduction to the Nirukta. In this introductory volume the learned author has discussed the question of the authorship of the Nighantu and the Nirukta, the date of Yāska, and his contribution to the Sciences of Etymology, Philology and Semantics.

2. The Nighantu and the Nirukta critically edited for the first time. He took great pains in editing the text. Not only did he collect a very large number of manuscripts but spent enormous labour in punctuating the text which in many cases is a very intricate problem.

3. English Translation of the Nirukta. Besides giving a complete translation of the Nirukta, he gave copious notes, exegetical and critical, and extensively dealt with the comparative merit of the Indian and Greek contribution to Linguistics. He also added useful appendices, such as references to all the Vedic Stanzas quoted by Yāska.

4. Indices and Appendices to the Nirukta. These contain a word index of Yaska's text.

5-7. Critical edition of the commentary of Skanda and Maheshvara on the Nirukta 3 Vols. These contain a newly discovered commentary on the Nirukta. In the exhaustive introduction he discussed such problems as the date of Durgacharya, and the date of the authors of the commentary, and their relative position vis-a-vis other commentaries of the Nirukta.

Out of these No. 1 was published by the Oxford University, and the remaining volumes were published in the Panjab University Oriental Publications Series.

was a Fellow, a member of the Academic Council, ex-officio Member of the Oriental Faculty, Member of the Boards of Studies in Sanskrit, French and Teaching, Member of the Panjab University Library Committee, Convener of the Committee of Control in Sanskrit, Secretary of the Oriental College Council and Administrator, Panjab University Oriental Publications Fund. Besides holding these offices in the University, he actively participated in various bodies formed for the advancement of learning and culture. He was a Rotarian, the founder-President of the Panjab University Sanskrit Society and the Sahityagosthi of Lahore. He was a life-member of the Bhandarkar Oriental Research Institute, Poona, and a member of the Executive Council of the All-India Oriental Conference and its Treasurer.

He was an excellent teacher, very conscientious of his duties and punctual to a second. He would never come to the class late nor would he stop teaching even a minute before the time. I, remember, once the Vice-Chancellor wanted to speak to him on the telephone. He curtly declined saying that he could not leave his class before the period was over. He was very kind to the students, and once he was convinced of their sincerity and genuine devotion to studies, he helped them in all possible ways. Many poor students were recipients of monetary help from him, both at the Panjab University and in England. He was quite unostentatious in his ways and would never try to show himself off He was endowed with great humility worthy of a true scholar and treated his subordinates with great courtesy and affection.

He had a very good health, and never suffered from any protracted illness In his younger days he was fond of playing tennis and boating—a hobby which he had developed at Oxford. He used to go out for long walks daily. That was perhaps the secret of his good health and enabled him to put in hard-work—ten hours per day on an average. But his domestic life was not very happy because he had lost a number of children—some in the prime of their youth. After the age of 45 he became diabetic and suffered from weakness of heart but he still pursued his programme of literary work with unabated zeal. The end came quite unexpected. On the morning of 26th October 1946, he had returned from Nagpur, after attending the All India

In 1920, Dr. Lakshman Sarup joined the University of the Panjab, as Professor of Sanskrit Literature and the work on the Nirukta commenced at Oxford was continued here. Besides preparing a very useful reference work—the Indices and Appendices to the Nirukta—Dr. Lakshman Sarup engaged himself in preparing a critical edition of the voluminous commentary of Skandasvami and Mahesvara. This work took a long time. The last volume of this commentary was published in 1938.

During all these years he was keenly interested in the study of French Literature also and took an active part in organising a French Study Circle known as the Minerva Club. He also translated into Hindi two plays by the great French dramatist Molier—*Le Malade Imaginaire* (Imaginary invalid) and Le Bourgelis Gentithomme. In recognition of these services, the French Government conferred on him the title of Officier d' Academic Françaıse, and he was probably the first Indian to receive this distinction.

In 1942, Dr. Lakshman Sarup became the Principal of the University Oriental College, Lahore. He was the first Indian Sanskritist to occupy that position of distinction. His appointment was hailed with great enthusiasm by the Sanskrit scholars of the Punjab, and a special programme of felicitations was arranged in his honour by his old students and friends. On 28th November, 1943, the hosts numbering over 75 gave a Tea Party which was attended by the intelligentsia of the Province including Dr. Sir Bakshi Tek Chand, Sir Manohar Lal, Sir Gokal Chand Narang, Bhai Parmanand, R. B. Durga Dass and others Sir Gokal Chand Narang in his presidential remarks said that by appointing Dr. Lakshman Sarup as Principal of the Oriental College, the Panjab University had honoured itself. On 30th November, 1943, the Sanskrit Play, Svapnavasavadattam of Bhasa was staged by the Sanskrit students of various Colleges. Dr Sir Bakshi Tek Chand, who presided over this function, advised the Sanskritists to make the staging of Sanskrit plays a permanent feature, as a means of popularising Sanskrit. From that year onward, Dr. Lakshman Sarup arranged the staging of a Sanskrit play in Lahore, every year, till his death in 1946.

Dr. Lakshman Sarup was associated with the various academic and administrative bodies of the University. He

Dr. LAKSHMAN SARUP

M A, D. Phil (Oxon), Officer de Academie Francaise, University Professor of Sanskrit, Panjab University, Lahore (1920-1946) and Principal, Oriental College, Lahore (1942-1946)

by

PROF JAGAN NATH AGGARWAL

DR. Lakshman Sarup was born at Kairana, in Muzaffarnagar District of the Uttar Pradesh, on 15th January, 1894. Shortly after his birth, his father Lala Bindraban shifted to Ferozepore, in Punjab, and Dr. Lakshman Sarup received his early education here. After passing the Entrance Examination (the Matriculation Examination was known by this name at that time) of the Panjab University, he joined the D.A.V. College, Lahore, from where he graduated in 1913. He then joined the Oriental College, Lahore and passed the M A. Examination in Sanskrit, from that institution, in 1915. He was taken on the Staff of the D. A. V. College, Lahore, as Professor of Sanskrit. He had worked in the D A.V. College for a few months, when the Government of India awarded him a State Scholarship for study abroad, and he sailed for England.

He joined the Balliol College, in the University of Oxford. There he worked under the guidance of Prof. A. A. Macdnell, for four years from 1916-1920. The subject selected by him for his thesis was the study of Yaska's Nirukta—the oldest Indian treatise on Etymology, Philology and Semantics. Dr. Lakshman Sarup prepared, for the first time, a critical edition of the text of the Nirukta and its English Translation together with a learned introduction and exegetical notes in which he made a comparative study of the contributions of the ancient Indians and the Greeks to the Science of Linguistics. His work was very much appreciated and he was awarded the Degree of Doctor of Philology. During his stay at Oxford, he was also attached to the British Ministry of Information. After the close of the World War I, he went to France and was associated with Professor Sylvain Levi in the work of reorganising the University of Strassburg. He spent some time at the University of Paris, and visited important centres of education in Germany and Holland.

general body of students to raise the standard of English beyond reasonable limits bv learning to read, write, speak, think and perhaps even to eat and drink in English, they should change their outlook. We should realise the importance of Urdu as our national language and expand our activities in the field of Oriental Learning with special attention to Urdu, opening up some more centres of the Oriental College type in all the important towns, devoted exclusively to the teaching and development of Urdu.

Maulvi Inam Ali was emphatically of opinion that no pains should be spared in the perfection of our language by enriching it with the treasures of knowledge gleaned from foreign languages. The study of English should be made subservient to the attainment of this great ideal. Otherwise, he said it vehemently, if we allowed English to continue to dominate our each sphere of life and activity we would be reduced to the servile position of eternal beggars of foreign thought constantly knocking at its portals, with no inducement to help in the progress and evolution of our own language and literature.

This anti-national and slavish mentality of learning and doing everything in English should not be allowed to perpetuate after we had thrown aside the foreign yoke. Let us stick to the oaths we had taken at the time Pakistan was brought into being. Let us show full respect to the words of our Qaid-i-Azam, who said that Urdu was the only *lingua franca* and the national language of Pakistan. Let us expand, enrich, refine and develop Urdu, and feel rightly proud of it.

Maulvi Inam Ali did not merely preach. He lived up to his ideals. He considered it derogatory to his honour and dignity if, after he was gone, people could say that his knowledge of English and study of the abstract sciences in foreign languages had not proved beneficial to his countrymen and had vanished with him. He addressed himself to the giant task that he advocated, and succeeded wonderfully in translating into Urdu standard English Books on abstruse and abstract subjects for the use of those interested in the study of Sciences requiring acute reasoning. He is no more with us, but the work he has done will not perish. It will ever remain in its place as the foundation-stone of the entire superstructure that may be raised over it in future by other literary enthusiasts of his tastes. Peace be upon his soul!

Lahore : 28-10-1955

fame on their favourite subjects, or of having made any important discovery or invention or valuable contributions to the knowledge of the world, or even of having translated into Urdu an appreciable number of foreign books of outstanding importance on technical subjects, for the benefit of the nation The reason is quite obvious The prime of a student's life is spent in the compulsory study of English with no impetus for research and translation. He is left with no time and energy to produce any original work of substantial worth. He dies and carries away with him the knowledge he gained so late in his life, his son starting again with a clean slate, and repeating the same tragedy

I have given you the correct version of M. Inam Ali's views on Education, and on the importance of Urdu as our national language I would now finish by telling you what he thought of the Oriental College. He considered it to be a unique Institution of real worth to our nation It was doing practical work of real importance. It had created a large number of writers, authors, doctors of literature and research scholars who had rendered golden services to the nation by research, translation and the production of original books without much of Government, Public or University patronage. They had enriched Urdu literature, and helped in its steady perfection by fishing out pearls of wisdom from other sources, planting them in our language, and thus placing them within easy reach of the common man who does not and need not know English at all.

It would make men like M. Inam Ali Sir-Sayyid, Hali, Azad and Sir Abdul Qadir turn in their graves with wrath to learn that instead of intensifying our campaign for the development of Urdu, we had been not only indifferent to it but were actually at one moment thinking of doing away with this centre of Learning whose Foundation Day we are celebrating today. There are signs visible, thank God, of our Constitution coming to the aid of Urdu by adopting it as the National Language of our country and thus ensuring for it an eternally bright future. If it is done, it would put a strong curb on the over-enthusiastic activities of those Anglicised self-conceited gentlemen who have come to worship English as their mother tongue. If a foreigner were to ask in amazement today, whether Pakistan had any national language of her own, one would shudder to think what answer these gentlemen would give, consistent with our national self-respect. Instead of exhorting under compulsion the

Urdu alike, are prepared to devote their lives under Government patronage to the noble task of translating foreign books on Arts and Sciences into Urdu language so as to perfect it by replenishing its coffers with a wealth of knowledge derived from the intellectual granaries of Western civilisation. This would unlock the doors of wisdom to our people, by placing it in a condition capable of being communicated to them in a language they understand.

Let all the Government offices, he said, from the highest to the lowest, be thrown open to men of letters well versed in Urdu. This would afford a further incentive, as no other factor would, to the complete development of our own national language. Time would come when, standing shoulder to shoulder with the Turks, Egyptians, Persians, English and French and Russians, in the comity of nations, we could say with pride that we were masters of our own destiny and culture, and transacted our every private and state business in our own national language, as they all did in their respective languages." He was forcefully of opinion that we could improve only by learning through the medium of Urdu, and by constantly aiming at its perfection, leaving it to the coming generation to pick up the thread where we left. Reading in a foreign language involved a huge waste of time and mental energy. The major part of the lives of our students was exhausted in picking up and mastering the English language. "It left little time for personal meditation, experimentation, and discovery. It made you a parrot with no capacity to improve. You could not go a single step beyond what you had learnt."

He argued if one generation started learning English as the medium of learning other Sciences, but did not leave behind, in its own language, the fruits of its labour for the benefit of posterity, the knowledge gained by it would die with it and the next generation would have to start afresh from the beginning. He knew very well that the Indian Universities, in spite of their great love of the English language, as if it was a divine language, and in spite of their enthusiastic but blind patronage of Science, Medicine, Economics, Botany, Engineering and what not, had failed to produce a good number of Scientists, Botanists, Physicians, Surgeons, Mathematicians, Philosophers, Economists, Jurists, or even scholars of English literature, who could boast of having written appreciable number of books of international

sors. He grew red hot with anger when he added that the then Government had gradually come to adopt a hostile attitude. He railed at its cold-blooded callousness towards the Oriental languages and rebuked it for its deliberate lack of sympathy and patronage. An honest Government, he said, that had the real welfare and well-being of its people at heart, would gladly come forward as in duty bound, with all the resources at its command, to help them in developing their own culture and national language rather than hasten their ruin by remaining criminally indifferent and unhelpful. I once asked him as to how he could deprecate English so much, and in the same breath demand that valuable English books must be translated into our vernacular, which presupposed a previous deep study and knowledge of English. He was roused into passion but then soon controlled himself and poured out a simply wonderful and convincing discourse on the subject which you will find simply exhilarating, inspiring and bewitching. I will give you his own words as far as I remember them. He said:—

"Urdu is and has come to stay as the National Language of India. Every Indian, whatever his religion, admits it to be our only *lingua franca*. It bears the impress of our national character, and in its turn acts and reacts on it. I want the entire Government machinery to be steeped in this language. The official language should be Urdu. Every proceeding in every Executive, Judicial and Administrative Department of the Government should be recorded in Urdu. Every order issued by the Government should be promulgated in Urdu. All laws should be enacted in the Urdu language. Every subject in every School and College should be taught in Urdu. Every book written in Urdu and every speech delivered in Urdu. The language of the mosque, the school, the society, the stage, the Court and the State should be nothing but Urdu and Urdu alone Urdu should in a word completely replace English. The importance now attached to English should henceforward be attached exclusively to Urdu, if we are to build ourselves as a nation, and have an individual national character.

English should be taught only as a side language, an optional subject, to be studied only by those who are to serve abroad as diplomats, and those selected few who, by virtue of their special aptitude for both English and

He told me that Abbassid Rulers, in their search for knowledge, had engaged eminent scholars on handsome salaries for learning Greek and Latin and translating the treasures of wisdom hidden in them into Arabic for the education of their own people, and for their advancement in all the useful branches of ancient Arts and Sciences. The Arabs later on carried these torches of learning to the whole of Europe from Arabia to Spain. Europe would not have been what it is today if Arabs had not spread this knowledge far and wide over its fertile fields.

The Europeans who were still called half barbarians during the 14th century including the English, never bade farewell to their national languages in their quest of knowledge. They picked up pearls of wisdom not only direct from the Arabic literature but reached the very sources from which the Arabs had derived them, and then by translating them into their own dialects preserved them for ever, for future use and further improvement.

The views of Maulvi Inam Ali about education and the Urdu language were always very pleasant, interesting, instructive and scholarly. He was convinced that a nation that had no language was a nation that had no culture, no character, no individuality, and no respect in the eyes of the world. It was not the love of the English language at the complete sacrifice of Urdu that would make us great. That, he said, would reduce us to the state of permanent mental servitude and intellectual destitution. What could really build our character, polish our lives, and enhance our prestige, was the adoption of a national dress, the achievement of material prosperity on national level, and above all the development of our national language by incessant search for knowledge abroad, and by constant efforts to transplant and preserve it in our Urdu language. A nation that is truly great goes on assimilating into its own culture, knowledge, from every conceiveable foreign source, through the only process of translation ; improving, enriching and perfecting its language by coining new words for new concepts.

My father thought that it was the Oriental College alone that had kept the torch of Oriental learning alive in the Punjab, and thus saved our culture from slow but sure extinction in the early stages of the British Rule, under the noble and inspiring guidance of men like Dr. Leitner, Mr. J. Simes, Woolner and the whole chain of their succes-

named علم النفس والقویٰ and مخزن الحکمت . These were published in 1886 and 1885, and by virtue of their intrinsic value they were prescribed by the Panjab University as texts for the B.O.L. Classes, being the first books of considerable importance ever written on psychology and philosophy in the Urdu language. The subject being abstract and abstruse, he chose to write it in simple, easy and intelligible Urdu style, as he believed that a difficult complicated subject written in an equally difficult philosophical rhetoric, would have resulted in the production of a literary riddle beyond the comprehension of ordinary human intellect. The books received a rousing reception from the Oriental teachers and students of philosophy. Without feeling elated by the warm welcome given to his books, he intensified his research. Inspired by a sense of burning literary patriotism, he took up his pen again, and eagerly embarked upon the gigantic task of translating more books on Hydrostatics, Optics, Logic and Political Science with marvellous aptitude.

Maulvi Inam Ali was a saint but not a recluse. He was religious-minded but not a fanatic. He believed in spiritualism tempered with sound materialistic views. He worshipped God not as a monk but as a worldly man with unbreakable worldly connections. He did not believe in the exclusively moral, spiritual and intellectual progress of his nation, but also in its material prosperity. He allowed his countrymen by all means to strive for a glorious life Hereafter. He wanted them at the same time to attain an honourable position among the advanced nations of the world, by developing all those Sciences and Arts that had made the West invincible, strong, and great.

It was his firm conviction that this could be achieved only by placing the knowledge of all the Arts, Sciences, discoveries and inventions of the West within easy reach of our people through the channels of our language. He found that the chief distinguishing feature of a people was its culture as reflected in its language. An educational system that aimed at perfection and yet ignored the irresistible and irrefutable claims of the language of the people whom it wanted to educate was an anomaly and a disgraceful self-contradiction. The great men of learning and the pages of history stood witnesses to this self-evident-truth. To destroy a nation, destroy its language and culture, and you achieve your foul end.

justice in this world. It is my firm conviction that his character was moulded in this College, and the success that attended him in his after-life was the direct result of habits formed here by his contacts with the contemporary alumni of this institution.

I now revert to the real subject and shall try to be very brief and sustain your interest in the topic.

Maulvi Inam Ali had the germs of a brilliant scholarly genius that rose into full vigour and prominence in a surprisingly short time. Dr. Leitner, the Principal of the Oriental and the Government Colleges, soon noticed his talents. He got him in as Professor of Mathematics and Philosophy at the Oriental College, Assistant Professor at the Government College and McLeod Arabic Reader of the Panjab University for Research work in Arabic and Philosophy.

He carried on his research with untiring zeal and unsatiated ambition. He soon found himself alone, like a man in the wilderness treading on trackless ground. There was not one single book existing in Urdu literature to help him in his search for suitable vernacular equivalents for the technical English terms. He dived deep into the forsaken depths of Arabic literature and succeeded in fishing out some invaluable gems of philosophical nomenclature pertaining to the abstract sciences. There were still left many new concepts that baffled his resolve to find out their Urdu equivalents. Gifted by nature with common-sense, intellect and linguistic art, he found no trouble in coining his own word where none was available. In making his selections and inventing new terms he always took care to see that his terminology did not offend against the spirit of the Urdu language, nor destroyed its purity and integrity, otherwise it would have frustrated the very object for which he felt inspired and exhorted to write. These terms devised by thought and coined with care have since become part and parcel of the Urdu literature by lapse of time and usage. Any one interested can refer to the long list of technical terms given in the Glossary at the end of his book علم النفس والقویٰ which for lack of space and time cannot be given in this paper. Equipped with this armoury of philosophical terms and phrases he set out to write in Urdu an epitome of Hamilton's Lectures on Philosophy which he

period of his personal literary pursuits was brief but bright and fruitful. Fate had destined him to be a judicial officer, and he was appointed E.A.C., after passing the Competitive Examination. On account of his marvellous instinct for the work and a pious sense of justice, he was soon nominated to the coveted statutory Civil Service almost equal in rank to the I.C.S. Rising in very quick succession from one post to the next, within 12 years he became Divisional and Sessions Judge, which post he held for 18 years, and retired in 1918 as the seniormost in his rank. In 1902 he was granted the title of Khan Bahadur in recognition of his honesty, hard work, spotless career and priceless services rendered to the public and to the cause of education. He was granted special enhanced pension of Rs. 1,500 a year over and above the usual amount, by the special order of the Secretary of State in reward for his meritorious services of exceptionally good quality as a Judge. His official career was an unbroken record of excellent work of great public utility and was full of interesting events. I am aware, you will consider it to be an unwarranted diversion from the real subject to compel you to make an incursion into every nook and corner of that field, howsoever pleasant the sojourn may prove. I must nonetheless crave your indulgence in permitting me to narrate only one peculiar event in his life as a Judge, as it is both significant and amusing.

Once in a murder case, after hearing arguments, he sought inspiration from God to arrive at the truth. He misunderstood the inner voice and sentenced the accused to death. The accused became helpless and in open court said to my father, "You have announced your judgement and given me the extreme punishment. You cannot revoke it now. But remember on the Day of Judgment I will catch you by the neck for taking my innocent life away, as I have committed no murder". My father trembled when he listened to this subdued fit of anger. Thrice he went through the file again and discovered that he had erred in his judgement, and that the man was really innocent. He could not reverse his order as it had been announced. Do you know what he did? He himself appealed to the High Court against his own judgement requesting it to quash his findings and acquit the accused. The High Court simply wondered at his strength of character, conscientiousness and straightforwardness, and saved the accused from the gallows. It is hard to find a similar example of truth and

edition, written by Mr. Abdul Latif, 75 years ago, among the members of the leading families of the Punjab as a budding youth of great promise. In the Golden Book صحیفۂ زرین published by Prag Narain in 1902 in one of the biggest publishing houses of India, the Nawal Kishore Press, is given an authentic genealogy of M. Inam Ali, among those who rose to eminence in Literature, Art, Education, and Public Service. The Imperial Publishing Company also produced a Book "THE IMPERIAL CORONATION DURBAR" in two volumes in 1913, and published his life-sketch on pages 328 and 329 with his photo.

Maulvi Inam Ali belonged to the respectable tribe of Qanungo Shaikhs (the law-givers) of Lahore, descendants of Rana Balab Rao who embraced Islam during the Moghul Rule. His great-grandson Nisar Ali was the Bakhshi Tan of the Sikh Army during the Sikh Rule, who married into the family of Shaikh Bader Bakhsh, the Court-companion of Ranjit Singh, and a descendant of Nawab Ikhlas Khan, the Ruler of Ujjain. He had a son Sh. Niaz Ali who had a son Sh. Wilayat Ali. The latter all his life remained with Nawab Abdul Majid Khan as his most trustworthy, noble, amiable and constant companion. Maulvi Inam Ali was his son.

He was born in 1863. Passing his Matriculation, F.A. Maulvi and F.E.L. Examinations with distinction, he took his B.A. in 1884, being the first Muslim Graduate of the Panjab University from Lahore District, winning a Gold Medal for proficiency in English and Arabic. He was granted Mcleod Arabic Research Scholarship, was appointed Professor of Mathematics and Philosophy at the Oriental College, Asstt Professor Government College, and also made Life Fellow of the Panjab University.

He was one of the Founders of the Anjuman-i-Himayat-i-Islam, member of the Anjuman Islamia, and Anjuman-i-Nomania ; life member of the Punjab Public Library and Red Cross Ambulance Association. He founded several charitable funds, contributing liberally and generously to them from his own purse, and gave numerous scholarships, medals, stipends and prizes in aid of education. Although he continued throughout his life to encourage and help the cause of Muslim education both by money and persuasion, the

K.B. MAULVI INAM ALI, B.A., S.C.S.

(as Educationist and Oriental Scholar, with a brief Genealogical and Biographical Sketch)

BY

S. M IHSAN ALI, B A., LL B., ADVOCATE

I have accepted the invitation to read a paper on K. B. Maulvi Inam Ali with profound reverence, eagerness and pleasure. I have been prompted to respond to this call both by a sense of duty, and a feeling of pride. The natural advantage I possess of being exclusively in a position to give you first-hand knowledge of his life fills me with pride. It is also my duty to pay homage to this old seat of learning by telling you something about that august personality that belonged to the galaxy of the morning stars of this glorious institution He looked upon it as his *alma mater*, and through him I feel myself attached to her as if by inherited ties of filial devotion. It holds a prominent position among all the educational institutions of the Panjab University by virtue of the vast and varied fields of its diverse activities, and the colossal amount of excellent work it has done and still continues to do, with unparalleled zeal, accelerated speed, and selfless devotion under the able guidance of its present learned Principal and his enthusiastic and brilliant staff.

It is well-nigh impossible to compress the whole biography of Maulvi Inam Ali, the saint-philosopher, philanthropist, educationist, scholar, linguist and a Judge of great repute, into a paper cf twenty minutes. It would require more than a volume to make a comprehensive study of the whole private, public, academic and official life of this genius. I will, therefore, deal with the genealogical aspect and biographical facts in an unusually brief manner giving only the headlines, and then jump on to that one phase of his life which was intimately connected with this College as educationist and scholar. The real object of this paper is to achieve this end with complete fidelity to truth.

Maulvi Inam Ali attracted attention in his teens. His name is mentioned in the famous "History of Lahore", 1882

اوریئنٹل کالج میگزین

مئی ۱۹۵۶ء

جلد ۳۲ عدد ۳

عدد مسلسل ۱۲۵

مدیر :—

ڈاکٹر سیّد عبداللہ

باہتمام مسٹر احسان الحق ہیڈ کلرک اوریئنٹل کالج لاہور ، پرنٹر و پبلشر اوریئنٹل کالج میگزین ، رہبر پرنٹنگ پریس بل روڈ لاہور میں طبع ہو کر اوریئنٹل کالج لاہور سے شائع ہوا ۔

ترتیب

یونیورسٹی

اوریئنٹل کالج
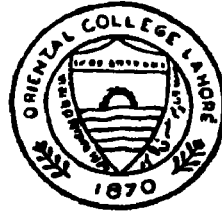
سالانہ روداد

۵۶ — ۱۹۵۵ء

مرتبہ : ڈاکٹر سیّد عبداللہ
(پرنسپل)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اورینٹل کالج لاہور

کے سالانہ جلسہ ۱۹۵۵-۱۹۵۶ء کی روداد

صدر محترم !

میں آپ کی تشریف آوری کا بر خلوص شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آپنے گوناگوں علمی و منصبی مصروفیات کے باوجود اس جلسے کی صدارت کے لئے وقت نکالا اس سے ہماری بڑی قدر افزائی ہوئی ہے جس کے لئے آپ کا جتنا بھی شکریہ ادا کیا جائے کم ہے ، اس کے بعد خواتین و حضرات ! میں آپ کا بھی مشکور ہوں کہ آپ نے اپنی تشریف آوری سے ہمیں احسان مند کیا ، اس کرم نمائی کے لئے میں اور میرے رفقا آپ کے بے حد ممنون ہیں۔

حضرات! اب میں کالج کی سالانہ رپورٹ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں جس کی تفصیل ضمیموں کی صورت میں ص ۱۰ تا ۴۶ پر موجود ہے اس کو آپ خود ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ میں اس وقت روداد کے صرف چند خاص پہلوؤں کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

کالجوں کے سالانہ جلسوں کے متعلق عام رسم تو یہ ہے کہ کارکردگی کی روداد سناتے وقت کسی کالج کے کارہائے نمایاں کا سب سے پہلے ذکر کیا جاتا ہے۔ جس میں کارہائے شائستہ کو خاص طور سے ابھارا جاتا ہے مگر میں اس عام رسم کے برعکس ''جو ہم سے ہوسکا'' کی بجائے ''جو ہم سے نہ ہو سکا'' کی تفصیل پہلے پیش کرتا ہوں۔ اس بے رسمی کا باعث یہ ہے کہ میں بڑی دیانت داری سے یہ محسوس کرتا ہوں کہ اس عظیم و قدیم درسگاہ میں (جس کی روایات روشن ہیں اور جس کا مستقبل بڑا شاندار ہوسکتا ہے اور جس سے ملک و ملت کی بہت سی علمی و تہذیبی توقعات وابستہ ہیں) گذشتہ ایک سال میں ترقی کی جو منزلیں طے ہوسکتی تھیں وہ طے نہیں ہوئیں۔ اور جو جو اہم تعمیری کام کئے جا سکتے تھے وہ نہیں ہوسکے ـــــ اس کا مطلب یہ نہیں کہ کالج کے تدریسی کام میں کوئی تساہل ہوا یا یہاں کے

لکھنے پڑھنے والوں کی تصنیفی سرگرمیاں سُست پڑگئیں——یہ نہیں—
کالج میں تدریسی کام برابر ہوتا رہا - اور بہت اچھا ہوتا رہا—جس کا سال
زیر بحث کے ساتھ سے آپ کو اندازہ ہو سکے گا ، اسی طرح کالج میں تصنیفی و
تحقیقی کام بھی جاری رہا جو کہ منسلکہ رپورٹ کے (ص ۱۹ تا ۳۴) سے آپ
معلوم کرسکیں گے- اس کے علاوہ معمول کی دوسری سرگرمیاں بھی جاری رہیں
جن میں یونین اور دوسری سوسائٹیوں کے ہمراہ کالج میگزین کا کام بھی شامل
ہے جو قابل اطمینان ہے — مگر اس اطمینان کے باوجود میں اس پر اطمینان
کا اظہار اس لئے نہیں کرتا کہ اورینٹل کالج کے متعلق میرا تصور یہ ہے کہ
ایک درسگاہ اور تدریسی ادارہ ہونے کے ساتھ ساتھ اس کو پاکستان کے
نئے تقاضوں کے پس نظر ایک علمی اکادمی اور ایک وسیع الجنبیات ثقافتی
مرکز بھی ہونا چاہئے——مگر افسوس یہ ہے کہ میں اس سال اس کے ان
بلند تر مقاصد کے سلسلے میں کوئی خاص خدمت انجام نہ دے سکا نہ کالج کے
ان توسیعی تصورات کے سلسلے میں سال زیر بحث میں کوئی قدم اٹھانا ممکن
ہوا - افسوس یہ ہے کہ سال زیر بحث میں کالج کا دائرۂ عمل پہلے سے بھی
محدود ہوگیا——، قیام پاکستان کے فوراً بعد کالج کی توسیع کے سلسلے
میں ایک اہم قدم یہ اٹھایا گیا تھا کہ اس کو مشرق و مغرب کی اہم
زبانوں کا کالج بنانے کے لئے کچھ تدابیر اختیار کی گئیں تھیں——چنانچہ
عربی فارسی اردو کے ''بی اے بعد'' نصابوں کے علاوہ فرنچ ، جرمن ،
ہسپانوی ، روسی ، جدید ایرانی ، جدید عربی——اور بعد میں ترکی زبان کی
تعلیم بھی ہونے لگی تھی——مگر سال زیر بحث میں حالات کی تبدیلی کے سبب
(غالباً کالج کے دائرۂ عمل کی تحدید کی غرض سے) پہلے فرنچ زبان کا شعبہ کالج
سے الگ کر دیا گیا بعد میں روسی اور ہسپانوی زبانوں کی تدریس بند کر
دی گئی اور بالآخر جدید زبانوں کا سارا سلسلۂ تدریس کالج سے منقطع کر دیا
گیا - ان اقدامات سے کیا مصلحتیں مدّنظر تھیں——میں ان پر ماسوا اس کے
کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتا کہ یہ وہ ''رموز مملکت'' ہیں جن کے متعلق
خواجہ حافظ نے مدت ہوئی یہ فرما کر خاموشی اختیار کر لی تھی کہ

؎ رموز مملکت خویش خسرواں دانند
گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

بہر صورت یہ نئے اقدامات جن مصلحتوں سے بھی ہوں قابل غور ضرور ہیں اس لئے کہ قیام پاکستان کے بعد قومی اداروں میں توقع توسیع کی تھی نہ کہ تحدید کی ــــ پھر یہ بھی ہے کہ اورینٹل کالج کے متعلق پنجاب یونیورسٹی کمشن نے واضح الفاظ میں یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ اس کے دائرۂ عمل کو وسیع تر بنایا جائے۔ اور علوم مشرق کا مرکز ہونے کے علاوہ اس کو جدید و قدیم زبانوں کا بھی کالج بنایا جائے۔ یونیورسٹی کمشن کی روداد کا وہ حصہ قابل توجہ ہے :-

اس کے پیش نظر ہر شخص کو یہ سوچنا ہی پڑے گا کہ کمشن کی ان صریح سفارسات کے باوجود اورینٹل کالج کی ان مفید شاخوں کی قطع و برید کیوں ضروری سمجھی گئی ــــ؟ اس سال کالج کا شعبہ عربی بھی اس لحاظ سے ناقص ہی رہا کہ عربی کے یونیورسٹی پروفیسر اور لیکچراروں کی بعض اسامیاں پھر پر نہ ہوسکیں ــــ اگرچہ یہ اطلاع باعث مسرت ہے کہ اب عربی کے یونیورسٹی پروفیسر اور جدید عربی کے ایک سینیئر لکچرار کی اسامیوں کے اشتہار دے دئے گئے ہیں اور توقع ہے کہ یہ اسامیاں ۲ سال تک بلاوجہ خالی رہنے کے بعد اب ۰۶ـــ۱۹۵۷ کے تعلیمی سال کے لئے ضرور پر ہو جائیں گی۔ اور یونیورسٹی میں عربی کا شعبہ پھر سے باقاعدہ صورت اختیار کر سکے گا۔

اورینٹل پبلیکیشنز کا اہتمام اشاعت بھی اس کالج کی اہم سرگرمیوں کا ایک نمایاں حصہ ہے۔ مگر سال زیر بحث میں اس سلسلے میں بھی کوئی کام نہ ہو سکا کیونکہ فروری کے آخر تک متعلقہ کمیٹی کی تشکیل اور اس قواعد و ضوابط کی منظوری نہ ہوسکی۔ جس کے سبب نہ تو نئی کتابوں کی اشاعت کا کوئی منصوبہ تیار ہوسکا اور نہ پرانی ختم شدہ کتابوں کی تجدید ہوسکی۔۔،

اس سال کالج کا دائرہ اس وجہ سے بھی محدود تر ہوگیا کہ علوم مشرق کے پرائیویٹ اداروں کو اورینٹل کالج سے الحاق کی وجہ سے جو گرانٹ ملا کرتی تھی وہ بند کر دی گئی ــــ یہ اقدام اس بنا پر کیا گیا کہ عالم فاضل امتحانات یونیورسٹی کی بجائے سیکنڈری بورڈ کے متعلق

ہوگئے ہیں۔ مگر سیکنڈری ایجوکیشن ایکٹ کی متعلقہ دفعہ میں صرف امتحانات کا ذکر ہے۔ تدریس کے نظام کا کوئی ذکر نہیں جس کی وجہ سے فاضل کلاسوں کی تدریس ابھی تک اورینٹل کالج میں ہی ہو رہی ہے۔ لہذا میں سمجھتا ہوں کہ جب تک اورینٹل کالج فاضل کلاسوں کی تدریس کا مرکز ہے، اس وقت تک علوم مشرق کے متعلقہ ادارے یونیورسٹی کی امداد کے ہر طرح حق دار ہیں اور گرانٹ کے بند ہو جانے سے ان اداروں کی حوصلہ شکنی اور حق تلفی ہوئی ہے۔

اس سال اورینٹل کالج کی تنظیم اس وجہ سے بھی غیر تسلی بخش رہی کہ یونیورسٹی ایکٹ کی رو سے تنظیم جدید سے متعلق جو ریگولیشنز اور سٹیٹیوٹ متوقع تھے ان کی ابھی تک تشکیل نہیں ہو سکی اور ان کی عدم تشکیل کی صورت میں کسی منصرم کے لئے یہ ممکن نہیں ہو سکتا کہ وہ گومگو اور تذبذب کے عالم میں محض اپنی ذمہ داری پر ایسے اقدامات کرے جن کے متعلق اسے شبہ ہو کہ ان کو حکام بالا کی تائید حاصل بھی ہو سکے گی یا نہیں ——،

غرض یہ ہے روداد اس کام کی جو " ہم سے نہ ہوسکا" —— اور اگرچہ اس عدم کارکردگی کے لئے میں ملک و قوم کے سامنے شرمسار ہوں مگر میرا عذر تو یہ ہے کہ اس کی ذمہ داری کالج پر نہیں بلکہ ان عجیب و غریب حالات پر ہے جن سے یہ کالج آجکل دوچار ہے —— با این ہمہ یہ امر کسی قدر اطمینان بخش ہے کہ جہاں تک معمول کی سرگرمیوں کا تعلق ہے۔ کالج کے اساتذہ نے ہر سال کی طرح بلکہ بعض شعبوں میں ہر سال سے زیادہ، اس سال کارکردگی دکھائی۔ کالج کے نتائج علی العموم اچھے رہے۔ چنانچہ رپورٹ صفحہ ۳۸ سے آپ پر واضح ہو جائے گا کہ ایم اے فارسی میں ۱۱ میں سے ۸ طلبا، ایم اے عربی میں ۷ میں سے ۵ طلبا، ایم اے اردو میں ۸ میں سے ۸ طلبا کامیاب ہوئے —— اور فاضل کلاسوں کا نتیجہ بھی اس لحاظ سے غیر تسلی بخش نہیں سمجھا جا سکتا کہ پچھلے سال عالم فاضل کلاسوں کے متعلق نومبر دسمبر تک گومگو کا عالم رہا پھر عالم کلاسیں تو بند کر دی گئیں البتہ صرف فاضل کلاسوں کو نومبر میں داخلے کی اجازت دی گئی —— اس لئے ان کا تعلیمی نصاب غیر مکمل ہی رہا۔

اس سال ایم اے اردو میں سیدہ ناصرہ خاتون ۳۴۲ نمبر لے کر اول درجے میں اول رہیں۔ ایم اے فارسی مسٹر حامد خان ۴۰۵ نمبر لیکر اول درجے میں دوم رہے اور ایم اے اسلامیات میں محمد اسلم ملک ۴۹۵ نمبر لیکر اول درجے میں اول رہے۔

صدر یونین ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی رہنمائی میں کالج یونین کی سرگرمیاں بھی بدستور جاری رہیں، سپورٹس کے انچارج بھی ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ہی تھے ان کی زیر نگرانی طلبا نے کھیلوں میں خاص دلچسپی لی۔

اس سال اورینٹل کالج میں جو تحقیقی اور تصنیفی کام ہوا اس کی تفصیلی رپورٹ ص ۱۹ تا ۳۴ پر ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ میں اس موقع پر بڑی مسرت سے یہ اعتراف کرتا ہوں کہ اس کالج کے لکھنے والوں نے اپنی تحریرات میں اپنے سابقہ معیار کو برابر قائم رکھا بلکہ بعض پہلوؤں سے کالج کے مصنفین اور ادبا نے بلند تر معیاروں تک پہنچنے کی کوشش کی ــــ ڈاکٹر محمد باقر کے علاوہ پروفیسر وقار عظیم، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اور ڈاکٹر عبادت بریلوی اور دوسرے احباب نے جو تصنیفی کام سال زیر بحث میں کیا اس پر میں کامل اطمینان کا اظہار کرتا ہوں۔

تحقیقی کام کے سلسلے میں طلبا کے تحقیقی مقالات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ــــ جن کی مفصل رپورٹ کے ص ۲۶ تا ۲۹ پر ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ یہ امر بھی میرے لئے باعث اطمینان ہے کہ اس کالج میں پی ایچ ڈی مقالات کی نگرانی کا کام بڑے خلوص و انہماک سے ہوتا رہا۔ سال زیر بحث میں پی ایچ ڈی کے متعدد امیدوار اور طلبا اساتذہ شعبۂ اردو سے مدد لیتے رہے۔ ایم اے اردو میں تحقیقی مقالات لکھنے والے چار ایم اے فارسی میں دو تھے۔ ان مقالات کی نگرانی میں اور تحقیقی کاموں کی تربیت کے سلسلے میں شعبوں کے اساتذہ کو جتنا وقت دینا پڑا اس کا مجھے پورا پورا علم ہے گذشتہ پانچ برسوں میں اس کالج میں ایم اے عربی، فارسی، اردو میں ۸۱ مقالات مرتب ہوئے۔ اور ایک سال کے عرصے میں کسی درسگاہ میں ۸۵ مقالات و تصانیف کا مرتب ہونا کم از کم میرے نزدیک ایک اہم بات ہے اسی لئے میں آپ صاحبوں کے سامنے اس کارکردگی کو کسی

قدر بلند آواز میں یہیں دہرا رہا ہوں مگر مجھے معلوم ہوا ہے
کہ آئندہ کے لئے ایم اے میں مقالات پر کچھ پابندیاں لگا دی گئی
ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ آئندہ ایم اے میں صرف وہ لوگ مقالات
لکھا کریں گے جو بی - اے میں درجہ اول میں کامیاب ہوئے ہوں -
بظاہر یہ پابندی بے ضرر بلکہ مستحسن معلوم ہوتی ہے مگر تجزیہ کرنے
سے مسئلے کے کچھ اور پہلو بھی سامنے آتے ہیں ، سب سے پہلے تو یہی بات
قابل غور ہے کہ بی اے میں مجموعی طور پر کسی شخص کا اول درجہ حاصل
کرنے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اس خاص مضمون میں بھی قابلیت
فائقہ رکھتا ہے جس میں اب وہ ایم - اے کر رہا ہے - ہو سکتا ہے کہ
ایک طالب العلم محض انگریزی یا محض اقتصادیات میں زیادہ نمبر حاصل
کر کے اول درجہ میں کامیاب ہو گیا ہو - بس ظاہر ہے کہ جب وہ
ایم اے اردو یا فارسی میں داخل ہوگا تو اسکا بی اے میں اول درجہ
اسے اردو میں مقالہ نگاری کا کسی طرح مستحق نہیں بناسکتا ـــــ صحیح معیار
تو شاید یہ ہوگا کہ بی اے کے اس خاص مضمون کے نمبر دیکھے جائیں جس
میں کوئی طالب العلم ایم اے لیتا ہے اور مقالہ لینا چاہتا ہے ـــــ اس
کے علاوہ یہ بھی مدّ نظر رہے کہ تصنیف و تالیف کی صلاحیت کو صرف
درجہ اول سے وابستہ کرنا بھی کوئی تسلی بخش طریق کار معلوم نہیں
ہوتا - بسا اوقات کسی وجہ سے تیسرے درجہ میں کامیاب ہونے کے
باوجود بعض طلبا اچھے ادیب یا انشا پرداز یا اچھے مصنف ثابت ہوتے
ہیں ـــ اس لئے مقالات کو لازماً اول درجے کے ساتھ وابستہ کرنے سے
عین ممکن ہے کہ صحیح تصنیفی صلاحیت رکھنے والے کئی طلبا تصنیفی
تربیت سے محروم رہ جائیں اور ایسے لوگ مقالات لکھنا شروع کر
دیں جن کو سرے سے تصنیفی ذوق ہی حاصل نہیں ـــــ میری ناچیز
رائے میں اس معاملے میں انتخاب کا فیصلہ استادوں کے ہاتھ میں ہی
رہنے دیا جاتا تو بہتر ہوتا ـــــ ابتک یہ ہوتا رہا ہے کہ مقالات کے
انتخاب میں ذوق و صلاحیت کو مد نظر رکھا جاتا تھا - اور اس سے بہت
اچھے علمی نتائج نکلتے رہے ہیں مگر نئے قواعد سے صورت حال کے بدل

جانے کا پورا اندیشہ ہے ، میں نے اس موقعہ پر اس مسئلے کو اس لئے اہمیت دی ہے کہ اس سے سب سے زیادہ نقصان عربی ، فارسی اور اردو والوں کو پہنچے گا ـــ اول تو مستقبل کے بارے میں مایوسی کی وجہ سے ان زبانوں کے ایم اے میں اول درجے کے طلبا بہت کم داخل ہوتے ہیں پھر جو داخل ہوتے ہیں ضروری نہیں کہ وہ سب مقالہ نگاری کا ذوق بھی رکھتے ہوں ـــ زبانوں کے امتحانوں میں تصنیفی قابلیت پیدا کرنا اس لئے بھی ضروری ہے کہ ان کے لئے معاش کے راستے نسبتاً تنگ ہیں تصنیفی تربیت ان کے لئے انشا ، صحافت اور تصنیف کے میدانوں میں (ملازمت کے بغیر بھی) بہت حد تک ممدو معاون ہو سکتی ہے ـ میں باقی شعبوں کے اساتذہ کے خیالات سے بے خبر ہوں مگر اپنے متعلق ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اس سے ہماری زبانوں کے طلبا کو شدید نقصان پہنچے گا اور بعض اوقات تو یہ گمان گذرتا ہے کہ اس میں بھی کہیں ہماری زبانوں کے متعلق وہی تعصب کام نہ کر رہا ہو جس کا اظہار آئے دن ہوتا رہتا ہے اگرچہ اس کو ثابت کرنے کے لئے میرے پاس کافی مواد موجود نہیں ـــ مگر یہ ضرور کہوں گا کہ جب یونیورسٹی میں سائنس اور آرٹس میں ہر جگہ مقالات کی اجازت ہے تو پھر آرٹس اور خصوصاً اردو ، عربی ، فارسی والوں پر کیوں یہ پابندی لگائی جاتی ہے ـــ یہ تو نامناسب عدم مساوات ہے ـــ اس سے ہماری تصنیفی کارکردگی اور تصنیفی تربیت جیسے اہم شعبوں کو سخت نقصان پہنچے گا جو ایک لحاظ سے قومی نقصان ہے ـ

کالج کی کارکردگی کا ایک روشن پہلو اس کا تحقیقی میگزین ہے ـ سال ۵۵ ـ ۵۶ میں میگزین کی تمام اشاعتوں کی تکمیل کرلی گئی ـــ اور اس کے خریداروں میں بھی اضافہ ہوا ، اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ نئے خریداروں میں ترکی ، جاپان ، ریاستہائے متحدہ امریکہ ، ایران اور ہندوستان کے بعض معروف و مقتدر علما و فضلا بھی شامل ہیں بظاہر ایک میگزین کے سلسلے میں ان تفصیلات کا ذکر بے محل سا معلوم ہوتا ہے مگر میں یہ جرأت اس لئے کر رہا ہوں کہ اس میگزین نے تحقیق کے معاملے میں جو قبول و اعتراف علوم مشرقیہ کے عالمی مرکزوں

میں حاصل کیا ہوا ہے وہ ہمارے لئے اور ہماری یونیورسٹی کے لئے خاصی نیک نامی کا باعث ہے اور میں مطمئن ہوں کہ ہم اس سال بھی اپنے اس امتیاز خاص کو قائم رکھنے میں کامیاب رہے۔

جناب والا! کالج کے متعلق اس مجمل عرض حال کے بعد اب مشرقی علوم والسنہ کے عام مسائل کے بارے میں کچھ اظہار خیال کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ اس سلسلے میں میں سب سے پہلے ثانوی تعلیم کے بورڈ کی اس رپورٹ پر جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے مختصر سا تبصرہ کرنا ہوں۔ اس رپورٹ کے متعلق میرے تأثرات یہ ہیں کہ جہاں تک مشرقی علوم والسنہ کا تعلق ہے۔ یہ بہت سی سابقہ سکیموں کے مقابلے میں ایک عمدہ دانہ اور ترقی پسندانہ سکیم ہے۔ اور یہ بات ہر لحاظ سے اطمینان بخش ہے کہ پاکستان میں پہلی مرتبہ مشرقی علوم والسنہ کو ایک مستقل گروپ قرار دے کر ان علوم کی اہمیت کا اعتراف کیا گیا ہے۔ اور نہ صرف اہمیت کا اعتراف کیا گیا ہے بلکہ ان کو دوسرے علوم اور مضامین کے ہم پلہ قرار دیا گیا ہے مگر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ عالم فاضل امتحانات پر بورڈ نے جن پابندیوں کی سفارش کی ہے وہ اس وقت تک قابل قبول نہیں ہونگی جب تک ان امتحانوں کو براہ راست ایف اے، بی اے کے برابر درجہ نہ دیا جائے گا۔

محولہ بالا سکیم یا تجاویز کا یہ پہلو بھی اطمینان بخش ہے کہ اس میں زبان اردو کو پہلے سے بہتر مقام دئے جانے کی تجویز ہوئی ہے —— ہائی سکول اور اعلیٰ ثانوی تعلیم کے درجوں میں انگریزی کے ساتھ ابتدائی اردو کو بھی لازمی مضامین کی صف میں رکھا گیا ہے اور یہ دراصل اعتراف ہے اس حقیقت کا کہ اردو کو انگریزی سے برتر نہ سہی اس کے برابر لازمی مضمون کی حیثیت ضرور ملنی چاہئے۔

ثانوی تعلیم کے بورڈ نے اردو اور علوم مشرقیہ کے درجے کو بلند کرنے کے لئے جو قدم اٹھایا ہے اس کی تکمیل اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک یونیورسٹی میں بھی اسی طرح کے اقدامات نہ کئے جائیں۔

میرا خیال ہے کہ بی - اے میں بھی مشرقی علوم والسنہ کے لئے سپشل گروپ بنانے سے تعلیمی اور معاشی دونوں طرح کے فوائد حاصل ہوں گے ـــــــاسی طرح اردو کو بی - اے میں بلند تر درجہ دینا اور دلوانا وقت کے تقاضوں کے عین مطابق ہے - اس سلسلے میں یہ ذکر کرنا بھی بے محل نہ ہوگا کہ یہ سپیشل گروپ ہمارے موجودہ عالم فاضل امتحانوں کے متوازی بھی چل سکتے ہیں اور ان کا بدل بھی بن سکتے ہیں - دونوں صورتوں میں یہ ذمہ داری یونیورسٹی کی ہی رہتی ہے کہ وہ ان خاص تجاویز کا کس طرح خیر مقدم کرتی ہےـــــ، یہ صحیح ہے کہ ثانوی تعلیم کے ایکٹ نے عالم فاضل امتحانوں کو یونیورسٹی کے دائرۂ اختیار سے خارج کردیا ہے مگر اس قانون میں مناسب تبدیلی کے لئے عرضداشت کا حق تو کسی نے نہیں چھینا - میں اس حق کی بنا پر حکومت اور یونیورسٹی کے با اقتدار حضرات کو غور و فکر کی دعوت دینے کی جرأت کرتا ہوں اور عرض کرتا ہوں کہ علوم مشرقیہ کے عالم فاضل امتحانوں کا صحیح مقام یونیورسٹی ہی ہےــــــخصوصاً آنرز یا فاضل کا درجہ تو کسی طرح ثانوی تعلیم کی سطح کی چیز نہیں ـــــمولوی فاضل کے موجودہ نصاب پر نظر ڈالنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا نصاب تعلیم کے اعلیٰ درجوں کے مطابق ہے اور اگر اس کو انٹرمیڈیٹ کے درجے پر لایا گیا ہے تو اس کا سبب ان علوم کی یتیمی کے سوا اور کچھ نہیں - اور ظاہر ہے کہ پاکستان میں ان کے بارے میں اس قسم کی یتیمی کے لئے کوئی وجہ جواز موجود نہیںــــــاس سلسلے میں یہ بھی یاد رہے کہ عالم فاضل امتحانات پشاور یونیورسٹی کے علاوہ علی گڑھ یونیورسٹی میں بھی رائج کر دئے گئے ہیںــــ جب دوسرے ملکوں میں ان امتحانات کو یونیورسٹی کے درجے کی چیز سمجھا جاتا ہے تو اس یونیورسٹی نے جس نے کبھی ان امتحانات کی بنیاد رکھی تھی اس میں ان کے درجے کی یہ تحقیر کس طرح برمحل اور مناسب سمجھی جا سکتی ہےــــــ، ان وجوہ سے میں حکومت سے بھی درخواست کرونگا کہ وہ عالم فاضل امتحانات

کو بدستور سابق یونیورسٹی کے دائرے میں آنے کا موقعہ دے ــــــ یہ تو ظاہر ہے کہ جب ہم ان امتحانات یا ان علوم کو یونیورسٹی کے درجے کی جز کہتے ہیں تو اس سے ہمارا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ان امتحانات میں جو کمزوریاں پیدا ہو گئی ہیں وہ رفع نہ ہوں ــــ ہم تو اصلاح و اضافہ کے ہمیشہ مؤید رہے ہیں اور اصلاح و اضافہ کرتے بھی رہے مگر اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ اصلاح و اضافہ کا سوال یا تو صحیح صورت حال سے بے خبری کے سبب اٹھایا جاتا ہے یا محض اعتراض کی خاطر ــــــ، اس سے ضد اور تعصب کا اظہار ہوتا ہے اور ضد و تعصب کا رد عمل بھی ضد اور تعصب کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے ــــ باوجود ان سب باتوں کے ہمارا مسلک یہی تھا اور یہی رہے گا کہ ان امتحانات کی خرابیوں کو دور کرنے اور ان کے نصاب میں مناسب تبدیلیوں کے لئے ہم ہر وقت آمادہ ہیں اور آمادہ رہیں گے، لیکن یہ دیکھ کر دکھ ہوتا ہے کہ ایک ایسے بنیادی ثقافتی مسئلے کے متعلق جس کی اہمیت بدیہی اور جس کی ضرورت واضح ہے ــــــ پاکستان جیسے اسلامی ملک میں ہمیں ہر سال اپنے جلسوں میں برابر ایک ایسا مطالبہ کرنا پڑ رہا ہے جو ہر پاکستانی کے اساسی عقائد کا جزو ہے اور جس کے تحفظ ہی کے لئے پاکستان کی مملکت وجود میں آئی ہے ــــــ، بہرحال ہمارا فرض یہی ہے کہ ہم اس مطالبے کو بار بار دہرائیں اور بار دہراتے جائیں تا آنکہ بند دروازے ہمارے استقلال کی بدولت آخر کھل کر ہی رہیں۔

علوم مشرق کی اشاعت و ترویج کے کچھ اور مراکز بھی ہیں اور وہ ہیں وہ غیر سرکاری ادارے جو محض اپنی ہمت و خلوص سے ناموافق ماحول کے باوجود عربی فارسی کی تحصیلات کو عوام کے لئے آسان بنا رہے ہیں ــــــ یہ سلسلے غیر سرکاری درسگاہوں اور مسجدوں اور مکتبوں سے وابستہ ہیں ــــــ ان مراکز کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں ملازمتوں کی امید کے بغیر کچھ لوگ اپنی زندگیاں ان تحصیلات میں صرف کر دیتے ہیں اور اس شمع کو روشن رکھے ہوئے ہیں جس کو زمانے کی باد تند بار بار تیز تیز جھونکوں سے بجھا دینا چاہتی ہے ــــــ یہ

بڑے باہمت لوگ ہیں جو سخت مخالف فضاؤں میں کام کررہے ہیں مگر پھر بھی بد دل نہیں ــــــ میری ناقص رائے میں ان مکاتب و مدارس کی بھی تنظیم نو کی ضرورت ہے اور یہ تنظیم نو اس وقت تک ممکن نہیں جب تک حکومت ان مدارس کے سر پر شفقت کا ہاتھ نہ رکھے ــــــ آپ حضرات کو معلوم ہوگا کہ بہاولپور میں ان مکاتب کی تنظیم جدید سے بہت اچھے نتائج برآمد ہوئے ہیں ــــــ گذشتہ چار پانچ سال سے بہاولپور کے مکاتب نہ صرف دینی تعلیم کے باوقار مرکز بن رہے ہیں بلکہ ان سے دیہات و قصبات میں عام تعلیم پھیلانے کا کام بھی لیا جا رہا ہے ــــــ ایسی حالات میں مناسب نہ ہوگا اگر ان پرائیویٹ مدارس کو کسی حکومتی اقدام کے ذریعے پھر سے منظم و مرتب کردیا جائے اور اس طرح ملک کے یہ ثقافتی سرچشمے بھی محفوظ رہ کر قومی زندگی کے لئے پاکیزگی و طہارت کا سامان مہیا کرتے رہیں ــــــ ۔

جناب والا ، میں اپنی گزارشات کو ختم کرنے سے پہلے اپنی قومی زبان اردو کے متعلق بھی کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں ۔ ملک کے دستور اساسی کی تشکیل کے بعد اب جبکہ صورت حال ٹھیک طور سے واضح ہو گئی ہے اس لئے اب اس میں کچھ شبہ نہیں رہا کہ پاکستان کی قومی زبان اردو ہے اور ہر چند کہ بنگالی قومی زبان ہونے میں اردو کی شریک اور انگریزی سرکاری زبان ہونے کے لحاظ سے اردو کی (عارضی) حریف ہے مگر اردو کی قومی حیثیت کا غیر مبہم انداز میں اعتراف کر لیا گیا ہے ــ اور یہ بھی تسلیم کر لیا گیا ہے کہ صوبوں میں حسب ضرورت بیس سال تک انگریزی کی قدر افزائی بھی جا سکتی ہے ۔ ان حالات میں ہم حکومت کے شکر گزار ہیں کہ اس نے اردو کو اس کا فطری حق عطا کر دیا ہے ــ مگر اردو کا یہ اعزاز اس وقت تک نظریاتی ہی رہے گا جب تک اس کو قومی زندگی اور سرکاری کاروبار میں موثر طریق سے دخیل نہ بنایا جائے گا ۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ انگریزی سے اردو کی طرف منتقلی کا عمل ابھی سے شروع کر دیا جائے ۔ اس سلسلے میں اولین کام جن سے ابتدا کی جا سکتی ہے دو ہیں ۔

اول دفتروں کی زبان کی تبدیلی درجہ بدرجہ دوم تعلیمات کی زبان کی تبدیلی درجہ بدرجہ۔ مگر اس تدریج کا انداز ایسا ہو جو خلوص کا ہم رکاب ہو نہ کہ رکاوٹ سے ہم قدم۔ دفتری زبان کا ایک اچھا اور تقریباً مکمل ذخیرہ مجلس زبان دفتری تیار کر چکی ہے جس کی کوششوں سے ہزارہا اصطلاحات کا ترجمہ ہو چکا ہے اور ہزارہا اصطلاحات چھپ کر فہرستوں کی صورتوں میں مرتب ہو چکی ہیں۔ صوبہ مغربی پاکستان میں ان سے کام لیا جاسکتا ہے۔ باقی دقتیں عمل و تعامل سے دور ہو جائیں گی۔ اور بظاہر کوئی معقول وجہ جواز دفتری زبان کی اردو میں منتقلی کے خلاف موجود نہیں۔ ملک کی رائے عامہ بھی اس کے حق میں ہے اور ملک کے سیاسی و سماجی نمائندے بھی اس کی تائید کر رہے ہیں۔ جہاں تک تعلیمات میں ذریعہ تعلیم کو بدلنے کا سوال ہے اس کا آغاز ثانوی تعلیم کے بورڈ کی اس سکیم کی شکل میں ہو گیا ہے۔ اور توقع ہے کہ ملک بھر میں اس صحیح اقدام کا خیر مقدم ہی کیا جائے گا۔ اس کے بعد یونیورسٹی میں اردو ذریعہ تعلیم کا مسئلہ غالباً خود بخود حل ہو جائے گا۔

صدر محترم! آخر میں میں عرض کرتا ہوں کہ سائنس کے متعلق آپ سے زیادہ کسی کو کچھ کہنے کا حق حاصل نہیں اس کے ذریعہ تعلیم کے متعلق تو آپ ہی ہماری صحیح رہنمائی کرسکیں گے مگر میں آرٹس کے مضامین کے متعلق اتنا عرض کرسکتا ہوں کہ تعلیمی لحاظ سے آرٹس کے مضامین کا بذریعہ انگریزی میں پڑھانا جملہ مصالح قومی کے خلاف ہے۔ اور جس قدر جلد اس معاملے میں تبدیلی اختیار کر لی جائے اسی قدر مناسب اور مستحسن ہو گا۔ میں جانتا ہوں کہ ہمارے ملک میں کچھ روشن خیال حضرات ایسے بھی ابھی کھڑے ہوں گے جو "دشت کے دکھ" سے ڈرا کر اور علم کی عالمی لہروں کا واسطہ دے کر پاکستانی قوم کو اردو سے محروم رکھنے کی اب بھی کوشش کریں گے مگر توقع کامل ہے کہ ہماری حکومت اپنے صحت مند شعور کی بنا پر اس قسم کے مشوروں کو اب قبول نہ کرے گی اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ پاکستانی قوم اس قسم کے خلاف قومیت افعال و نظریات کو اب کسی صورت گوارا نہ کرے گی۔

جناب صدر ! میری عاجزانہ درخواست ہے کہ آپ اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر حکومت مغربی پاکستان سے یہ فیصلہ کرائیں کہ ملک و قوم کے ہمہ گیر مفادات کے پیش نظر حکومت جلد ایک باوقار کمشن مقرر کرے جس کا کام ایسی تجاویز مرتب کرنا ہو جن کی مدد سے زبان کے مسئلے کے متعلق کوئی عملی قدم اٹھایا جا سکتا ہو اسی طرح یہ بھی حکومت سے درخواست کی جانی چاہئے کہ وہ ایک باوقار اردو اکیڈمی قائم کرے جس کے زیر ہدایت اردو کو علمی احاط سے انگریزی کی سطح پر لانے کے لئے علمی تصانیف تیار کی جائیں ۔ یہ دونوں چیزیں قومی احاط سے ہماری بنیادی ضروریات ہیں ، مجھے امید ہے کہ آپ اس معاملے میں بھی ہماری رہنمائی فرمائیں گے ۔ ان سب باتوں کی تکمیل میں ، میں اور میرے رفقا اورینٹل کالج کی طرف سے آپ کو اپنے کامل تعاون کا یقین دلاتے ہیں ۔

جناب والا ! میں آخر میں ایک بار پھر آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور آپ کی وساطت سے جملہ حاضرین و سامعین کی خدمت میں بھی اپنے جذبات شکریہ و امتنان پیش کرتا ہوں ۔

ضمیمے

صفحہ

ضمیمہ الف

کالج کے اساتذہ کی فہرست

نام	عہدہ
۱- سید عبداللہ ایم - اے - ڈی لٹ	پرنسپل و رئیس شعبہ اردو
۲- محمد باقر ایم - اے - پی ایچ - ڈی	پروفیسر و رئیس شعبہ فارسی
۳- سید وزیر الحسن عابدی ایم - اے -	ریڈران سپوکن ایرانین
۴- ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ایم - اے - پی ایچ - ڈی -	سینئر لیکچرار اردو
۵- عبادت بریلوی ایم - اے - پی ایچ ڈی -	سینئر لیکچرار اردو
۶- سید وقار عظم ایم - اے -	لیکچرار اردو
۷- عبدالشکور احسن ایم - اے - ایل ایل بی -	لیکچرار فارسی
۸- فیوض الرحمن مولوی فاضل منشی فاضل - فاضل دیوبند	لیکچرار فارسی
۹- سید میرک شاہ مولوی فاضل - منشی فاضل - فاضل دیوبند	اُستاد فارسی
۱۰- نور الحسن مولوی فاضل- فاضل دیوبند	اُستاد عربی
۱۱- عبدالصمد صارم منشی فاضل - فاضل دیوبند - فاضل ازھر	اُستاد فارسی و عربی
۱۲- سید محمد العربی فاضل ازھر	ٹیچر ان موڈرن عربک
۱۳- عبدالحفیظ ایم - اے - پی - ایچ - ڈی	لیکچرار ترکی
۱۴- بشارت علی ایم - اے - پی - ایچ - ڈی	لیکچرار جرمن

REPORT OF THE ARABIC DEPARTMENT
(1955-56)

Dr. Inayatullah carried on the normal work of the Arabic Department in an honorary capacity, teaching the post-graduate classes and supervising the work of the research students. In conducting the M A Arabic Class, he was assisted by Mr Abdul Qayyum, M A of the Government College, Lahore and Hafiz Noor-ul- Hasan, M. Abdus Samad Sarim, and Mohammad al-Arabi of the Oriental College.

During the year under report, the enrollment in the Arabic Department has been most encouraging. At the present time, there are two dozen students on the rolls of M.A Class, one-third of them being girls. Never in the history of this University has this class reached this record number before.

INAYATULLAH,
Hony. Head of the Arabic Department,
University of the Panjab.
28-2-56

REPORT OF THE PERSIAN DEPARTMENT
TEACHING STAFF

1. Dr. Muhammad Baqir, M A, Ph D. (London), Professor of Persian in the University of the Panjab and Head of Department
2. Syed Vazir ul-Hasan Abedi, M.A, University Reader in Spoken Iranian
3. Mr. Abdul Shakoor Ahsan, M.A., LL.B., University Lecturer in Persian.
4. Prof. Ilm-ud-Din Salik, M.A., M.O.L., Islamia College, Lahore.
5. Mr. Ashiq Muhammad Ghauri. M.A., Dyal Singh College, Lahore.

6. Mirza Maqbool Beg Badakhshani, M.A., Government College, Lahore.

7. Mr. Shamsuddin, M.A., Islamia College, Lahore.

8. Maulana Fayuz-ur-Rahman, Lecturer in Persian, University Oriental College, Lahore.

9. Syed Mirak Shah, 2nd Maulvi, Oriental College, Lahore.

10. Mr. Abdus Samad Sarim, Additional Maulvi, University Oriental College, Lahore.

11. Professor Dr. S.M., Abdullah, University Professor of Urdu.

Professor Dr. Muhammad Baqir, Head of the University Persian Department was awarded a special certificate of merit by the Ministry of Education of Imperial Iranian Government in appreciation of his services rendered to the promotion of research in Iranian language, literature and history, and popularisation of Iranian literature in Pakistan. H.E. Aghaye Dr. Reza Jafari, Minister of Education congratulated Dr. Baqir on his efforts and sent him the sincerest thanks of learned people of Iran.

Mr. Abdul Shakoor Ahsan, University Lecturer in Persian was invited by the Teheran University for a research scholarship. Mr. Ahsan, during his stay at the University of Teheran attended the special course recently started for foreign scholars and passed the following compulsary examinations :—

1. Modern Persian language (زبان پارسی امروز) This covers phonetics, modern idiom and colloquial Persian with reference to different dialects.

2. Persian culture and literature (فرهنگ و دیاب ایران)

This paper includes the pre and post Islamic literary and political history of Iran, different literary styles and prosody, etc.

Apart from these, Mr. Ahsan passed the following exami-nations of the doctorate course with credit.—

1. Old Persian Language (پارسی باستان)
2. Avesta Language (اوستا)
3. Pahlevi Language (پہلوی)
4. Ancient Persian cultures (فرهنگ ایران باستان)

By passing the abovementioned six examinations with credit Mr. Ahsan has covered the entire field of ancient and Modern Language of Iran. It may be mentioned that no Pakistani scholar had yet qualified in all the abovementioned ancient language examinations and by passing them. Mr. Ahsan has achieved a unique distinction.

STUDENT

The number of students on roll during the year was :

M.A. V Year	....	29
M.A. VI Year	...	26

RESULT

Class	....	VI
Total Number of Examinees		11
No of successful candidates		8

APPOINTMENTS

Said-ul-Hasan Khwaja has been appointed recently Lecturer in Persian at Murray College, Sialkot.

EXTRA CURRICULAR ACTIVITIES

Public Lectures :

The following public lectures were arranged during the session :—

(*a*) **H.E. Aghaye Reza Jafari, Minister, of Education Iran.**

Education in Iran (Senate Hall) January 29, 1955.

(*b*) **Aghaye Dr. Lotf Ali** Suratgar, **Professor Teheran University.**

Trends in Modern Persian Literature (Senate Room), January 29, 1955.

(*c*) **Aghaye Dr. Mehdi Beyani Director-General, National Library, Teheran.**

Calligraphy (Govt. College, Lahore) January 31, 1955.

(*d*) **Aghaye Dr. Hossein Khatibi, Professor, Teheran University.**

Literary appreciation of Iqbal's style (Govt. College, Lahore), January 31, 1955.

(*e*) **Aghaye Dr. Isa Sepahbodi, Professor Teheran University.**

(*i*) Law Education in Teheran (Senate Room) February, 1955.

(*ii*) Modern Iran (Islamia College, Lahore), February, 1955.

(*f*) **Dr. Muhammad Baqir.**

(i) Millennium of Ibn-e-Sina in Teheran (Pakistan Art Council, Lahore), November 24, 1954.

(ii) غالب کے عہد کا سیاسی ماحول (Islamia College, Lahore) February 15, 1955.

(*iii*) Litho and Type Scripts for Children's Books (Pakistan Publishers Association, Lahore), March 22, 1955.

(*iv*) قومی کردار اور چھوٹی چھوٹی باتیں (انجمن حمایت اسلام) March 25, 1955.

(v) اقبال اور معاشرہ (Corporation Hall, Lahore), April 21, 1955.

University Extension Lecture :

Dr. Muhammad Baqir delivered the University Extension Lecture on "The Press in Iran" at the S. E. College, Bhawalpur on the 10th January, 1955.

Literary and Critical Contributions :—

The following literary and critical articles were contributed to eminent journals of the country.

Dr. Muhammad Baqir.

1. سر عبدالقادر (نقوش فروری ۱۹۵۵)

2. لندنی اور پنجابی معاشرت میں فرق (کواپریشن فروری ۱۹۵۵)
3. میرے استاد (پرتاب رائے) سیارہ فروری ۱۹۵۵)
4. تقدیر امم (مقالات یوم اقبال)
5. ڈاکو (سیارہ اپریل ۱۹۵۵)
6. Iqbal : Greatest Islamic Social Planner (Civil & Military Gazette), April 21, 1955.
7. قومی کردار اور چھوٹی چھوٹی باتیں (Humayun, Qindeel & Himayet-e-Islam).

RESEARCH WORK

I. Publications.

(1) Aghaye S. M. Taghi Moghtaderi, Cultural Counsellor of Iran in Afghanistan :
فرہنگ صدری Oriental College Magazine, February, and August, 1954.

(2) Dr. Muhammad Baqir :
(i) احوال و آثار حویلی تبریزی Oriental College Magazine, May and August, 1954
(ii) Khulassatul Insha of Sujan Singh Dhir, The Pakistan Historical Society Journal, July, 1955.
(iii) Historian and Tourists on Ancient Lahore, The Pakistan Review, July, 1955.
(iv) The Press in Iran, Oriental College Magazine, November, 1953, February, 1954 and August, 1955.

(3) Mr. V. H. Abedi, Reader in Spoken Iranian.
ایرانی صوبیات Oriental College Magazine, May, August, 1954.

II. Research Scholar

Mr. Muhammad Zafar Khan. the University Research Scholar completed his thesis on the Persian Poets of Kashmir and resigned his post.

III. Research Students

(i) The following students worked under the supervision of Dr. Muhammad Baqir :

Sr. No.	*Name of the Students*	*Tital of thesis*
1.	Khwaja Abdul Hamid Irfani (Ph. D)	احوال و آثار ملک‌الشعرا بہار

2. Hamid Khan (M. A.) احوال و آثار عارف قزوینی
3. Mushtaq Ahmad Khan (M. A.) فارسی شاعری میں سیاسی افکار

(ii) The following other thesis were completed and submitted by M. A. students :

1. Miss Mahmuda Akhtar ترجمه قابوس نامه
   (Supervisor : Prof. Mirza Maqbool Beg Badakh. shani)
2. Mrs. Rahmania Ghaznavi احوال و آثار تبریزی
   (Supervisor : Prof. Ilm ud-Din Salik)

VISIT OF IRANIAN DELEGATION

A delegation led by H. E. Aghaye Reza Jafari, the Minister of Education, Iran and including the following visited the University in January, 1955 :

Aghaye Professor Dr. Lotf Ali Suratgar
Aghaye Dr. Mehdi Beyani
Aghaye Professor Dr. Hossin Khatibi
Aghaye Sadegh Sarmad
Aghaye Dr. Ahmad Roustaiyan
Aghaye A. M. Shapurian

H. E. Aghaye Reza Jafari and other member of the delegation addressed in Persian large gatherings of University students on various academic and literary subjects. A detail of these lectures appears under the "Public lectures".

SPOKEN IRANIAN CLASS

As an experimental measure an evening class for Spoken Iranian was started by the University for 3 months beginning w-e-f October 1, 1955. A detailed programme based on broad lines of the pattern followed by the Tehran University was drawn up and students passing the University examination will be awarded a certificate. The following teachers are engaged in teaching :

Professor Dr. Muhammad Baqir
Mr. V. H. Abedi.
Mr. A. S. Ahsan.

شعبہ اردو

سالانہ رپورٹ (سال ۵۵-۱۹۵۶ء)

I- عملہ : سال زیر تبصرہ میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صاحب ایم - اے پی ایچ - ڈی کا تقرر بحیثیت یونیورسٹی ریڈر، کراچی یونیورسٹی عمل میں آیا - سال ۵۶-۱۹۵۵ء میں مندرجہ ذیل اساتذہ حسب سابق شعبہ اردو کی تدریس میں مصروف رہے :-

۱ - ڈاکٹر سید عبداللہ ایم - اے - ڈی لٹ - پروفیسر و صدر شعبہ اردو - پنجاب یونیورسٹی - لاہور -

۲- ڈاکٹر ابواللیث صدیقی- ایم - اے - پی ایچ - ڈی -

۳- ڈاکٹر عبادت بریلوی - ایم - اے - پی - ایچ ڈی -

۴- پروفیسر سیّد وقار عظیم ایم - اے -

II- تدریس : ایم - اے اردو کی تدریس انٹر کالجیئیٹ اصول پر ہوتی ہی - مقامی کالجوں کے مندرجہ ذیل اساتذہ نے تدریس میں شرکت کی :-

۱ - پروفیسر علم الدین سالک - ایم-اے - اسلامیہ کالج - لاہور

۲- پروفیسر قیوم نظر - ایم - اے ، گورنمنٹ کالج - لاہور

۳- پروفیسر عاشق محمد غوری - ایم-اے- دیال سنگھ کالج-لاہور

اس کے علاوہ شعبہ اردو کے اساتذہ کے ساتھ ساتھ کالج کے مندرجہ ذیل اساتذہ نے بھی ادیب فاضل کی تدریس میں حصہ لیا :-

۱- مولانا فیوض الرحمن صاحب

۲- مولانا سید میرک شاہ صاحب

۳- مولانا عبدالصمد صارم صاحب

۴- مولانا نورالحسن صاحب

III- داخلہ : ایم - اے - اردو اور ادیب فاضل کی جماعتوں کے داخلے کے اعداد و شمار درج ذیل ہیں :-

	طلباء	طالبات	کل
۱- ایم - اے - اردو سال پنجم -	۲۵	۸	۳۳
۲- ایم - اے اردو سال ششم -	۸	۲	۱۰
۳- ادیب فاضل -	۲۰	۷	۲۷

IV- نتائج : ایم - اے اردو فائنل کے امتحان میں ۸ طلباء شریک ہوئے اور سب کے سب کامیاب ہوئے - اوریئنٹل کالج کی طالبہ مس سیدہ ناصرہ خاتون نے ۳۷۳ نمبر حاصل کئے اور یونیورسٹی میں اول رہیں - محمد اسلم نے ۳۳۴ نمبر حاصل کئے اور یونیورسٹی میں دوم پوزیشن حاصل کی - کامیاب طلباء میں سے تین اول درجے میں کامیاب ہوئے - دو دوم درجے میں - اور تین سوم درجے میں -

V- ایم - اے - اردو کے مقالات کی نگرانی : اساتذہ شعبہ اردو نے ایم - اے - (اردو) کے مندرجہ ذیل مقالات کی نگرانی کی :-

(الف) ڈاکٹر سید عبداللہ -

نام طالب علم	عنوان مقالہ
۱- سیدہ ناصرہ خاتون	"ابوالاثر حفیظ جالندھری"
۲- غلام حسین	"مولانا ظفر علی خان"

(ب) ڈاکٹر ابواللیث صدیقی -

۳- محمد اسلم کاظمی . . . . ترجمہ " ناول اورجمہور"
Novel and the People by Ralph Fox

(ج) سید وقار عظیم -

مس عابدہ کیانی . . . . "امیر مینائی اور انکی شاعری"

VI- تحقیقی کام کی نگرانی : ایم - اے - اردو کے مقالات کی نگرانی کے ساتھ ساتھ اساتذہ شعبہ اردو پی ایچ - ڈی کے مقالات کی نگرانی بھی کرتے رہے - مندرجہ ذیل حضرات، اساتذہ شعبہ اردو کی نگرانی میں پی ایچ - ڈی کے مقالات مرتب کرتے

رہے ۔ چند مکمل ہو کر یونیورسٹی میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری
کے لئے پیش بھی ہوچکے ہیں :-

(الف) ڈاکٹر سید عبداللہ ۔

۱۔ مہر عبدالحق ۔ ایم ۔ اے ۔ ، اے ۔ ڈی ۔ آئی اسکولز۔ ملتان
''ملتانی زبان اور اس کا اردو سے تعلق''

۲۔ ا ۔ د ۔ نسیم ۔ ایم ۔ اے ۔ لیکچرار گورنمنٹ کالج منٹگمری
''اردو شاعری کا مذہبی اور فلسفیانہ عنصر''

۳۔ مسز خاور درانی ۔ ایم ۔ اے ۔ گورنمنٹ کالج فارویمن۔لائلپور
''بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد''

۴۔ پروفیسر محمد موسی خان کلیم ۔ ایم ۔ اے ۔ گورنمنٹ کالج ۔
ڈیرہ غازی خان ۔
''غالب — ایک جائزہ''

۵۔ مس صفیہ عبدالحق ۔ ایم ۔ اے ۔
''غلام مصطفی خان شیفتہ اور ان کے معاصرین''

اس کے علاوہ اساتذہ شعبہ اردو مندرجہ ذیل طلباء کو (بورڈ
میں پیش ہونے سے قبل) پی ۔ ایچ ۔ ڈی ۔ کے مقالات کے سلسلے
میں ہدایات دیتے رہے :-

۱۔ مس آمنہ عنایت ۔ ایم ۔ اے ۔ لیکچرار ، اسلامیہ کالج
فارویمن ۔ لاہور
''سرشار''

۲۔ مس آمنہ مینائی ۔ ایم ۔ اے ۔
''اردو نثر کا لکھنوی دبستان''

۳۔ خواجہ محمد اختر بیگ ۔ ایم ۔ اے ۔
''آتش اور ان کا زمانہ''

۴۔ مس زبیدہ قریشی ۔ ایم ۔ اے ۔
''میر اور ان کا کلام''

۵۔ ارشاد احمد ارشد ۔ ایم ۔ اے ۔
''اردو میں شخصی ، مذہبی اور قومی مرثیہ نگاری ـــــ
تاریخ و تنقید''

۶۔ فدا محمد ۔ ایم ۔ اے ۔
''اردو میں مرثیہ کا ارتقاء''

۷۔ مرید حسین شیخ ۔ ایم ۔ اے ۔
''اردو نظم نگاری کی تاریخ اور ارتقاء''

۹۔ کاظم حسین ۔ ایم ۔ اے ۔
''نقدالمرثیہ بحوالہ مطالعہ خصوصی انیس''

(ب) ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صاحب کی زیر نگرانی مندرجہ ذیل اصحاب پی ایچ ۔ ڈی کے مقالات کے سلسلے میں ہدایات حاصل کرتے رہے :۔

۱۔ صفدر حسین ۔ ایم ۔ اے ۔ لیکچرار ،گورنمنٹ کالج ۔ لائلپور
''نوابان اودھ کے عہد میں زندگی اور ادب''

۲۔ مسٹر صابر علی خان ایم ۔ اے ۔ لیکچرار ، کوئن میری کالج ۔ لاہور نے مقالہ بعنوان ''سعادت یار خاں رنگین'' ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صاحب کی نگرانی میں مکمل کیا جس پر پنجاب یونیورسٹی نے موصوف کو پی ۔ ایچ ۔ ڈی کی ڈگری دی ۔

(ج) ڈاکٹر عبادت بریلوی ۔

۱۔ سید وزیر آغا ۔ ایم ۔ اے ۔
''اردو میں طنز و مزاح'' یہ مقالہ مکمل ہو کر ڈاکٹریٹ کے لئے یونیورسٹی میں ارسال کیا جا چکا ہے ۔

(د) سید وقار عظیم ۔

سید وقار عظیم صاحب کی زیر نگرانی مندرجہ ذیل پی ۔ ایچ ۔ ڈی کے مقالات تکمیل کے مراحل طے کر رہے ہیں :

۱- محمد اسلم - ایم - اے -
''ڈراما نگاری کا فن اور اردو دراما''
۲- ناظر حسن زیدی - ایم - اے -
''مومن خان مومن دہلوی''
۳- مس کلثوم سلطانہ - ایم - اے -
''نذیر احمد دہلوی''

VII- اردو ریسرچ اسکالر :

مس امرت ایم - اے - بحیثیت اردو ریسرچ اسکالر پنجاب یونیورسٹی میں کام کر رہی ہیں - اور ڈاکٹر سید عبداللہ ، صدر شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی کی نگرانی میں اپنا مقالہ بعنوان ''اردو میں پنجاب کا حصہ'' مکمل کر رہی ہیں -

VIII- فارغ التحصیل طلباء کی ملازمت :

ایم - اے - اردو پاس کرنے کے بعد مندرجہ ذیل طلباء حصول ملازمت میں کامیاب ہوئے :-

۱- سعید احمد قریشی - ایم - اے :- سی - ایس - پی - میں آئے -
۲- ایم اے - مجید یزدانی ، جہاں زیب کالج سوات ، میں بہ حیثیت لیکچرار مقرر ہوئے -
۳- محمد اسلم کاظمی بہ حیثیت لیکچرار گورنمنٹ کالج رحیم یار خان میں مقرر ہوئے -
۴- مس سیدہ اختر کا لیڈی میکلیگن کالج لاہور میں بحیثیت لیکچرار اور لائبریرین تقرر عمل میں آیا -
۵- سید ناظر حسن زیدی گورنمنٹ کالج مظفر گڑھ بہ حیثیت اردو لیکچرار مقرر ہوئے -
۶- مس حبیبہ اختر - وارڈن گورنمنٹ گرلز کالج ملتان

IX- اساتذہ شعبہ اردو کی تحریرات جو سال زیر تبصرہ میں مختلف ادبی رسائل میں شائع ہوئیں :-

(الف) ڈاکٹر سیّد عبداللہ

۱- میر اور نیرنگ عناصر
ماہ نو ، مئی ۱۹۵۵ء
۲- مطالعہ رومی کی تاریخ میں اقبال کا مقام
ماہ نو ، اپریل ۱۹۵۵ء
۳- غالب پیش رو اقبال
ماہ نو ، استقلال نمبر ، اگست ۱۹۵۵ء
۴- ادب میں جمالیاتی عنصر
دومیل میگزین گورنمنٹ کالج مظفر آباد (آزاد کشمیر)
۵- شاعری جنون یا عمل
سالنامہ ادب لطیف ، لاہور مارچ ۱۹۵۵ء
۶- سرسید کا اثر اردو ادبیات پر
علی گڈھ میگزین ، سرسید نمبر ۱۹۵۵ء
۷- آتش محض مرصّع ساز یا شاعر بھی
نیا دور کراچی ۱۹۵۵ء
۸- ایک صدی کی ادبی تحریکیں
سالنامہ چٹان ، لاہور ۱۹۵۶ء
۹- تہذیب الاخلاق کی اہمیت
برگِ گل (سر سید نمبر)

اس سال ڈاکٹر سید عبداللہ نے مجموعہ ارمغان علمی بخدمت پروفیسر ڈاکٹر محمد شفیع شایع کیا - اور ۲۹ اکتوبر ۱۹۵۵ء کو سینٹ ہال میں ایک جلسہ عام میں پروفیسر موصوف کی خدمت میں پیش کیا -

(ب) - ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

سال ۵۵-۱۹۵۴ء میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صاحب کی مندرجہ ذیل کتابیں شایع ہوئیں :

۱- نظیر ان کا عہد اور شاعری
سائع کردہ اردو اکیڈمی - سندھ کراچی

۲- انتخابات نثر اردو
سائع کردہ ماڈرن بک ڈپو - لاہور

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صاحب کے نسعدی اور تحقیقی مقالات مندرجہ ذیل رسالوں میں سائع ہوئے :-

۱- اردو کے بچیس سال
ساقی ، کراچی ، جوبلی نمبر ۱۹۵۵ء

۲- منٹو
نقوش - لاہور ، منٹو نمبر ۱۹۵۵ء

۳ نظیر کی غزل
اوریئنٹل کالج میگزین - مئی ۱۹۵۵ء

۴- ولی دلی میں
ماہ نو ، کراچی ، جون ۱۹۵۵ء

۵- تنقید اور نفسیات
ماہ نو ، کراچی ، اگست ۱۹۵۵ء

۶- نفسہائے رنگ رنگ (غالب کی فارسی شاعری)
ماہ نو ، اکتوبر ۱۹۵۵ء

۷- رنگین اور ان کی شاعری
'فنکار' دھلی -

۸- دست صبا اور فیض کا فن شاعری
'امروز' لاہور

۹- مرزا یاس یگانہ اور ان کا کلام

۱۰- فنون لطیفہ (اردو ادب کے آٹھ سال میں شائع ہوا) -

۱۱- واجد علی شاہ کی ایک نادر تصنیف (اردو ادب کے آٹھ سال میں شائع ہوا) -

(ج) ڈاکٹر عبادت بریلوی

سال—۵۵-۱۹۵۴ء میں ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب کی مندرجہ ذیل کتابیں شائع ہوئیں :-

۱- غزل اور مطالعہ غزل
شائع کردہ انجمن ترقی اردو پاکستان ، کراچی

۲- کلیاتِ مومن مع مقدمہ
شائع کردہ - کتابی دنیا - کراچی

اس کے علاوہ اردو کے مختلف رسائل میں ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب کے مندرجہ ذیل تنقیدی اور تحقیقی مقالات شائع ہوئے :-

۱- بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق
'نقوش' لاہور ، شخصیات نمبر ، جنوری ۱۹۵۵ء

۲- غالب اور غم دوران
'ماہ نو' کراچی - فروری ۱۹۵۵ء

۳- غزل کے نئے میلانات
'ماہ نو' کراچی - فروری ۱۹۵۵ء

۴- اقبال کی شاعری کا انسانی پہلو
'ماہ نو' کراچی - اپریل ۱۹۵۵ء

۵- اردو تنقید کے پچیس سال
'ساقی' کراچی - جوبلی نمبر ، اگست ۱۹۵۵ء

۶- منٹو کی حقیقت نگاری
'نقوش' لاہور ، منٹو نمبر ، اپریل ۱۹۵۵ء

۷- اردو غزل میں ہیئت کے تجربے
'ادب لطیف' لاہور - سالنامہ ۱۹۵۵ء

۸- روایت اور انفرادی صلاحیت
'سویرا' نمبر ۱۷، ۱۸ ، ۱۹۵۵ء

۹- دیوان شفتہ (تبصرہ)
اورینٹل کالج میگزین، ۱۹۵۵ء

۱۰- مختصر افسانے کا فن
'نقوش' لاہور، افسانہ نمبر ۱۹۵۵ء

(د) پروفیسر سید وقار عظیم

پروفیسر سید وقار عظیم صاحب کے تنقیدی و تحقیقی مقالات مندرجہ ذیل رسالوں میں شائع ہوئے :-

۱- سرور صاحب
'نقوش' لاہور شخصیات نمبر، جنوری ۱۹۵۵ء

۲- منٹو - عظیم فنکار
'ماہ نو' کراچی - اپریل ۱۹۵۵ء

۳- بدنام منٹو
'افکار' کراچی - اپریل ۱۹۵۵ء

۴- منٹو کا فن
'نقوش' لاہور، منٹو نمبر، اپریل ۱۹۵۵ء

۵- مختصر افسانے کے پچیس سال
'ساقی' کراچی، جوبلی نمبر ۱۹۵۵ء

۶- حسرت، شخصیت اور فن
علی گڑھ میگزین - اپریل ۱۹۵۵ء

۷- اندر سبھا کی ادبی اہمیت
'ماہ نو' کراچی، مئی ۱۹۵۵ء

۸- اندر سبھا کی غزلیں اور گیت
'ماہ نو' کراچی، جون ۱۹۵۵ء

۹- اندر سبھا کا فن
'ماہ نو' کراچی، جولائی ۱۹۵۵ء

۱۰- داستان سے افسانے تک

'نقوش' لاہور - جنوری ۱۹۵۵ء

۱۱- افسانہ نگاروں کی نئی پود

ساقی کراچی ، فروری ۱۹۵۵ء

۱۲- ہماری داستانیں - (اردو ادب کے آٹھ سال میں شائع ہوا) -
پروفیسر سید وقار عظیم صاحب کی مندرجہ ذیل دو کتابیں
زیر اشاعت ہیں :-

۱- ہماری داستانیں

ادارہ فروغ اردو ، لاہور

۲- اندر سبھا اور شرح اندر سبھا

اردو مرکز ، لاہور

ضمیمہ ج

انجمن عربی و فارسی

ڈاکٹر مولوی محمد سفیع صدر انجمن کی رھنمائی میں وقتاً فوقتاً علمی و ادبی نشستیں منعقد ھوتی رھیں اور انجمن کا سہ ماھی علمی و تحقیقی مجلہ شائع ھوکر دنیائے علم و ادب سے خراج تحسین حاصل کرتا رھا ۔

اورینٹل کالج میگزین

مقام مسرت ھے کہ کالج کا یہ سہ ماھی رسالہ جو کچھ بے قاعدہ سا ھوگیا تھا اس کے تمام پچھلے سمارے مکمل کرکے سائع کردئے گئے ھیں ۔ توقع ھے کہ یہ مجلہ آیندہ باقاعدگی سے سائع ھوا کریگا ۔

کالج یونین

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صاحب کو اس سال کے لئے صدر یونین مقرر کیا گیا تھا ۔ آن کی رھنمائی میں یونین نے بڑے سرجوس طریقے سے اپنی ادبی مجلسی سرگرمیاں جاری رکھیں اور کئی ایک سخصیتوں کو مدعو کیا ۔ تفصیل کے لئے صفحہ ۴۰ ملاحظہ فرمائیں ۔

سپورٹس

صدر اسپورٹس ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی رھنمائی میں طلباء اور طالبات نے مختلف کھیلوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ۔ کھیلوں کا معیار پچھلے سالوں کے مقابلے میں کافی بلند تھا حالانکہ کوئی .P.T.I آن کی تربیت کے لئے مقرر نہیں ھے ۔ تفصیل کے لئے صفحہ ۴۶ ملاحظہ فرمائیں ۔

لائبریری

پچھلے سال کالج لائبریری کمیٹی نے جو قوانین مرتب کئے تھے ۔ اس سال لائبریری کا تمام کاروبار آنھیں قواعد کی روشنی میں چلایا گیا اور اس طرح آن مشکلات پر قابو پالیا گیا جو قواعد کی عدم موجودگی کی وجہ سے پیش آتی رھی تھیں البتہ کارڈ کیٹا لاگ کا سامان نہ ھونے کی وجہ سے لائبریری کو چلانے کے لئے بڑی مشکلات پیش آرھی ھیں کیونکہ اس سامان کے بغیر لائبریری مکمل ھی نہیں ھوسکتی ۔ پچھلے تین سالوں

سے یونیورسٹی کے ارباب اختیار کو اس مقصد کے لئے ضروری رقم مہیا کرنے کے لئے ہر سال درخواست دیجاتی ہے لیکن تا حال اس کی منظوری نہیں ملی۔ اس سال یہ درخواست پھر گزاری گئی ہے اور اگر یہ منظور کرلی گئی تو کالج لائبریری تمام پہلووں سے مکمل ہوجائے گی۔ اس وقت کالج لائبریری میں ۲۸۹۰ کتابیں موجود ہیں۔

ولفر فنڈ

پچھلے سال ولفر فنڈ کی تنظیم کے لئے جو قدم اٹھائے گئے تھے اُن پر کالج کی بڑھی ہوئی دوسری اہم سرگرمیوں کی وجہ سے پوری توجہ نہ دی جاسکی۔ تاہم گذشتہ سالوں کی طرح اس سال بھی دس غریب و مستحق طلباء پر -/۴/۳۷۲ روپے اس فنڈ میں سے خرچ کئے گئے۔ مگر ولفر فنڈ کی حالت اچھی نہیں۔

کالج کونسل

کالج کونسل نئی تنظیم کے انتظار میں اس سال بھی معطل رہی۔

اورئینٹل پبلیکیشن فنڈ

اورئینٹل پبلیکیسن فنڈ کمیٹی نے اس فنڈ کو باقاعدہ نظم و نسق کے تحت تسلی بخش طریقے سے چلانے کے لئے جو قوانین مرتب کر کے یونیورسٹی سنڈیکیٹ کو منظوری کے لئے نومبر ۱۹۵۴ء میں بھیجے تھے وہ اب چانسلر کمیٹی نے چند ترمیمات کے ساتھ منظور کرلئے ہیں۔ اس سلسلہ میں جو نئی کمیٹی مقرر کی گئی ہے اُس کے عہدہ داروں اور ممبران کے نام صفحہ ۴۰ میں ملاحظہ فرمائیں۔

ہوسٹل کی نگرانی

ہوسٹل کے نظم و نسق کو بہتر اور اس کی مناسب نگرانی کے لئے جو کمیٹی پچھلے سال بنائی گئی تھی اس کی رہنمائی میں ہوسٹل کا نظم و نسق پہلے سے کچھ بہتر ہے۔

تعداد طلباء
(جو سال ۱۹۵۵-۵۶ء میں داخل ہوئے)

۱- ایم - اے - عربی سال پنجم	۱۱
۲- ایم - اے ,, ,, ششم	۱۳
۳- ایم - اے فارسی ,, پنجم	۱۵
۴- ایم - اے ,, ,, ششم	۲۲
۵- ایم - اے اردو ,, پنجم	۱۲
۶- ایم - اے ,, ,, ششم	۱۸
۷- ,, اسلامیات ,, پنجم	۳
۸- ,, ,, ,, ششم	۲۵
کل تعداد	= ۱۱۹

۹- منشی فاضل	۲۴
۱۰- ادیب فاضل	۳۴
۱۱- مولوی فاضل	۶
۱۲- عربی شام کی جماعت	۷
۱۳- سرٹیفکیٹ ان جرمن	۱۱
۱۴- ڈپلوما ان جرمن	۴
۱۵- سرٹیفکیٹ ان ٹرکس	۳
۱۶- سرٹیفکیٹ ان اسپوکن ایرانین	۱۲
	۱۰۱

کل تعداد = ۱۱۹ + ۱۰۱
= ۲۲۰

نتائج امتحانات

جماعت	امتحان میں شامل ہونے	امتحان میں پاس ہوئے	فی صدی کامیابی
۱- ایم - اے - اردو ششم	٨	٨	١٠٠%
۲- ,, فارسی ششم	١١	٨	٧٣%
۳- ,, عربی ششم	٧	٥	٧١%
۴- ,, اسلامیات ششم	١٣	١٣	١٠٠%
۵- ادیب فاضل	٢٢	٢	٩٫١%
٦- منشی فاضل	١٨	٣	١٦٫٦%
۷- مولولوی فاضل	٣	٣	١٠٠%
٨- سرٹیفکیٹ ان جرمن	٨	٧	٨٧٫٥%

یونیورسٹی ریسرچ سکالر

عربی — مس اُمة الکریم

فارسی — (خالی رہا)

اُردو — مس امیر بٹ

کالج یونین

یونین کے نامزد اور منتخب عہدہ داروں اور دوسرے نمائندوں کے نام حسب ذیل ہیں : -

۱- ڈاکٹر ابو اللّیث صدیقی — صدر

۲- عبدالغفور ایم - اے - اُردو — نائب صدر

۳- اظہر محمد خان ایم ۔ اے ۔ اُردو — معتمد عمومی

۴- امیر احمد ادیب فاضل — معتمد

۵- شمیم اختر ایم - اے - اُردو — معتمد

۶- مجلس منتظمہ :- غلام قادر فاروق ۔ خالد بزمی ۔ صابر لودھی ۔ محصنہ قریشی ۔ قاسم نوری ۔ چوہدری محمد شریف، اشتیاق احمدخاں،

لائبریری

مندرجہ ذیل حضرات پر مشتمل لائبریری کمیٹی بنائی گئی ۔

۱- ڈاکٹر سید عبداللہ — پرنسپل

۲- ڈاکٹر محمد باقر

۳- ڈاکٹر عبادت بریلوی — نگران

۴- محمد شریف ہلال — لائبریرین

ولفر فنڈ کمیٹی

ممبران کمیٹی ولفر فنڈ :۔

۱- ڈاکٹر سید عبداللہ پرنسپل صدر

۲- ڈاکٹر محمد باقر صدر شعبہ فارسی } ممبران اعزازی

۳- ڈاکٹر عنایت اللہ صدر شعبہ عربی } ممبران اعزازی

۴- ڈاکٹر ابواللیث صدیقی سکریٹری

۵- مسٹر احسان الحق (ہیڈ کلرک) خازن

اوریئنٹل پبلیکیشن فنڈ کمیٹی

۱- میاں محمد افضل حسین (وائس چانسلر) چیئر مین
۲- ڈاکٹر سید عبداللہ (پرنسپل) سیکریٹری
۳- آنریبل چف جسٹس ڈاکٹر ایس - اے - رحمان
۴- ڈاکٹر مولوی محمد شفیع
۵- ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم
۶- مولانا عبدالمجید سالک
۷- میاں بشیر احمد
۸- پروفسر ایم - ایم - شریف
۹- ڈاکٹر عنایت اللہ
۱۰- ڈاکٹر محمد باقر
۱۱- علامہ علاؤ الدین صدیقی

کالج یونین کے کام کی تفصیل -

۲۲- اکتوبر ۱۹۵۵ء کو کالج یونین کے عہدیداروں کے انتخاب کے سلسلہ میں طلباء میں ایک گہما گہمی پیدا ہوگئی - دو روز پہلے الیکشن کی تاریخ کا اعلان ہوا تھا - ان دو دنوں میں مختلف امیدوار کافی سرگرم رہے تھے - اگرچہ اوریئنٹل کالج میں طلباء کا زمانہ طالب علمی بہت مختصر ہوتا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ طلباء میں یونین کی سرگرمیوں سے دلچسپی کا احساس بیدار ہوچکا ہے - ۲۲- اکتوبر کو الیکشن ہوا - انتخاب کے لئے "پوشیدہ بیلٹ" کا طریقہ اختیار کیا گیا - منصفین انتخاب ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی ، ڈاکٹر عبادت بریلوی اور پروفیسر عبدالشکور احسن تھے - اس انتخاب کا ایک نمایاں پہلو نظم و ضبط تھا - کامیاب ہونے والے

امیدواروں کے نام حسب ذیل ھیں :—

نائب صدر : عبدالغفور صاحب

معتمد عمومی : اطہر محمد خاں صاحب

معتمد : امیر احمد شریف

انتخابات کے بعد طالبات کی نمائندہ کی حیثیت سے مس شمیم اختر کو نامزد کیا گیا ۔

مجلس منتظمہ : غلام قادر فاروق ، خالد بزمی ، صابر لودھی ، مس محسنہ قریشی، قاسم نوری ، چوھدری محمد شریف ، اشتیاق احمدخاں ، غلام‌حسین ۔ معتمد بلا مقابلہ منتخب ھوا ۔ نائب صدر اور معتمد عمومی تین گنا اکثریت سے کامیاب ھوئے۔ اس الیکشن کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ کالج کے تمام شعبوں کے طلباء نے یکساں دلچسپی ، سرگرمی اور حسن نظم کا اظہار کیا ، الیکشن کے چند ھی دن بعد کالج کا 'یوم تأسیس' منایا گیا ۔ یونین نے اس تقریب کو کامیاب بنانے میں حتی‌المقدور حصہ لیا ، خصوصاً کارکنوں نے بڑے حسن تنظیم کا مظاھرہ کیا ۔ اس کے دوسرے ھی روز یونیورسٹی سینٹ ھال میں ایرانی سفیر آقائی علی اصغر حکمت کی صدارت میں " مجلس ارمغان علمی " کی جانب سے ڈاکٹر مولوی محمد شفیع کی سترویں برسی (۷۰) پر انہیں ھدیۂ عقیدت کے طور پر 'ارمغان علمی' پیش کی گئی ۔ یونین کے عہدہ داروں کے علاوہ اُن کے متعلقہ کارکنوں نے بھی انتظامی امور میں حصہ لیا ۔ ۵ نومبر ۱۹۵۵ کو یونین کی مجلس منتظمہ کا پہلا اجلاس زیر صدارت ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صدر یونین منعقد ھوا ۔ جس میں سال رواں کے پروگرام کو طے کرنے کے لئے ایک ذیلی کمیٹی مقرر کی گئی ۔ نامناسب نہ ھوگا اگر یہاں اس بات کا ذکر کیا جائے ، کہ مجلس منتظمہ کے سامنے نہایت ھی محدود مالی ذرائع تھے اور ضروری دفتری سامان بھی موجود نہ تھا ۔ چنانچہ یونین کے پروگرام کو اور اس کی پیش کی جانے والی سرگرمیوں کی سرگذشت کو ان حالات کی روشنی ھی میں دیکھنا موزوں ھوگا ۔ ذیلی کمیٹی نے سال رواں کا پروگرام طے کیا ۔ اور اس سلسلہ میں تین چیزوں کا ذکر اھم ھے ۔

اول : اس سال یونین کا مگزین نہ چھپ سکیگا ۔

دوم : کالج کے مختلف شعبوں کو الگ الگ فنڈز نہیں دئے جائیں گے ۔

سوم : طالب علموں کی الگ بزم ادب قائم نہیں نہ آئے گی ۔ بلکہ تمام سرگرمیاں مشترک ہونگی البتہ طالبات کی ایک الگ تقریب کے لئے کچھ رقم مخصوص کردی جائےگی ، مجلس منتظمہ نے ذیلی کمیٹی کے فیصلوں کو متفقہ طور پر منظور کیا ۔

یونین کی سب سے پہلی تقریب کا انعقاد '' یوم اختر شیرانی '' سے ہوا ۔ جس کی صدارت یونین کے نائب صدر جناب عبدالغفور صاحب نے فرمائی ۔ کچھ ناگزیر وجوہات کی بنا پر یہ تقریب ہماری توقعات کے مطابق کامیاب نہ ہوسکی ۔ اس کے باوجود یہ کوئی اتنی بڑی ناکامی بھی نہ تھی ، حکیم نیرّ واسطی اور قمر تسکین نے اختر شیرانی مرحوم کے فن اور شخصیت پر مقالات پڑھے ، علاؤالدین صاحب نے اختر شیرانی کی چند نظمیں ترنم سے سنائیں ، حاضرین کی تعداد اڑھائی اور تین سو کے درمیان تھی ۔ جن میں اساتذہ کرام کے علاوہ بعض قابل ذکر حضرات بھی شامل تھے ۔ اس تقریب کی دوسری نشست ایک مختصر مشاعرہ پر مشتمل تھی ۔

یونین کی سرگرمیاں :

۱ ۔ طلباء میں علمی اور ادبی ذوق کو پیدا کرنے کے سلسلہ میں یونین نے بزم ادب کی تنظیم پر بالخصوص توجہ دی ۔ (بزم ادب کی سرگرمیوں کا ذکر الگ عنوان کے تحت ہوگا)۔

۲ ۔ یونین نے مختلف کالجوں سے ربط و ضبط بڑھانے کے سلسلہ میں مباحثوں میں شرکت کو اہمیت دی ۔ چنانچہ ہمارے کالج کی طرف سے مسٹر نثار احمد ریاض ، مسٹر سلیم اختر اور مسٹر قاسم نوری نے حصہ لیا ۔ لاہور کے کم و بیش تمام کالجوں کے علاوہ ان طلباء نے راولپنڈی اور گوجرانوالہ کے مباحثوں میں بھی شرکت کی ۔ اور بعض موقعوں پر تقریروں کا اچھا معیار پیش کیا ۔

۳ ۔ طلبا کے اصرار پر دو تفریحی پروگرام بھی پیش کئے گئے ۔

(i) میجک شو (ii) محفل موسیقی

مؤخر الذکر میں پنجاب میوزک سرکل کے صدر مسٹر جی - اے - فاروق نے کلاسیکی موسیقی پر ایک محققانہ اور پُر مغز مقالہ پڑھا ، جس کی تشریح کے سلسلہ میں عملی مظاہرہ کیا - سنٹرل ٹریننگ کالج سے پروفیسر معتیزالدین صاحب نے ستار پر ایک دلکش دھن پیش کی - اس محفل میں اساتذہ اور معززین شہر نے بھی شرکت کی -

۴- طالبات نے جنوری ۵۰ء میں ایک '' پکنک '' منائی -

۵- کالج کے شاعر طلباء نے مختلف مشاعروں میں شرکت کی - دیال سنگھ کالج میں قاسم نوری اور صابر لودھی نے طرحی غزلیں پڑھیں اور دوسرا انعام حاصل کیا -

۶- امسال وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی کی تحریک پر یونیورسٹی کی پوسٹ گریجویٹ کلاسز کی یونین کی تشکیل کا کام عمل میں آیا جس میں اس یونین کے عہدہ داروں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور جس خاص مسئلہ پر انہوں نے طلباء کو متوجہ کیا وہ قومی زندگی میں اردو زبان کی اہمیت ہے چنانچہ یونین کے نمائندوں نے تقریریں اردو ہی میں کیں -

۷- امسال لاہور کے طلباء نے ایک ثقافتی ادارہ کی تنظیم کی جس کا نام ' لاہور اسٹوڈنٹس سرکل ' رکھا گیا - یونین کے نائب صدر نے اس سرکل کی تنظیم میں سرگرمی سے حصہ لیا - صابر لودھی ایڈ ھاک کمیٹی کے ممبر چنے گئے اس سرکل میں بھی اردو زبان کی اہمیت کا ہر موقعہ پر احساس دلانے کی کوشش کی گئی اور مفید تجاویز بھی پیش کی گئیں -

۸- یونین نے اپنے دفتر کی تنظیم پر توجہ دی اور دفتری ریکارڈ کو مرتب کیا - اس کے علاوہ یونین کی سرگرمیوں کی اشاعت کا اخبارات میں خاص طور پر اہتمام کیا گیا -

۸- ۲۳ - فروری ۵۶ء کو ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صدر یونین کو کراچی یونیورسٹی میں صدر شعبۂ اردو کے عہدہ پر تقرر کے سلسلہ میں ایک الوداعی دعوت دی گئی - اور ان کی خدمت میں مجلس منتظمہ کی طرف سے ''سپاس نامہ'' پیش کیا گیا -

۹- پنڈت دتاتریہ کیفی ، قاضی عبدالغفار ، اسرارالحق مجاز ـــ ان مشاہیر ادب و شعر کی وفات پر یونین نے خصوصی اجلاس بلائے اور ان کی علمی و ادبی خدمات کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اپنے رنج و الم کا اظہار کیا -

بزم ادب :-

بزم ادب کا افتتاحی اجلاس حضرت جگر مراد آبادی کی آمد سے ہوا - جس میں انہوں نے اپنے مختلف ادوار کی غزلیں پڑھ کر سنائیں اس کے علاوہ نذر امروہوی نے بھی اپنا کلام سنایا - سوا سو کے قریب حاضرین تھے محفل بڑی کامیاب رہی -

اس کے بعد یونین کے ہفتہ وار اجلاس شروع ہوئے - جن میں بڑی حد تک باقاعدگی کو ملحوظ رکھا گیا - اساتذہ نے بھی پورا تعاون کیا - چنانچہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ، پروفیسر وزیر الحسن عابدی اور ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب نے مختلف مواقع پر صدارت کے فرائض سرانجام دئے - بزم ادب میں اب تک حصہ لینے والوں کے نام یہ ہیں :-

مقالات : سجاد نسیم زیدی ، صادق فرقانی

افسانے : عبدالغفور - آرزو چوھدری ، عاقل رضوی

نظم و غزل : عبدالغفور - قاسم نوری ، اقبال رسول کامل ، سلیم اختر اور حاتم علی ظفر -

خصوصی اجلاس :

(الف) ۲۶- جنوری ۵۶ء کو پروفیسر سید وقار عظیم صاحب کی زیر صدارت مولانا محمد حسین آزاد کی برسی منائی گئی - اس میں مولانا صلاح الدین احمد نے ''آزاد کے دو ہیرو'' کے عنوان سے ایک

مقالہ پڑھا۔ اور عبدالغفور صاحب نے " مولانا آزاد — میں ان سے ملا ہوں" کے عنوان سے ایک مضمون پڑھا۔ قاسم نوری صاحب نے ترنم سے آزاد کی نظموں کے چند بند سنائے۔ آخر میں پروفیسر وقار عظیم نے ایک مختصر تقریر آزاد کے طرز نگارش اور اسلوب زندگی کے بارے میں کی۔

(ب) ۹۔ فروری ۱۹۵۶ء کو خواجہ منظور حسین صاحب پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور نے " بانگ درا " پر ایک عالمانہ اور انتہائی دلچسپ مقالہ پڑھا۔

(ج) ۱۷۔ فروری ۵۶ء کو کالج کے ایک قدیم طالب علم حبیب جالب نے اپنی متعدد غزلیں سنائیں۔ بزم ادب کے هفتہ وار اجلاس جاری هیں۔ اور چند خصوصی اجلاس بلانے کی تیاریاں کی جا رہی ہیں۔

(د) ۱۰۔ مارچ ۱۹۵۶ء کو زیر صدارت جناب فیض احمد فیض سٹینارڈ ہال میں ایک انٹر کالجیٹ مشاعرہ منعقد ہؤا۔ اگرچہ اس دن طوفان باد و باراں تھا اور امید نہیں تھی کہ لوگ مشاعرہ سننے کے لئے آئیں گے۔ تاہم مقام مسرت ہے کہ ہال حاضرین سے بھرا ہؤا تھا۔ انعامی مشاعرہ کے بعد چند مہمان شعرأ نے اپنے کلام سے حاضریں کو محظوظ کیا۔ جن میں صاحب صدر کے علاوہ جگر مراد آبادی۔ ندیم قاسمی۔ زہرہ نگاہ۔ صوفی تبسم۔ کلیم عثمانی اور ظہیر کاشمیری کے نام قابل ذکر ہیں۔

مجموعی تبصرہ :— یونین کی یہ سرگرمیاں کوئی قابل ذکر و فخر کارنامہ تو نہیں لیکن دو ایک باتیں اس ضمن میں کہنا ضروری ہیں۔ یونین کے عہدہ داروں اور مجلس منتظمہ کے پیش نظر یہ بات خاص طور پر رہی کہ کالج کے طلباء میں علم و ادب کا ذوق پیدا کیا جائے۔ اور انہیں جماعتی زندگی کی اہمیت کا احساس دلایا جائے۔ اور ساتھ ہی اورینٹل کالج کا رابطہ دوسرے کالجوں سے بڑھایا جائے۔ یونین نے طلباء کی "تفریحی" (Recreational) خواہشات کو بھی نظر

نداز نہیں کیا ۔ علاوہ ازیں یونین نے مختلف تقریبات پر کالج کی زندگی
میں پہلی مرتبہ کالج کے عام طلباء و طالبات کو چائے میں شریک
کر کے ایک نئی روایت قائم کی ۔ یونین نے حتی الامکان اپنے فرائض
کی انجام دہی کی سعی کی ۔

آخر میں ہمیں یونین کے چند پر خلوص سرگرم کارکنوں کا
شکریہ ادا کرنا ہے ، خاص طور پر صابر لودھی کنوینر بزم ادب ،
قاسم نوری ، حسن عسکری ، اشتیاق احمد ، اعجاز الرحمن اور
بنیاد حسین نقوی کے نام قابل ذکر ہیں ۔ علاوہ ازیں ہم کالج کے
اسٹاف اور بالخصوص مسٹر احسان الحق ہیڈ کلرک کے تعاون اور
ہمدردانہ رویہ کے شکر گذار ہیں ، اور نامناسب نہ ہوگا کہ یونین
کے چپراسی محمد حسین کی خدمات کا اعتراف بھی کر لیا جائے ، یہ
ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پیشرو مجلس منتظمہ کا بھی شکریہ ادا
کریں جس کی روایات کو ہم نے اپنی کارگزاریوں کی بنیاد بنایا ۔

فانظر و بعدنا الی لا بار

کھیل (سپورٹس)

یونیورسٹی اورینٹل کالج ایک ایسی درسگاہ ہے جہاں علمی و ادبی
کاموں کے علاوہ طلبہ کا عام کھیلوں میں دلچسپی لینا بھی قابل ستائش
ہے ۔ بالخصوص ان حالات میں جب کہ طلبہ کی تربیت کے لئے پچھلے
چند سال سے کوئی P.T.I. نہیں ۔ لیکن اس کے باوجود ان کے کھیلنے کیلئے
مندرجہ ذیل کھیلوں کا انتظام کیا گیا جن میں طلبہ نے بڑی دلچسپی لی :-

۱- والی بال ۲- بیڈ منٹن ۳- کشتی رانی

والی بال کی کوئی باقاعدہ ٹیم نہیں تھی تاہم مختلف کلاسوں کے طلبہ
مل کر یہ کھیل کھیلتے رہے ۔ بیڈ منٹن میں طلباء کے ساتھ ساتھ طالبات نے
بھی بہت سرگرمی سے حصہ لیا ۔ طالبات کے لئے علیحدہ کھیلنے کا انتظام
کیا گیا ۔ صفدر مسعود اور عبدالسلام نے امسال بیڈ منٹن کے یونیورسٹی
میچوں میں حصہ لے کر اسلامیہ کالج سیالکوٹ کو شکست دی اور یہ

ثابت کردیا کہ اورئنٹل کالج کے طلبہ کی سرگرمیاں صرف علمی و ادبی ریسرچ تک ہی محدود نہیں بلکہ کھیل کے میدان میں بھی یہ نمایاں حصہ لے سکتے ہیں۔ کالج کی سالانہ کھیلوں میں بھی لڑکوں نے بہت دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔

یونیورسٹی اورینٹل کالج کے اسٹاف نے اگرچہ کھیلوں میں بہت کم حصہ لیا لیکن خوشی کی بات ہے کہ اس نے طلبہ سے ہر کھیل میں مکمل تعاون کیا اور سٹاف اور طلبہ کے بیڈ منٹن کے مقابلے میں بڑے اچھے کھیل کا مظاہرہ کیا۔ سٹاف کی طرف سے مسٹر احسان الحق اور ایم شریف ہلال نے حصہ لیا۔

کشتی رانی کی ٹیم اس دفعہ کسی میچ میں حصہ نہ لے سکی کیونکہ طلبہ نے اس طرف بہت کم توجہ دی امیر احمد سیکرٹری کشتی رانی نے بہت کوشش کرکے طلبہ کو اس طرف راغب کیا چنانچہ کشتی رانی کا مقابلہ بڑا دلچسپ رہا۔

کھیلوں کی باقاعدگی اور کامیابی کا سہرا ہمارے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صاحب کے سر ہے جنہوں نے طلبہ کی ہر کوشش میں ان کی ہمت افزائی اور سرپرستی فرمائی۔ صفدر مسعود سیکرٹری بیڈ منٹن کلب نے بھی اپنے فرائض نہایت بندھی سے سرانجام دئے اور کھیلوں میں ایسا ماحول پیدا کیا جو قابل تعریف ہے۔

خطبۂ صدارت

عالی جناب ڈاکٹر بشیر احمد صاحب

ایم ایس سی - پی ایچ ڈی - ایف آر - آئی - سی

(سابق وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی)

ڈائرکٹر ریجنل سائنس لیبارٹریز پاکستان

جو

یونیورسٹی اورینٹل کالج کے جلسہ

تقسیم انعامات ۱۹۵۶ء کے موقع پر پڑھا

جناب رئیس کالج ، اساتذہ کرام ، خوانین و حضرات !

اس قدیم درس گاہ کی سالانہ تقریب پر آپ نے مجھے صدر منتخب کرکے جو میری عزت افزائی فرمائی ہے اس کا شکریہ جن الفاظ میں بھی کروں کم ہوگا۔ علوم مشرقیہ میں میں کسی نمایاں حیثیت کا مالک نہیں۔ میری عمر کا بیشتر حصہ مرکبات اور گھاس پات میں خدا کی کیمیاگری کے راز سمجھنے میں گزرا۔ مگر مشرقی دل و دماغ کا مالک ہونے کی حیثیت سے مجھے مشرق علوم سے دلی انس ہے اور فی زمانہ ملک و قوم کی بہبودی کے لئے ان کو اشد ضروری سمجھتا ہوں۔ عرصہ سے چند خیالات ذہن میں سرگرداں تھے اس موقع سے بہتر اُن کے اظہار کا اور کیا ہوسکتا تھا۔ بایں وجوہات باوجود اپنی کم علمی کے میں نے آپ کی دعوت کو بسر و چشم قبول کیا۔

عرصہ تک علم کیمیا میں انہماک نے مجھے اجازت نہ دی کہ کشور پنجاب کے اس دارالعلوم کی سب سے قدیم اور سب سے عظیم درس گاہ سے کوئی گہرا تعارف پیدا کروں۔ مگر ۱۹۵۲ء میں جب گورنمنٹ کمیشن نے یونیورسٹی کی نئی تشکیل کے لئے سفارشات مرتب کیں۔ تو مجھے اس دانش گاہ کے تاریخی حالات کے مطالعہ کا موقع ملا۔ تب مجھے پہلی مرتبہ آپ کے کالج کی حقیقی شان اور علمی روایات کا صحیح اندازہ ہوا۔ ماحول پر نظر ڈالی تو دل کو ٹھیس سی لگی۔ وہ کالج جو اس قدر قدیم و عظیم ہے، جو اس دانش گاہ کے قیام کا باعث ہوا، جسکی علمی روایات اس قدر روشن ہیں اب اعلیٰ تعلیم کے موجودہ سلسلوں میں اور اس دانشگاہ کے موجودہ نظام میں جو جگہ اُسے میسر ہے اس کے اصلی مقام سے کس قدر بعید تر ہے۔

سچ پوچھئے تو اس معاملہ میں یونیورسٹی کمیشن کی سفارشات سے بھی مجھے کافی مایوسی ہوئی۔ مجھے یہ محسوس ہوا کہ کالج کا اصلی مقصد اور اس کی تعلیم کی اصلی غایت کو نظر انداز کرکے اس کے لئے ایک گھٹیا سی جگہ متعین کی جارہی ہے۔ میرے ذہن میں کالج کا اصلی مقصد تعلیم علوم مشرق ہے۔ تعلیم میں درس اور تحقیق دونو شامل ہیں جو اب تک اس کالج کی تعلیم کا شیوہ رہا۔ عربی ، فارسی اور اردو زبانوں کی تدریس ان علوم کے مطالعہ کا ذریعہ

تھی ۔ ان علوم کا رشتہ ہماری مخصوص تہذیب ، ہماری مخصوص ثقافت ، ہماری مخصوص معاسرت ، ہمارے دین اور ہمارے اخلاق سے تھا ۔ اگر مشرق زبانوں کی اهمیت تھی تو محض اس لئے کہ ان میں ہماری تہذیب اور ہماری ثقافت کے خزانے پوسیدہ تھے اور ان زبانوں کے وسیلہ سے هم وهاں تک پہنچ سکتے تھے ۔ مجھے محسوس هوا کہ کالج کو محض مشرقی اور مغربی زبانوں کی درسگاہ قرار دینے سے اس کی تعلیم کا اصل مقصد فوت هوجائے گا ۔

ہماری مسرقی تہذیب اور ثقافت ایسی حمز نہیں جس سے موجودہ دنیائے علم یکسر بے نیاز هوجائے ۔ اگر اس کرۂ ارض کی قوموں میں ہمارا وقار پھر قائم هوسکتا ہے تو اس کا طریقہ فقط ہماری تہذیب اور ثقافت کا احیاء ہے ۔ غلامی کے زمانہ میں هم نے اس بیش بہا موتی کو کھو دیا اور مدتوں تک وہ احساس زیاں بھی جاتا رہا ۔ اب آزادی کے نئے دور کا تقاضا یہی ہے کہ هم اپنی گمشدہ دولت تلاش کریں اور اسے اپنالیں ۔

انیسویں صدی کے وسط میں هندوستان میں مطالعہ علوم مشرق کی ایک منظم تحریک پیدا هوئی ۔ اس سے ملکی باسندوں کا مقصد اپنی قدیم تہذیب کا احیاء تھا ۔ حکمران قوم کے علم دوست افراد نے بھی اس کی اهمیت کا اعتراف کیا اور ڈاکٹر لائٹنر کے علاوہ کئی علم دوست انگریزوں نے اس تحریک میں حصہ لیا بلکہ کافی حد تک پیش پیش رہے ۔ یہی تحریک اس کالج کے قیام کا باعث هوئی بلکہ ملک کے دوسرے حصوں میں بھی اس قسم کی کئی درسگاهیں قائم هوئیں ۔ یورپ میں ان علوم کو عرصہ تک تعصب کے بادلوں نے گھیرے رکھا ۔ جب یہ بادل پھٹے اور ان علوم کی روشنی کی کرنوں نے وهاں کے عالموں کو متوجہ کیا تو انگلستان اور یورپ کی اکثر دانش گاهوں میں علوم مشرق کے مطالعے کے شعبے قائم هوئے ۔ ان شعبوں میں بڑے بڑے ذخیرہ ہائے کتب مہیا هوئے اور تحقیق اور درس کو اس درجہ تک پہنچایا کہ مشرق کے طلباء اس تہذیب اور ثقافت کے قدیم گہوارہ کو چھوڑ کر ان مغربی درس گاهوں کے مرهون منت هوئے ۔ ہماری غفلت کی حد تو دیکھئے کہ نہ صرف علوم مشرق

کی تعلیم کے لئے بلکہ عربی ، فارسی اور اردو کی ڈگریوں کے لئے بھی لنڈن ، اکسفورڈ اور کیمبرج ہمارے منتہیٰ نظر ہوں ۔

رئیس کالج نے پچھلے سال کالج کے ۸۶ ویں یوم تاسیس کے موقع پر اپنے خطبہ استقبال میں بالتفصیل علوم مشرقی کی زبوں حالی پر بحث کی ہے ۔ باوجود انجمن پنجاب اور اس کے فاضل صدر ڈاکٹر لائٹنر کی کوششوں اور دیگر علماء کی جدوجہد کے اس خطہ میں کوئی خاطر خواہ نتائج نہ نکل سکے ۔ یہ درست ہے کہ انگریزی حکومت کی تعلیمی حکمت عملی اور ملک کی بدلتی ہوئی اقتصادی ضروریات اس کے مانع تھی ۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہی نہیں بلکہ ہمارے اپنے نظام تعلیم کی کمزوری اور بدنظمی بھی اس کی بڑی وجہ تھی ۔ اس سلسلہ میں میرا ایک واقعہ کا دھرانا غیر مناسب نہ ہوگا ۔ ۱۹۵۰ء میں مجھے استنبول یونیورسٹی کے رئیس دانشگاہ نے دوران گفتگو میں بتایا کہ ان کی دانش گاہ کو قائم ہوئے پانچ سو سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے ۔ اور اس کی تدریس اور تحقیق کا تسلسل بغیر ٹوٹے ہوئے اتنے عرصہ سے قائم ہے اور استفسار کیا کہ پاکستان بھی ایک قدیم تہذیب کا مالک ہے پنجاب یونیورسٹی کب قائم ہوئی ۔ انہیں یہ سنکر نہایت حیرت ہوئی کہ پاکستان کی قدیم یونیورسٹی انگریزوں کی قائم کردہ ہے اور اسلامی عہد کی اعلیٰ تعلیم کی کوئی بھی درس گاہ اب موجود نہیں ۔ ان کا اظہار حیرت میرے لئے تازیانہ فکر ہوا ۔

اسمیں شک نہیں کہ انگریزی دور سے پہلے ملک میں مشرقی علوم کی تعلیم کا ایک وسیع نظام تھا ۔ مگر ان مدارس کا یا تو کسی مسجد و مندر سے تعلق تھا یا کسی عالم کی شخصیت کے ساتھ ۔ حکومت کی طرف سے مدرسین کے تقرر کا نہ ان کے نان و نفقہ کا باقاعدہ انتظام تھا ۔ ہمارے بادشاہوں نے اپنے محلات اور مقبروں کی عالیشان عمارتیں بنوائیں مگر ان کے دوران حکومت میں کسی دارالعلوم کو یا کسی کتب خانہ کو چونا اور اینٹ کی متوسط سی عمارت بھی نصیب نہ ہوئی ۔ بدیں حالات جب عالم کی شخصیت اٹھ گئی درس گاہ کا شیرازہ بھی درہم برہم ہوگیا ۔ اب دو سو سال کے بعد ان مدرسوں کے کہیں کھنڈر بھی نہیں جنہیں دیکھ

کر کوئی رولے اور دل کی بھڑاس نکال لے -

اس دانش گاہ میں عالم فاضل کی جاعتوں کی زبوں حالی تو سب پر عیاں ہے مگر افسوس ہے کہ بعض حلقوں میں کالج کے عام تعلیمی اسلوب کو بھی فرسودہ کہا جاتا ہے جو نئے زمانے کے نئے نقاضوں اور نئی ضرورتوں کا حامل نہیں اس لئے کہ وہ روایات قدیم سے وابستہ ہے میں ان اعتراضات کی پرزور تردید کرتا ہوں - کالج کا علمی اور تحقیقی کام ایسا ہے جس پر دنیا کے اس نئے دور کی بڑی سے بڑی دانش گاہ بھی فخر کر سکتی ہے - رئیس کالج نے تو ان کا اشارتاً ذکر کیا ہے مگر اوریئنٹل کالج میگزین کی کوئی جلد اٹھا کر دیکھنے سے اور کالج کے مشرقی فنڈ کی مطبوعات پر محض سرسری نظر ڈالنے سے چشم بصیرت پر اس درس گاہ کا اصل مقام عیاں ہو جاتا ہے - آج بھی اگر لنڈن ، اکسفورڈ اور کیمبرج کے علمی حلقوں میں پنجاب یونیورسٹی کا وقار ہے تو اس کے علوم جدید کے شعبوں کی تحقیقات کی وجہ سے نہیں بلکہ اوریئنٹل کالج کے علمی روایات کی وجہ سے ہے - اوریئنٹل کالج کی روایات کا قدیم اور مسلسل ہونا قوم اور ملک کے لئے بڑی نعمت اور قیمتی ورثہ ہے - ان کی قوم کو قدر کرنی چاہئے -

عالم فاضل کی جاعتوں کا نصاب بعد از ترمیم بھی کیوں دور حاضر کے نئے تقاضوں کا حامل نہیں ہوسکا - سمجھ سے باہر ہے - انڈرسن کمیٹی اور اب یونیورسٹی کمیشن نے کچھ اس قسم کا اظہار خیال کیا ہے کہ ان کا نصاب سرے سے ناقابل اصلاح ہے - میں با ادب دانشمندان قوم سے درخواست کرتا ہوں کہ ہمدردی سے اس مسئلہ پر غور کریں اور موزوں اصلاح کے بعد عالم کے نصاب کو ایف اے اور فاضل کے نصاب کو بی - اے آنرز کا ہم پلہ بنائیں بلکہ اس اسلامی حکومت کے سرکاری حلقوں میں معمولی ایف - اے اور بی - اے سے ان کی قدر زیادہ ہو - سرکاری ملازمتوں اور معاش کے دروازے ان کے لئے کھول دئے جائیں -

اس دنیا میں علم سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں - علم کی تقسیم و تفریق سخت نادانی اور کفران نعمت ہے - اس زمانہ کی یاد بھی ابھی تازہ ہے جب علم کے بھی ہندو و مسلمان حصص تھے - رئیس الکلیہ نے اب علم

کے اعلیٰ اور ادنیٰ طبقوں کا ذکر کیا ہے یہ تقسیم و تفریق غلامی کے دور کی نشانی ہے ایک آزاد قوم کی فراخ ذہنیت کے سایان سان نہیں۔ میرے خیال میں تو سائنس اور آرٹ کی تفریق بھی کوئی ایسی مناسب نہیں سائنس کو جرمن زبان میں Wissenschaft کہا جاتا ہے جس کے لغوی معنی علم کے ہیں۔ چالیس سال قبل جب جرمنی میں قیصر ولیم سوسائٹی نے سائنس کے مختلف شعبوں کی تحقیق کے لئے ملک بھر میں اعلیٰ پیمانہ کے اداروں کا جال بچھایا تو ان میں فلسفہ، تواریخ، لسانیات اور ثقافت کے مطالعہ کو بھی جگہ دیگئی۔ اور اب یہ ادارے Max Planck Institutes کے نام سے موسوم ہیں اسی طرح روس کی اکیڈمی آف سائنس نے علم کے سب شعبوں کو سائنس قرار دیا ہے۔ اور فلسفہ اور تاریخ کے علاوہ ان میں ادبیات۔ موسیقی اور مصوری کو بھی شامل کرلیا ہے۔

قیام پاکستان کے بعد مشرقی علوم کی اہمیت ہماری قومی ترقی کے لئے بہت بڑھ گئی ہے۔ اب جبکہ پاکستان کے بعد مشرقی علوم کی اہمیت ہماری قومی ترقی کے لئے بہت بڑھ گئی ہے تو نہایت ضروری ہے کہ ہم ان کی ترقی اور ترویج کی طرف جوش اور سرگرمی سے متوجہ ہوں۔ اورینٹل کالج کی موجودگی ان حالات میں ایک نعمت غیر مترقبہ ہے یہ ہماری تہذیبی، ثقافتی، معاشرتی اور اخلاق زندگی کی ترقی کا ضامن ہوسکتا ہے۔ اس کو ہمیں صحیح معنوں میں قوم کی اعلیٰ علمی اکاڈمی کا درجہ دینا چاہئے۔ اور جو کام اس سے لیا جاسکتا ہے لینا چاہئے۔

ہمارے تہذیبی احیاء کے علاوہ اس وقت سب سے ضروری کام اپنی قومی زبان کی ترقی کا ہے۔ مجھے نہایت افسوس اور درد سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس کی طرف نہ دانشمندان قوم نے اور نہ اس دانش گاہ کے ارباب حل و عقد نے پوری توجہ دی ہے۔ جو کیفیت ایک سو سال پہلے انجمن پنجاب کی تحریک کے زمانہ میں تھی اب بھی وہی ہے، جو وجوہات ایک سو سال پہلے اس کی محرک تھیں اب کئی گنا زیادہ Urgency کے ساتھ موجود ہیں۔ مگر قوم اور ملت کی توجہ اس اشد ضروری مسئلہ کی طرف جس سے ہماری مجموعی موت و حیات وابستہ ہے صحیح معنوں میں مبذول نہ ہوسکی۔

جیسا کہ رئیس کالج نے ایک مرتبہ اپنے خطبہ میں بیان کیا آج سے سوسال قبل انجمن پنجاب اور اس کے فاضل صدر ڈاکٹر لائٹنر کا مطالبہ تھا کہ ملکی تعلیم کا نظام اس طرح مرتب کیا جائے کہ اس میں مشرقی علوم اور ملکی زبانوں کو نمایاں حیثیت حاصل ہو۔ علوم جدید اور علوم قدیم میں معقول پیوند قائم کیا جائے۔ اور جدید علوم ملکی زبانوں میں پڑھائے جائیں۔ آج بھی اس قوم اور اس دور کا تقاضا یہی ہے۔

ہمارے مدارس اور ہماری دانشگاہوں میں تمام مضامین خواہ وہ قدیم ہوں خواہ جدید، خواہ سائنس سے متعلق ہوں، خواہ آرٹ، سب کے لئے ذریعہ تعلیم ہماری قومی زبان اردو ہو۔ اردو زبان کی ترقی کے لئے ایک اکاڈمی قائم کی جائے جو اس سلسلہ میں تمام تر ضروریات اور مسائل پر غور کرتی رہے اور ان کا حل تجویز کرتی رہے۔

پاکستان کے قیام کے فوری بعد ملک میں قومی زندگی کو نئے اسلوب پر ڈھالنے کا بہت جوش تھا۔ قوم کے حکماء اور عالم تو یک طرف عام افراد کے دل میں بھی یہی امنگ تھی کہ اسلامی روایات اس ملک میں اپنے پورے نور کے ساتھ سور ہوں۔ تعلیمی حلقوں میں بھی کچھ ہل چل ہوئی متعدد کمیٹیاں مقرر کی گئیں۔ مجھے بھی ان کمیٹیوں میں شامل ہونے کا اتفاق ہوا۔ مگر میں نے ان کے بحث و مباحث اور ان کی تجاویز کی تشکیل میں زیادہ حصہ نہ لیا۔ کیونکہ مجھے ان کے طریق کار سے سرے ہی سے اتفاق نہ تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس نیک کام میں بحث و مباحثہ کی گنجائش نہیں۔ اس میں فوری عمل کی ضرورت ہے۔ جب اس راستہ پر چل نکلینگے تو جو رکاوٹیں اور جو مسائل سامنے آئیں وہ اردو اکاڈمی کے سامنے پیش کی جائیں کہ ان کا حل تجویز کرے۔ تفصیلاً میری تجویز یہ تھی۔

۱۔ اصولاً سب مضامین اور سب امتحانات کے لئے اردو کو ذریعہ تعلیم تسلیم کیا جائے اور اس پر عمل فی الفور شروع کردیا جائے۔

۲۔ انگریزی زبان کی تعلیم بدستور جاری رہے تاکہ مدرس اور طلبا دونو اپنے مضمون کی انگریزی کتب کا مطالعہ بخوبی کرسکیں۔

۳۔ علمی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرنے پر وقت صرف نہ کیا جائے

بلکه هر مضمون کے ماهر اور عالم لوگوں کو ترغیب دی جائے
که وه اردو میں مستند کتابیں لکھیں -

۴- سائنس کے مختلف علوم کی جو اصطلاحات بین الاقوامی ہونے کا درجه
رکھتی هیں ان کو هو بہو اردو زبان میں لے لیا جائے - ان کے
علاوه شروع شروع میں دیگر اصطلاحات بھی انگریزی زبان هی سے
بہت حد تک لے لی جائیں - جن اصطلاحات کا ترجمه لازمی هو - وه
کام اردو اکاڈمی کے سپرد کیا جائے - جو ان کے مستند ترجمے شائع
اور بتدریج رائج کرتی رہے -

۵- اردو کو دفتری اور سرکاری زبان بھی فی الفور کردیا جائے - اور
انگریزی دفتری اصطلاحات جن کے مناسب اردو مترادف موجود نه
هوں - ویسے هی استعمال هوتی رهیں - اور ان کا ترجمه بھی اکاڈمی
کے سپرد هو -

مجھے ڈاکٹر لائٹنر کے عقیدہ سے اتفاق ہے که علمی کتابوں کا ترجمه
بہت مشکل ہے - برعکس اس کے عالموں کے لئے علمی کتابیں لکھنا زیادہ
آسان اور احسن ہے - اس لئے کتابوں کے ترجموں پر وقت نہیں صرف
کرنا چاهئے -

جب تک اردو زبان سے آپ کام لینا شروع نه کریں گے اس میں وه
صلاحیت جس کے آپ خواهاں هیں پیدا نه هوگی - اب تو وهی مثال ہے که
بچے کو آپ چلنے کی اجازت نہیں دیتے مگر اصرار ہے که اپنے اعصاب اور
جوڑوں میں طاقت پیدا کرو تاکه تم تیزی سے بھاگ سکو - کون نہیں
سمجھ سکتا که جب تک آپ بچے کو چلنے نه دینگے اسمیں بھاگنے کی طاقت
هرگز نه آسکے گی - خدا را اسکو چلنے دیجئے پہلے گرتا پڑتا لڑھکتا چلیگا
پھر سرعت ، تیزرفتاری اور پرواز کی طاقت بھی اس میں آجائے گی -

ہماری قومی زبان کی ترویج کے متعلق اس وقت بھی میرا یہی خیال
تھا اور اب بھی یہی ہے - میں وثوق سے کہه سکتا هوں که پندره سال کے
انتظار کے بعد بھی جیسا بعض اصحاب کا اصرار ہے معامله وهیں کا وهیں
رهیگا - سائنس کا بہانه پیش کر کے اس نیک کام کو ملتوی نه کیجئے -
کیونکه التوا قوم کی ترقی اور بہبودی کے سخت مانع ہے -

سائنس کے معاملہ میں صرف اتنا ضروری ہے کہ انگریزی زبان کی تعلیم کا معیار کم نہ ہو اگر سائنس کے طلباء میں یہ صلاحیت موجود رہی کہ وہ بخوبی انگریزی کتابوں کا مطالعہ کرسکیں سائنس کی تعلیم اور تحقیق کے راستہ میں کوئی کمی نہ ہوگی۔

سائنس کی تعلیم میں بھی قومی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے سے وہی خاطر خواہ نتائج ظہور میں آئینگے جن کی ہمیں دیگر علوم کے بارے میں امید ہے۔

رئیس الکلیہ کی تجویز کہ ملک میں جلد از جلد باوقار اردو اکاڈمی قائم کی جائے جس کے زیر ہدایت اردو کو انگریزی کی سطح پر لانے کے لئے علمی کام کئے جائیں اشد ضروری ہے۔ حکومت سے ہماری مودبانہ درخواست ہے کہ اس میں تاخیر نہ کرے۔ مگر کمیشن مقرر کرنے کی تجویز میری ناقص رائے میں معاملہ کو پھر التوا میں ڈال دے گی۔ زبان کے معاملہ میں بہت کچھ سوچا جاچکا ہے اب عمل ہونا چاہئے۔

انجمن پنجاب کی کارکردگی کا رئیس الکلیہ نے اپنے خطبوں میں کئی مرتبہ ذکر کیا۔ میں سمجھتا ہوں اب بھی بدقسمتی سے ملک میں وہی حالات موجود ہیں جن میں انجمن پنجاب علوم مشرقی کی ترویج کے لئے کوشاں تھی۔ اب بھی انجمن پنجاب جیسے ادارے کی ضرورت ہے جو مستعدی اور زور سے علوم مشرقی کا ہاتھ پکڑے اور ان کی تعلیم و ترویج کا انتظام کرے۔ ارباب اقتدار کی طرف سے اب بھی ان علوم کی طرف کافی بے اعتنائی ہے۔ ان حالات میں میری یہ درخواست غیر مناسب نہ ہوگی کہ انجمن پنجاب کو پھر زندہ کیا جائے۔ علوم مشرقی کے دوستوں کو اس حلقے میں جمع کیا جائے اور ڈاکٹر لائٹنر جو اس کالج کے بانی اور پہلے پرنسپل تھے کے نقش قدم پر آپ اس کی قیادت کو اپنے ہاتھ میں لیں۔

حضرات میں نے اپنے خیالات مختصراً آپ کے سامنے پیش کئے ہیں۔ مجھے یہ سنکر دلی رنج ہوا کہ قوم کی قدیم اور عظیم درسگاہ کو اس امن اور سکون کی فضا میسر نہیں۔ جو علمی کاموں کے لئے اشد ضروری ہے۔ میری دعا ہے کہ خدائے برتر اس دانش گاہ میں امن اور سکون کی فضا پیدا کرے جس میں آپ کے دانشکدہ کی علمی روایات پھلیں پھولیں اور اپنے انوار سے اس ملک کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کو منور کریں۔

پیغامات

جو

یونیورسٹی اورینٹل کالج کے سالانہ جلسہ

۱۹۵۶ء کے موقع پر موصول ہوئے

جناب میاں بشیر احمد صاحب ، بار ایٹ لا مدیر ہمایوں

یونیورسٹی اوریئنٹل کالج لاہور جو پنجاب یونیورسٹی کا قدیم ترین کالج ہے ہمارے نئے حالات اور قومی ماحول میں ہماری دلی توجہ اور اعانت کا مستحق ہے -

اس کالج کی علمی اور ثقافتی خدمات کسی تعارف کی محتاج نہیں - السنہ مشرقیہ بالخصوص عربی فارسی کی اہمیت اور ہماری قومی و ثقافتی زبان اردو کی مخصوص حیثیت اس امر کی متقاضی ہے کہ ہم اوریئنٹل کالج سی مفید درسگاہ کو اور زیادہ مفید بننے کا موقع دیں -

پاکستان کے اسلامی تصورات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے لازم ہے کہ عربی ، فارسی اور اردو کے علمی و ادبی سرمایہ میں حتی المقدور اضافہ کیا جائے -

اس سلسلے میں اوریئنٹل کالج میں قومی زبان کی ایک اعلیٰ درجے کی اکادمی قائم ہونی چاہئے جو مسلسل طور پر اردو علم و ادب کا جائزہ لیتی رہے اور اسے ہر طرح ترقی دینے کے منصوبے تیار کرکے یونیورسٹی اور حکومت کو ان پر عمل درآمد کرنے کی طرف متوجہ کرتی رہے -

* *

جناب ڈاکٹر رضی الدین صدیقی

ام - اے - پی ایچ - ڈی

مجھے یہ معلوم کرکے بے حد مسرت ہوئی کہ اوریئنٹل کالج لاہور کا سالانہ اجلاس قریب میں منعقد ہو رہا ہے - چند ماہ قبل اس کالج کے یوم تأسیس کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے میں نے السنہ شرقیہ کی اہمیت اور اس سلسلہ میں کالج کی گران قدر خدمات کا اعتراف کیا تھا - آج بھی میں اس کالج کے تمام کارکن اصحاب کی خدمت میں نذر عقیدت پیش کرتا ہوں اور انہیں یقین دلاتا ہوں کہ کالج کی ترقی اور السنہ مشرقیہ کو فروغ دینے کے معاملہ میں میری بہترین خواہشات اور مخلصانہ دعائیں ان کے ساتھ ہیں -

ہماری تاریخ اور ہمارے تمدن کا بہترین سرمایہ عربی اور فارسی میں

قلمبند ہے اس سرمایہ کا تحفظ اور ان زبانوں کے ماہرین کا تیار کرنا اس لئے بھی نہایت ضروری ہے تا کہ قوم و ملت کی تاریخی اور تمدنی روائتیں موجودہ اور آیندہ نسلوں کے علم میں رہیں۔

اردو زبان ہماری قومی اور ملکی زبان ہے اور اسکی ترقی کے سلسلے میں اوریئنٹل کالج جسقدر بھی کوشش کرے کم ہے مجھے یقین ہے کہ کالج کے ارباب مقدر ان مسائل پر پوری توجہ مبذول کر رہے ہونگے۔ میں صدق دل سے دعا کرتا ہوں کہ خداوند کریم انکی کوششوں کو بار آور فرماوے۔

* *

جناب ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی ایم۔اے۔پی ایچ۔ڈی

پروفیسر عربی کلکتہ یونیورسٹی

دنیا کی سیاسی اور ثقافتی تاریخ میں علی‌العموم اور مشرق کی تاریخ میں علی‌الخصوص علوم اسلامیہ کو جو اہمیت حاصل ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان ہی علوم پر قرون وسطیٰ کے تہذیب و تمدن کی بنیاد پڑی اور ان ہی علوم کے اساس پر تہذیب جدید نے نشو و نما پائی۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزوں نے جب ہندوستان میں اپنی سلطنت قائم کی تو ان علوم کی تدریس و ترویج کے لئے مختلف حصوں میں درسگاہیں بھی قائم کیں۔ ان میں سے ایک اہم درسگاہ لاہور کا اوریئنٹل کالج ہے۔ یہ کالج پنجاب یونیورسٹی کی تاسیس سے قبل ہی قائم کیا گیا تھا۔ اور اسکے قیام کے لئے پنجاب کی بہترین دیسی ریاستوں نے اپنے اپنے خزانوں سے بڑی بڑی رقمیں پیش کی تھیں اور جہاں تک مجھے معلوم ہے یہی رقمیں بعد میں پنجاب یونیورسٹی کے قیام میں ممد ہوئیں۔

اس درسگاہ نے اپنے قیام کے بعد ہی وہ اہمیت اختیار کر لی جو قرون وسطیٰ میں بغداد کے مدرسہ نظامیہ کو حاصل تھی۔ اس میں مولانا فیض الحسن سہارنپوری مرحوم اور مفتی عبداللہ ٹونکی جیسے مایہ ناز علما و فضلا مختلف اوقات میں درس دیتے رہے اور ملک کے دور دراز حصوں سے شائقین علم یہاں آ آ کر اس چشمہ فضل و کمال سے سیراب ہوتے رہے اور اس سے

فیضیاب ہو کر ملک کے مختلف حصوں میں علم و فضل کی روشنی پھیلاتے رہے ۔

اس درسگاہ کے زیر اثر ملک کے دور دراز حصوں میں اسکے نمونہ پر علوم اسلامیہ کی تعلیم اور ترقی کے لئے نئے نئے علمی ادارے قائم کئے گئے ۔ چنانچہ سندھ کا مدرسہ ، مدراس کا محمڈن کالج اور وہاں کی دوسری درسگاہیں اور الہ آباد کا بورڈ آف اوریئنٹل اگزامینیشن اور دیگر ادارے اس کے نمونہ پر قائم کئے گئے ۔ اور سنکڑوں قدیم طرز کے مدارس بھی قائم ہوئے لیکن ان سبھوں کے باوجود اوریئنٹل کالج کی خصوصیات اس کے ساتھ رہیں ۔ اور یہ کالج اپنی جگہ پر دن دونی رات چوگنی ترقی کرتا رہا ۔

ملک کی تقسیم اور پاکستان کے قیام کے بعد اسکی اہمیت اور بھی بڑھ گئی اور اب ضرورت ہے کہ کالج کے مقصد عالی کی تکمیل کے لئے اسکے دائرہ عمل کو زیادہ وسیع کیا جائے اور اسکو پاکستان کی روز افزوں ثقافتی اور علمی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے استعمال کیا جائے۔

* *

جناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری ۔ زور ایم ۔ اے ۔ پی ایچ ۔ ڈی
پروفسر اردو عثمانیہ یونیورسٹی ، حیدرآباد

یہ معلوم کرکے مسرت ہوئی کہ جناب ڈاکٹر بشیر احمد صاحب سابق وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی جیسے عالم و فاضل کے زیر صدارت بر صغیر ہند و پاکستان کے واحد اوریئنٹل کالج کا سالانہ اجلاس منعقد ہو رہا ہے ۔ اس کالج کا نام اور کام ہند و پاکستان میں اس کی عظیم الشان علمی و ثقافتی خدمات کے باعث عزت و احترام سے دیکھا جاتا ہے ۔ اس نے علم و فضل اور تحقیق و ثقافت کی جو روایات قائم کی ہیں وہ کسی بڑی سے بڑی درسگاہ کے لئے بھی قابل فخر اور باعث رشک سمجھی جائینگی ۔

عہد حاضر میں علوم مشرقیہ کو خاص طور پر اہمیت حاصل ہوگئی ہے اور تمام ترقی یافتہ ممالک کے ساتھ ساتھ امریکہ اور روس جیسی مملکتوں میں بھی مشرقی علوم و ثقافت کے لئے نئے نئے ادارے قائم کئے جا رہے ہیں اور پرانے اداروں میں بھی ان کو روشناس کیا جا رہا ہے ۔

نہ صرف سیاسی بلکہ ثقافتی اور سماجی ضروریات کے لحاظ سے بھی علوم مشرقیہ کی اہمیت ہر جگہ محسوس ہو رہی ہے ۔ ہندو پاکستان کی آزادی کے بعد ان ملکوں میں بھی اس کی طرف بطور خاص توجہ کرنے کی ضرورت ہے اور کی جا رہی ہے ۔ ایسی صورت میں اورینٹل کالج بہت کام کر سکتا ہے اور ممکن ہے کہ اس سے وہ کام لیا جائے گا ۔ اور اس کی اہمیت کو محسوس کیا جائے گا ۔ لاہور کے مغربی پاکستان کا دارالخلافہ بن جانے کے بعد تو اس کالج کو سالیان سال ترقی کرنا چاہئے اور ایک ایسی نمونہ کی درس گاہ علوم مشرقیہ بن جانا چاہئے جسکو سامنے رکھ کر ایشیا کے دوسرے بڑے شہروں میں بھی درسگاہیں اور ادارے قائم ہوسکیں ۔ لاہور کے اورینٹل کالج نے اب تک جو خدمات انجام دی ہیں وہ بجائے خود ایسی ہیں کہ ان کی نظیر کم ہی نظر آتی ہے لیکن موجودہ حالات اور رفتار ترقی کے پیش نظر ضرورت ہے کہ اس کے کاموں کو اور آگے بڑھایا جائے اور ایسی سہولتیں فراہم کی جائیں کہ یہ کالج علوم مشرقیہ کی اور خود اپنے ملک کی خدمت کرنے میں زیادہ سے زیادہ حصہ لے سکے ۔

اورینٹل کالج کی سالانہ رپورٹ دیکھنے کے بعد ہر صاحب نظر یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ اس کی طرف سے اردو کا اعلیٰ تحقیقی ذوق پیدا کرنے کا جو کام ہو رہا ہے وہ ایسا اچھا ہو رہا ہے کہ اس کی قدر کرنی چاہئے اور اس کے اعتراف کے طور پر اور وقت کے تقاضے کے لحاظ سے اس میں ایک اردو اکیڈمی کا قیام ناگزیر ہے ۔ یہ کام اس کالج میں جتنا مناسب اور اطمینان بخش انجام پائے گا شاید ہی کسی اور جگہ ہوسکے ۔ پاکستان کی قومی زبان کے لئے اس وقت ایک اکیڈمی کا قیام ازبس ضروری ہے اور یہ اکیڈمی اورینٹل کالج ہی میں کامیابی کے ساتھ چل سکے گی ۔

یقین ہے کہ یہ کالج ایسی ترقی کرتا جائیگا کہ اور علوم مشرقیہ کے دلدادہ ، خواہ وہ کسی ملک میں ہوں اس کے کاموں سے استفادہ کرتے رہیں گے ۔

*　　　　*

جناب مولانا عبدالمجید سالک
مسلم ٹاؤن - لاہور

پنجاب یونیورسٹی کا اورینٹل کالج ہمارے اس جذبے کی یادگار ہے جو ہم ابتدائے عہد فرنگ میں السنہ مشرقیہ کے متعلق رکھتے تھے۔ عربی و فارسی علوم کی انتہائی مقبولیت ہی تھی جس نے اس زمانے میں ارباب اختیار کو اس کالج کے قیام پر مجبور کردیا تھا۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ اس کالج نے روز اول سے آج تک اپنے مفروضہ کام کو انتہائی خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ بڑے بڑے اکابر علم اس میں تعلیم و تدریس کی مسند آراستہ کرتے رہے اور مسلمانوں کی علمی و ثقافتی خدمات بوجہ احسن بجا لاتے رہے۔ اس کے طلبا نے صدہا مقالات لکھے، بے شمار کتابیں تالیف کیں اور ہمارے سرمایہ علمی کے تحفظ میں غیر معمولی سرگرمی کا ثبوت دیا۔ پاکستان قائم ہو جانے کے بعد یہ امر پہلے سے زیادہ ضروری ہوگیا ہے کہ ہم عربی اور فارسی کے ثقافتی سرمائے کی بقا و ترقی پر زیادہ توجہ کریں۔ اور اس کام کے لئے اورینٹل کالج کو تقویت دیں۔ جو اسکی بہترین اہلیت رکھتا ہے۔

اس کے علاوہ اب تو یہ ضرورت بھی شدت سے محسوس کی جا رہی ہے کہ پاکستان کی قومی زبان کے سلسلہ میں ایک گرانقدر اور مؤثر اکیڈمی قائم کی جائے اور وہ بھی اورینٹل کالج ہی کے سپرد کی جائے اور قومی زبان کے تمام حامی کالج کو اپنا بہترین تعاون پیش کریں۔

اورینٹل کالج کی طرف سے تغافل اختیار کرنے کے بجائے اب اس پر زیادہ توجہات صرف ہونی چاہئیں کیونکہ نئے حالات میں اس کی ضرورت پہلے سے بہت بڑھ گئی ہے۔

* *

جناب مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی ایم - اے
پرنسپل مدرسہ عالیہ کلکتہ

مجھکو یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی ہے کہ اورینٹل کالج لاہور کا سالانہ اجتماع اس مہینہ کی ۲۰- تاریخ کو جناب ڈاکٹر بشیر احمد

صاحب کی صدارت میں منعقد ہو رہا ہے ۔ اے کاش میں اس جلسہ میں شریک ہوسکتا اور بالمشافہ اپنے اس تعلق کو ظاہر کرتا جو مجھکو مشرق کی اس عظیم در درس گاہ علوم شرقیہ کے ساتھ رہا ہے اور ہے ۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اورینٹل کالج کا ماضی نہایت عظیم الشان رہا ہے ملک میں عربی فارسی کی تعلیم کا ماحصل کتب درسیہ نظامیہ پڑھنے پڑھانے اور انہیں کی دنیا میں بند رہنے سے زیادہ نہ تھا ۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جو طلبہ عربی ، فارسی یا اردو میں ایم ۔ اے کرتے تھے ان کا ان زبانوں کے ساتھ تعلق صرف امتحان کے پاس کرنے تک رہتا تھا ۔ ہندوستان میں اورینٹل کالج ، لاہور ، سب سے پہلی درس گاہ ہے جس نے عربی فارسی تعلیم کے قدیم و جدید دونوں طبقوں میں ریسرچ کا سنجیدہ اور شگفتہ ذوق پیدا کیا اور اس طرح ایک اچھا خاصا گروہ ایسا پیدا کردیا جس نے اسلاف کے بیش بہا ترین علمی ذخائر کا کھوج لگا کر ان کو حسن سلیقہ کے ساتھ مرتب و مہذب کیا اور شائع کر کے عام کردیا ۔ اس سے ہم کو جہاں علمی فوائد حاصل ہوئے ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوا کہ قوم میں اپنے تہذیبی مسائل پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کا سلیقہ پیدا ہوگیا اور جذباتیت پر علمی طریق فکر کا غلبہ ہوگیا ۔

اورینٹل کالج لاہور نے یہ عظیم الشان کام اس وقت کئے ہیں جبکہ انگریزوں کا دور حکومت تھا ۔ لیکن اب جبکہ ملک آزاد ہے اور وہاں ایک قومی حکومت قائم ہے اورینٹل کالج کا وجود پہلے اگر ضروری تھا تو اب اشد ضروری ہے اور اس کی کوششوں اور سرگرمیوں کا میدان اگر محدود تھا تو اب وسیع تر ہونا چاہئیے ۔ آج کل کی دنیا میں ایک قوم کی عظمت کا پیمانہ خود اس کا کلچر ہوتا ہے ۔ جو قوم جس قدر اعلیٰ ، بلند اور ہمہ گیر و جاذب کلچر کی حامل ہوگی تاریخ کے دربار میں اسکو اسی تناسب سے عظمت و بزرگی کا حصہ ملیگا ۔ اسلامی کلچر سے متعلق اس کام کو کرنے کا حق بحیثیت ایک دانشگاہ کے اورینٹل کالج لاہور کے سوا اور کس کو ہوسکتا ہے اور اس بنا پر حکومت کی توجہ خاص و اعتنا

کا اس بارہ میں استحقاق جتنا اس درسگاہ کو ہوسکتا ہے کسی اور کو مشکل سے ہوگا۔

ضرورت اس کی ہے کہ کالج کے ساتھ ساتھ ایک مستقل مجلس تحقیقات بھی قائم ہو تا کہ علمی و تحقیقی کوششیں ایک مرکز کے ساتھ وابستہ ہوکر زیادہ وسیع، گہری اور پائدار ہوسکیں اور ان کے ذریعے سے ملک کی قومی زبان کا خزانہ علم و تحقیق کے انمول جواہر سے بر ہو کر اس قابل ہو جائے کہ وہ دنیا کی اعلیٰ ترقی یافتہ زبانوں کی صف میں اپنے لئے نمایاں مرتبہ و مقام حاصل کر سکیں۔ مجھکو یقین ہے کہ ایک غیر قومی حکومت کے زیر سایہ عاطفت اگر اس درسگاہ کا ماضی شاندار رہا ہے تو اب خود قومی حکومت کے سایہ اقبال و توجہ میں اس کا حال شاندار تر اور مستقبل شاندار ترین رہیگا۔ خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔

*　　　　*

جناب پروفسور آقای سعید نفیسی استاد دانشگاه طهران

روز ۲۵ - مارچ که هشتاد و شش سال از تاریخ تأسیس اوریئنٹل کالج دانشگاه پنجاب در لاهور خواهد گذشت از تاریخ مطالعات شرقی در سبه قاره هند و پاکستان روزی میمون و فرخنده خواهد بود در سراسر کشور های اسلامی هشتاد و شش سال تمام دانشمندان و دانش پروهان از فواید و غنایم گوناگون که ازین بنگاه بزرگ دانش بر خورد و بزرگ و پیر و جوان رسیده است و دل و جان خود را از فروغ تابناک آن روشن کرد و نیرو بخشیده‌اند و بهره برده اند۔

در ایران ما کمتر کسی هست که ازین خوان نعمت بی دریغ برخوردار نشده باشد۔ درین مرکز بزرگ دانش و ادب هشتاد و شش سال بسیاری از بزرگان جهان دانش اسلامی چون مرحوم علامه محمد اقبال رضوان الله علیه و چون مرحومان پروفسور محمود شیرانی و دکتر محمد اقبال و محمد حسین آزاد و دکتر لاکشمان سروپ و دکتر ا۔ ث۔ ولنر که روان شان تا جاودان‌شاد باد و استاد بزرگ خان بهادر مولوی دکتر محمد شفیع هر یک نوری دیگر بر جهان دانش تافته اند۔ سلسله انتشارات آن امروز زینت

بسیاری از کتابخانهای جهان ست بشش از سی سال اوریئنٹل کالج میگزین که همیشه مشحون از فواید علمی گونا گون بوده است از پر تو افشانی بر عالم علم و ادب دریغ نه کرده و بسیاری از متون مهم زبان تازی و زبان پارسی و زبان اردو را بهترین روسی بر ما بخشیده است - اینک بمناسب هشتاد و شش سالگی تاسیس این نگاه اعلمی بزرگ من از جانب دانشمندان و دانش پروران ایران که همواره ریزه خوار این درسگاه علم و معرفت بوده از این تاریخ را بهسگاه دانشمندان و دانشجویان که امروز در آنجا بافاضهٔ معرفت مشغولند و روان پاک گذشتگان شان تبریک می گویم و دوام و بقا و کامیابی این مرکز علمی مهم پاکستان را از ایزد دانش آفرینی مصلحت دارم -

*　　*

مولانا صلاح الدین احمد مدیر ادبی دنیا

اگرچہ فرنگ کی ظاہری سیاسی غلامی سے ہم آزاد ہو چکے ہیں لیکن اسکی ذہنی اور تہذیبی غلامی میں آج ہم پہلے سے زیادہ گرفتار ہیں اور اس وقت جو نسلیں پروان چڑھ رہی ہیں ان کی ذہنی اور روحانی غلامی ہماری غلامی سے بھی شدید تر ہوگی اور وہ وقت بہت قریب آ رہا ہے جب ہم صرف فرنگ کی آنکھوں سے دیکھینگے ، اسی کے کانوں سے سنیں گے اوراسی کے خوان کرم کے ریزوں میں اپنی زندگی کی عسرتوں کا مداوا تلاش کرتے رہیں گے -

یہ دور ہماری تاریخ کا سب سے مہیب اور بھیانک دور ہوگا - اور اگرچہ شاید ہم بظاہر جی رہے ہوں گے لیکن ہماری اصل کیفیت ان کٹھ پتلیوں کی سی ہوگی جو ایک ماہر تماشہ گر کی ڈوریوں سے بندھی ہوئی اسی کے اشارے پر چند بے روح حرکتیں کرکے موت کی نیند سو جاتی ہیں -

اگر ہم اس دور کو قریب سے قریب تر نہیں لانا چاہتے تو ہمیں اپنی ان علمی قندیلوں کو پھر سے فروزاں کرنا ہوگا - جنہیں فطرت کی فیاضیوں نے ہماری رہنمائی کے لئے آج سے ہزاروں برس پہلے روشن کر دیا

تھا - لیکن جنہیں ہم مغرب کی چکا چوند سے متاثر ہوکر خود بخود گل کر چکے ہیں ـــــ آؤ کہ ان کے فروغ نو سے ہم پھر اپنا جادۂ منزل روشن کریں کہ مانگے کی روشنی ہمیں اپنے مقدر کی تلاش میں کب تک مدد دے گی ـــ؟

* *

بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب

اورینٹل کالج لاہور علوم و السنہ مشرقیہ کی ترقی و ترویج کے لئے قائم کیا گیا تھا اور اس مقدس خدمت کو وہ تخمیناً ۸۶ سال سے بڑی سرگرمی اور خوبی سے انجام دے رہا ہے - اس کالج کا فیض صرف پنجاب تک محدود نہ تھا بلکہ تمام برعظیم بھارت و پاک بلکہ اس سے باہر تک جاری رہا - اس کے اساتذہ میں ایسے فضلائے یگانہ گذرے ہیں جن کے فضل و کمال کی شہرت سنکر دور دور سے مستعد طلبہ کھنچ کھنچ کر لاہور پہنچتے تھے اور ان کے درس میں شریک ہونا باعث فخر سمجھتے تھے اور یہ انہی اساتذۂ باکمال کا فیض تھا کہ اس عظیم درسگاہ سے ایسے طالب علم فائز ہوکر نکلے جن کے نام اپنی علم و فضل کی وجہ سے ہماری تعلیمی اور ادبی تاریخ میں ہمیشہ درخشاں نظر آئیں گے - یہ امر موجب مسرت ہے کہ سنت قدیم اب تک جاری ہے اور کالج کے فاضل پرنسپل اور پروفیسر صاحبان تدریسی اور تحقیقی کام پورے شغف سے انجام دے رہے ہیں - لیکن اسی کے ساتھ میں افسوس کے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس زمانے میں خصوصاً تقسیم کے بعد اس درسگاہ کی طرف وہ توجہ نہیں کی گئی جس کی یہ مستحق ہے - یہ ہماری ان چند درسگاہوں میں سے ہے جن پر ہمیں فخر ہے - اور حقیقت یہ ہے کہ پنجاب کو یونیورسٹی اسی کے طفیل میں ملی تھی - ایسے زمانے میں جب کہ ایشیا و یورپ کے ممالک میں اسلامی علوم والسنہ کی طرف خاص طور پر توجہ کی جا رہی ہے اورینٹل کالج لاہور کی طرف سے بے اعتنائی معصیت ہے -

اب حالات اس کے مقتضی ہیں کہ کالج کے موجودہ شعبوں کو توسیع دی جائے اور خاص طور پر قومی زبان کی ترقی اور ترویج کے لئے ایک تحقیقی ادارہ یا اکاڈمی قائم کی جائے جو پنجاب یونیورسٹی اور اس کالج کی شان کے شایان ہو ۔ اوریئنٹل کالج کا یونیورسٹی پر بہت بڑا حق ہے اور اس کا حق ادا کرنا یونیورسٹی پر لازم ہے ۔

*   *

جناب (ڈاکٹر) عبدالستار صدیقی ایم ۔ اے ۔ پی ۔ ایچ ۔ ڈی

سابق پروفیسر عربی الٰہ آباد یونیورسٹی

اوریئنٹل کالج کی چھیاسویں سال گرہ کے مبارک موقع پر یہ تہنیت کا پیام بھیجنے کی عزت حاصل کر رہا ہوں ۔

مشرقی علوم و السنہ کے اس قدیم تعلیمی ادارے کے قائم ہوتے ہی نہ صرف پنجاب میں بلکہ سارے ملک ہند میں اس کی عظمت کا غلغلہ بلند ہوا ۔ ملک کے ہر گوشے سے نکل نکل کر علم کے تشنہ کاموں نے لاہور کا رخ کیا ۔ ان میں وہ بھی تھے کہ کسی اور درسگاہ سے اعلیٰ سند حاصل کر لینے کے بعد بھی لاہوری اوریئنٹل کالج کے نامی اساتذہ سے فیض حاصل کرنا علم و فن کی تکمیل کے لئے ضروری جانتے تھے ۔ اور حصول کمال کے بعد اپنے اپنے وطن واپس آ کے درس و تدریس اور علمی کاموں میں مشغول رہے اور بالآخر استاذ اور محقق اور مصنف کی حیثیت سے مشہور ہوئے ۔ اس کالج کے نقش قدم پر پنجاب سے باہر بھی متعدد درسگاہیں قائم ہوگئیں جنھوں نے اس کالج کے نصاب تعلیم کو اختیار کر کے جامعہ پنجاب سے اپنا الحاق کیا ۔ اور یہ صورت اس وقت تک رہی جب تک کہ حکومت ہند نے (۱۹۰۳ء کی تجویز کے مطابق) ہر یونیورسٹی کے دائرہ عمل کو محدود کر کے ایسے الحاق کو ناممکن نہ بنا دیا ۔ مگر اس پر بھی اوریئنٹل کالج لاہور کا نصاب مقبول رہا ۔ اور آج بھی اس کی سندیں بڑی وقعت رکھتی ہیں ۔ آج بھی مشرقی علوم کے قدر شناس نہ صرف پاکستان اور

هندوستان بلکه مغربی ممالک کی درسگاهوں میں اس اوریئنٹل کالج کی علمی خدمتوں کے معترف اور مدّاح بہت اچھی تعداد میں موجود هیں جو اس کی ترقی کے دل سے خواهاں هیں -

هندوستان کی یونیورسٹیوں نے مشرقی علوم کے امتحانوں کی ضرورت کو عموماً تسلیم کر لیا هے - اور کئی یونیورسٹیوں نے مشرقی علوم کی تعلیم و تحقیق کے لئے خود بھی ایک مستقل مشرقی شعبہ یا ادارہ قائم کر لیا هے - خوش نصیب هے جامعه پنجاب که اسکا مدرسه مشرقیه ان سب کا پیش رو اور رهنما هے -

اوریئنٹل کالج لاهور کے فضلا نے هر دور میں قابل قدر کتابیں تصنیف کیں - ان کے علاوہ پچھلے اکتیس برس سے کالج کا مؤقر مجلہ ''اوریئنٹل کالج میگزین'' کے نام سے نکل رها هے جس کے مقالوں کا معیار نہایت بلند هے اور جسکی جلدوں کے طویل سلسلے میں علمی تحقیق و تدقیق کا ایک بیش بہا اورگران قدر خزانہ محفوظ هے - اس خزانے کے بانی پروفیسر محمد شفیع ، سابق پروفسر عربی و صدر اوریئنٹل کالج هیں جن کا تبحّر اور ذوق صحیح اس مجلے کے معیار کی بلندی اور خوبی کا سالہا سال ضامن رها هے - همیں خدا کا شکر بجا لانا چاهئے که موصوف باوجود کبر سن کے بفضله اب تک علم و تحقیق کے میدان میں جوانوں کے دوش بدوش زور آزمائی کر رهے هیں - ان جوانوں کے تیار کرنے کا سہرا بھی انہیں کے سر هے اور یقین کے ساتھ کہا جا سکتا هے که یه خلیف ، حال اور مستقبل کے درمیان اچھے خلیف ثابت هوں گے - اور کالج اور اسکے کارناموں کو نه صرف برقرار رکھیں گے بلکه اسے رو به ترقی رکھنے میں پوری طرح کامیاب رهیں گے -

اس دعا از من و از جمله جہاں آمین باد

* *

جناب قاضی عبدالودود صاحب بار ایٹ لا پٹنہ

آپ کا خط مؤرخہ ۸ - مارچ ۵۶ء ابھی ملا ، دیر اس وجہ سے ہوئی کہ آپ نے اسے میرے پرانے پتے سے بھیجا ہے - آپ کی خواہش ہے کہ میرا جواب آپ کو ۱۵ - مارچ تک موصول ہو جائے۔ میں ہوائی ڈاک سے خط بھیج رہا ہوں ، لیکن اس پر بھی اس کا امکان کم ہے کہ وقت مقررہ کے اندر آپ تک پہنچ سکے -

اورینٹل کالج نے مشرقیات کی جو گوناگوں خدمتیں انجام دی ہیں ، وہ کبھی فراموش نہیں کی جا سکتیں مگر اس کی ضرورت ہے کہ پاکستان کے ارباب اقتدار ایسی صورت پیدا کریں کہ اس کا شمار دنیا کے بہترین علمی مرکزوں میں ہو سکے اور اس سے مشرقی السنہ و علوم کی تعلیم کے علاوہ ، قدیم کتابوں کی ترتیب و تہذیب ، اور نشر و اشاعت کا کام لیا جائے -

امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا -

* *

جناب شمس العلما ڈاکٹر عمر بن محمد داود پوتہ عفی عنہ

ان وصلہ الدکتور السید محمد عبداللہ عمید الکلیہ الشرقیہ قد طلب الی ان ارسل الیہ بلاغا وجیزا فی العربیہ تذکارا لحفلہ السنہ السابعہ و الثمانین لہذہ الکلیہ و مع انی لست عارفاً بما قارب بہ ہذہ الکلیة من الأعمال الجلیلة و الخدمات الشریفہ التی أسدیتہا الی العلوم الشرقیة القدیمة و الحدیثة فی جمیع أطوارہا و ادوارہا فلا بد من ان أعبر عن بعض أفکاری فیہا بکمال الحریة غیر خائف لومة لائم .

ان المقاصد السنیة التی أسست علیہا ہذہ الکلیة التی ہی أقدم من جامعة الفنجاب نفسہا لا تزال عاملة نافذہ و الاساتذہ لا یألون جہداً فی إجراء ہا فی المجاری النافعة و یستحقون کل الشکر و التحسین من ہذہ الناحیة و لکن الزمان قد دار دورتہ و أتی بمسائل جدیدہ لا بد من مواجہتہا بکل

جرءآه و شجاعة و علينا أن ند و رسعه، و الا سنبقى فى صف العال و نرى بكل أسف ان الا خرين قد سبقونا فى مضار الحياه ـ

و قد طالعت مناهج الدروس لسنى الشهادات التى تمحها هذه الكلية وهى لا بأس بها على أن المناهج لا تفى بحاجتنا اليوم إلا اذا نفخنا فيها روح الحياه التى تفقد فى مناهج هذه الكلية بل فى جميع مناهج الجامعة عنها أيضا ـ و قد شاهدت بنفسى عند ما امتحن الورائق فى العربية و الفارسية أو عند ما أفتش بعض المترشحين الذى حازوا على شهادات المنشئى الفاضل و المولوى العالم و غير ها أنهم لا يعرفون من آداب اللغه شيئاً ولا يقدرون ان ينشد وا أو يشر حوا بعض الا سعار التى قرأ وها من الكتب المفروضه عليهم ، دع عنك الكلام فى هدين اللسانين الكريمين .

أيدل هذا على أن المدرسين ليسوا بقادرين على حمل أعباء الدروس و نا دية الفرائض المنصبة أو على أن المعلمين ليس لهم كفاءه و استعداد للتعلّم و انما يريدون ان يحتازوا هذه الشهادات لكى تكون لهم سند اعلى كسب المعيشة ؟ و انى لا قول بكل صراحه ان المعلمين و المتعلمين كليهما مقصرون فى هذا الامر ولا سيما المتعلمين الذين لا يقتنون العلم حباله ورغبه فيه بل لكى يستخدموه لجر منفعتهم و لأجل المعاش و لهذا السبب قد كسدت سوق العلم و رفع العلماء الذين كانوا يضحون انفسهم فى سبيله ولا يبالون بزخارف الدنيا و مطامعها و اما الا جاده فى الكلام فانها موقوف على الممارسه فاذاكان الا ساتذه انفسهم غير قادرين على التكلم فكيف تحصل الملكه القوية فى المحصلين ـ

والعلاج الوحيد لهذا الداء العضال ان نغير زاوية أنظارنا بالتمام ونهئى الا سباب للمتعلمين بتعويد هم على بعض الصنايع المفيدة لكى يتخذ وها وسيلة لكسب معيشتهم و نعطى المدرسين رواتب لا ئقة لكى يكر سوا حياتهم لخدمة العلم و يبذ لوا جهود هم فى تعليم المتخرجين و تثقيفهم بالحرية والاستقلال بدون ان يلجئوا الى وسائل أخرى لنيل ما يسدّون به حاجاتهم ـ ولا أعنى بهذا أنه لا ينبغي للمتخرجين أن يتنافسوا

فی الحصول علی المناصب الحکومیه فانها مفتوحه لهم ۔ فلیتنافس فیها المتنافسون وایضا من الواجب علی الکلیه الشرقیه ان تنتخب الاساتذه الذین یمشون هدی الاسانید الاسلامیین و ان کانوا من أهلها وافضل و أوفق ۔

و منها یکن من الأمر فان الکلیه جدیده بالبناء والاستحسان و انی لا تمنی لها حیاه طیبه طویله مملوء بجلائل الاعمال و لأساتذتها نجاحا باهراً فی جمیع مساعیهم و لکن شعارها دائما ''الی الامام'' ۔

* *

جناب مولانا غلام رسول صاحب مہر

یونیورسٹی اورینٹل کالج کے تازہ سالانہ اجلاس پر میری طرف سے یہ خلوص قلب مبارک باد کا هدیه قبول فرمائیے ۔ یه کالج چھیاسی سال سے مشرقی علوم و السنه کی جو گراں قدر خدمات انجام دے رہا ہے ۔ ان کی تحسین کا حق چند الفاظ میں ادا نہیں ہو سکتا ۔ یہ تنہا سرکاری ادارہ ہے جس نے انگریزوں کے صد سالہ عہد حکمرانی میں شاندار ماضی سے ہمارا رشتہ استوار رکھا ۔ اگر آج ہمارے ہاں مشرقی علوم و السنہ کا چرچہ ہے تو اس میں سب سے بڑا حصہ اورینٹل کالج ہی کا ہے ۔ اس کالج نے دور حاضر کے انداز و معیار کے مطابق مشرقی علوم و السنہ کی ترقی کے لئے سلسلہ مساعی جاری رکھا اور یقینا اسی حالت میں یہ فرض انجام دیا جب اجنبی حکومت کے ماتحت پیدا شدہ حالات میں اس کالج کی تعلیم سے دنیوی ترقی کی زیادہ امیدیں وابستہ نہ کی جا سکتی تھیں ۔ اس کالج اور اس کے فاضل اساتذہ کی مساعی سے ہمارے علوم کے گہر ہائے شہوار لائبریری میں فراہم ہوئے اور آج ہمارے پاس ایسا ذخیرہ موجود ہے جو شائقین علم کے لئے بڑی حد تک اطمینان کا باعث ہو سکتا ہے ۔ یہی کالج ہے جس کے مسگرین اور تتمہ کے ذریعے سے قابل صدستائش علمی خدمات انجام پائیں اور بہت سے علمی نوادر محفوظ ہوئے ۔ کالج کی ان علمی و ثقافتی خدمات سے اختلاف کی جرأت کون کر سکتا ہے ۔ اگر خدا نخواستہ یہ ادارہ موجود نہ ہوتا تو کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ آج ہم اپنے ماضی سے کس درجہ بے بہرہ و بے خبر ہوتے ۔

میں ان لوگوں میں سے ہوں جن کا عقیدہ یہ ہے کہ کوئی قوم ماضی سے انقطاع کے بعد اپنی مستقل حیثیت قائم نہیں رکھ سکتی اور ماضی سے رشتہ استوار رکھنے کا ذریعہ اپنے علوم والسنہ کے تحفظ و ترقی کے سوا کیا ہے ۔ میں اجنبی زبانوں کی تحصیل کا مخالف نہیں اور نہ اس تحصیل کے فوائد کا منکر ہوں ۔ لیکن اجنبی زبانوں کی تحصیل صرف اس مقصد کے لئے جائز سمجھی جا سکتی ہے کہ ہم دوسروں کی علمی سرگرمیوں سے آگاہ رہیں اور اپنے علوم ثقافت کو دوسری زبانوں میں منتقل کرکے عالمگیری کی منزل پر پہنچائیں ۔ اگر یہ معین مقصد پیش نظر نہ رہے تو اس حقیقت کو فراموش نہ کرنا چاہیے کہ اجنبی تسلط کا دروازہ سب سے پہلے افکار و اخلاق ہی پر کھلتا ہے ۔ جس قوم کے دل و دماغ اور افکار و اخلاق اجنبی اثرات سے آلودہ ہو جائیں وہ اپنی آزادی بھی برقرار نہیں رکھ سکتی ۔ اس بنا پر ہمیں اپنے علوم والسنہ کی ترقی کے لئے زیادہ سے زیادہ کوشش کرنی چاہئے ۔ اگر خدا نخواستہ ہماری نوجوان صرف ان علوم والسنہ تک محدود رہیں جو انگریزوں کے عہد حکومت میں متداول تھے تو مجھے یہ کہنے میں باک نہ ہونا چاہئے کہ ان کا انتظام اجنبی ہم سے بدرجہا بہتر کر سکتے تھے ۔ ہم نے اپنی قوم کو اپنے پیمانوں کے مطابق منازل اوج و ترقی پر پہنچانے کی غرض سے آزادی حاصل کی تھی ۔ یہ مقصد نہ تھا کہ آزادی کے بعد اجنبی علوم والسنہ کی اشاعت کا آلہ کار بنے رہیں اور اپنی مستقل حیثیت کے تحفظ پر متوجہ نہ ہوں ۔

آخر میں صرف ایک گذارش اور ہے اور وہ یہ ہے کہ ہمیں اورینٹل کالج کے زیر اہتمام اپنی قومی زبان کے لئے ایک شایان شان اکیڈمی قائم کر دینی چاہئے ۔ علمی و ثقافتی سطح پر احساس آزادی کا یہ پہلا عملی مظاہرہ ہوگا ۔ میں دوبارہ آپ کی خدمت میں ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں ۔ خدا کرے آپ حضرات کی کوششوں سے ہمارے علوم والسنہ جلد سے جلد اپنی تحقیقی حیثیت حاصل کرلیں ۔ آمین ۔

*　　　*

جناب پروفیسر نجیب اشرف ندوی

ھندوستان کے تعلیمی اور تحقیقی اداروں میں اورینٹل کالج لاھور کو ایک بلند مرتبہ حاصل ھے - ابتدائے قیام سے اس وقت تک وہ ایک علمی مرکز رھا ھے ھر عہد میں اسکے اساتذہ و طلبا نے قابل ستائش تحقیقی خدمات انجام دی ھیں ھماری ذھنی زندگی کا وہ بڑی حد تک ذمہ دار ھے اور ادھر تو اسکی تقریباً چھہل سالہ خدمات بہت ھی نتیجہ خیز رھی ھیں - ملک کے شاید ھی کسی ادارہ نے تعلیم کے ساتھ ھی ساتھ اتنی صحیح علمی خدمات انجام دی ھیں - اسلئے کیا یہ اچھا نہ ھوگا کہ اس ادارہ کو وسیع تر اور مستحکم تر بنا کر پاکستان میں اسے مشرقی علوم و فنون کا عموماً اور اسلامی ادب و ثقافت کا خصوصاً ایک مرکز بنایا جائے اور وہ ایسا سر چشمہ بن جائے جس سے سارے مشرق کے تشنگان علم و تحقیق اپنی پیاس بجھا سکیں - اتنا ھی نہیں بلکہ میں تو یہ کہنے کی جرأت کروں گا کہ اس ادارہ کے ساتھ ھی ساتھ اگر تصنیف و تالیف کیلئے ایک اکیڈیمی بھی قائم کردی جائے تو اسکی افادیت کو چار چاند لگ جائینگے - اس وقت خوش قسمتی سے اس میں جو ارباب علم و فضل جمع ھوگئے ھیں ان کی مخلصانہ کوششیں اس کی کامیابی کی ضامن ھونگی -

میری دلی دعا ھے کہ یہ فیض بخش ادارہ پھلتا پھولتا اور بڑھتا رھے -

* *

جناب سید ھاشمی فرید آبادی صاحب

آنجہانی لارڈ مورلے نے اپنے جامعہ اڈن برو کے مشہور خطبے میں یہ مدلّل نظریہ پیش کیا تھا کہ عہد حاضر میں قومیت کی بنیاد ''ھم زبانی'' پر قائم ھوتی ھے - اس سے مراد کسی ملک کی علمی اور سرکاری زبان کی وحدت ھے ورنہ برطانیہ اور فرانس جیسے ترقی یافتہ ملک اور وھاں کی متحد قوموں میں بھی کئی کئی زبانیں رائج ھیں حالانکہ ان کا الگ الگ رقبہ اور آبادی پاکستان کے نصف سے بھی کم ھے - نئی

جمہوریہ اسلامیہ پاکستان میں تشکیل قومیت کے اس اساسی کام کا سرانجام کرنا ہمارے اہل علم و خرد کے مقدم فرائض میں شمار ہوگا۔

قومی زبان کے فروغ و استحکام کے واسطے اسے جامعی تعلیم کا ذریعہ بنانا لازم ہے۔ ثانیاً علمی اور ادبی زبان کا معیار قائم رکھنے کے لئے کسی دبستان یا اکادمی کی تاسیس وقت کا ضروری تقاضہ معلوم ہوتی ہے۔ کراچی میں اردو یونیورسٹی بنانے کا منصوبہ تین چار سال سے انجمن ترقی اردو کی طرف سے پیش کیا جا رہا ہے۔ لیکن مجوزہ دبستان علمی کی بنا رکھنے کے لئے دارالملک لاہور سے بہتر مرکز خیال میں نہیں آتا۔ لاہور کو یہ افضلیت زیادہ تر اوریئنٹل کالج کی وجہ سے حاصل ہوئی جو ملک بھر میں علوم مشرق کی اعلیٰ تعلیم و تحقیق کی سب سے قدیم اور سب سے ممتاز درس گاہ ہے اس کے سالانہ جلسے کی مبارک تقریب میں پیغام تہنیت کے ساتھ میں یہ گذارش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ اس کالج کے اساتذہ اور کارفرما اگر اپنی قومی زبان کی اکادمی قائم کرنے کا مخلصانہ اقدام فرمائیں تو یہ ان کی روایات عالیہ کے عین مطابق ہوگا۔

میں اسی ضمن میں یہ عرض کرنے کی بھی جسارت کروں گا کہ بعض ناموافق حالات یا ایسی وقتی سرد مہری سے پریشان و بد دل نہ ہونا چاہئے جو حال میں علوم مشرق یا عالم اسلامی کی مسلمہ مشترک زبان عربی کے متعلق سنی گئی ہے۔ قوم کی رائے عامہ یقیناً مشرقی تہذیب و السنہ کے فروغ کی آرزومند ہے اور اس کے لئے ہر تحریک و سعی میں نہ صرف اہل پاکستان بلکہ بلا مبالغہ ساری دنیا کے ارباب علم و معارف کی تائید اور ہمدردیاں اوریئنٹل کالج کے مخلص کارکنوں کے ساتھ ہوں گی۔۔۔۔شاعر کی زبان میں۔

صادق ہے طلب تیری، تو ہر پاک مہم کا
مقبول سر آغاز ہے محمود سر انجام

* *

جناب حامد علی خاں صاحب
ایڈیٹر الحمرا ، لاہور

میرے لئے یہ اطلاع باعث مسرت ہوئی ہے کہ ۲۰ مارچ کو ڈاکٹر بشیر احمد صاحب کے زیر صدارت اورینٹل کالج کا سالانہ جلسہ منعقد ہو رہا ہے۔ اب ایک صدی ہونے کو آئی ہے جب سے یہ کالج جو ہماری یونیورسٹی کا اولین کالج ہے بر عظیم پاکستان و ہند کے دور دور تک کے علاقوں کی تعلیمی خدمات انجام دے رہا ہے۔ مشرقی زبانوں کی تعلیم سے بالخصوص وابستہ ہونے کے باعث یہی کالج ہماری قدیم تہذیبی اور ثقافتی روایات کی حفاظت بھی کرتا رہا ہے۔ ان روایات میں سے ایک اہم ترین روایت تعلیم کی ارزانی بھی تھی۔ اس نئی روشنی کے دور میں یہ پرانی روایت بہت بری طرح مٹائی جا رہی ہے۔ مگر مقام شکر ہے کہ اورینٹل کالج شدید زلزلوں کے باوجود اس روایت کو محفوظ رکھنے میں ابھی تک کامیاب رہا ہے۔

اورینٹل کالج انگریزی حکومت کے عہد میں مشرقی زبانوں کی تدریس کے لئے قائم ہوا تھا۔ خود انگلستان میں مشرقی زبانوں کی تعلیم اور تحقیق و تدقیق کے لئے ایک شاندار کالج موجود ہے۔ اس لئے کہ انگریز خود ان زبانوں کی اہمیت سے بیگانہ نہیں ہیں۔ تاہم ان سے توقع نہ ہو سکتی تھی کہ وہ انگریزی زبان کے مقابلے میں ہماری زبانوں کی سرپرستی کریں یہی وجہ ہے کہ ان کے عہد میں ہماری زبانیں برابر اپنے بلند مرتبے سے گرتی رہیں۔ اب اس بات کا اندازہ کرنا آسان نہیں کہ اس میں خود ہماری غفلت کا کتنا حصہ تھا۔ اور غیر ملکی حکومت کی بے اعتنائی یا مخالفت کا کتنا دخل تھا۔ مگر آزادی سے قبل ہم بڑی آسانی سے کہہ دیا کرتے تھے کہ ”غیر ملکی حکومت اور غیر مسلم ارباب تعلیم ہماری قومی زبان اردو۔ ہماری ثقافتی زبان فارسی اور ہماری مذہبی زبان عربی کی تعلیم اور ترقی کے راستے میں حائل ہیں“ آزادی کے بعد کیا صورت ہے اب ہم اپنی قسمت کے خود مالک ہیں۔ تعلیمات کا انتظام ہمارے ہاتھ میں ہے مگر ہماری قومی زبان اردو اور ہماری مذہبی و ثقافتی زبانیں یعنی عربی

اور فارسی اس اسلامی ملک میں پہلے سے بھی زیادہ کس مپرس نظر آتی ہیں۔ اوریئنٹل کالج جو انگریزوں نے قائم کیا تھا ابھی باقی تو ہے مگر اس کی جان ہزار آفت میں گرفتار ہے ۔ ہماری قومی زبان صرف نام کی قومی زبان ہے ورنہ اپنے ارد گرد جدھر نظر دوڑائیے ہماری غلامانہ ذہنیت کے طفیل آپ تمام کلیدی مناصب پر اب انگریزی زبان کی سیاست کو خود انگریزی عہد سے بھی زیادہ مضبوطی سے مسلط پائیں گے ۔

قومی زبان یا دیگر مسرقی زبانوں کی حمایت کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ ہم انگریزی یا دیگر مغربی زبانوں میں جمع شدہ علمی سرمائے سے منہ پھیر لیں یا ان زبانوں کی تعلیم سے روگرداں ہوجائیں ۔ ان زبانوں کو ہماری علمی خدمت کا پورا موقع ملنا چاہئے لیکن جیسا ہمارے موجودہ وائس چانسلر صاحب نے ایک موقع پر فرمایا تھا ہمیں یہ خیال ضرور رکھنا چاہئے کہ لونڈی گھر والی ہی نہ بن جائے۔ بدقسمتی سے اس وقت یہی صورت ہے کہ گھر والی تو لونڈی بنا دی گئی ہے اور لونڈی گھر کی ملکہ نظر آتی ہے ۔

یاد رکھئے ہمارے علم ۔ تہذیب اور ثقافت کی بنیاد ہماری قومی زبان ہے ۔ اگر آپ بنیاد کو کمزور رکھینگے تو اس پر خواہ کتنی بڑی اور شاندار عمارت آپ کھڑی کردیں وہ عمارت ناپائیدار ہی رہیگی ۔

اوریئنٹل کالج نامساعد حالات میں بھی ہماری تہذیبی و ثقافتی روایات کا پاسباں رہا ہے ۔ اس سے بے اعتنائی کرنا یا اسکی تخریب کے درپے ہونا اپنی تہذیب و ثقافت کی بنیاد کھودنے کے برابر ہے ۔ آزادی کے بعد ہمیں اپنے اس کالج کو ہر قسم کی ترقی دینے کی کوشش کرنی چاہئے ۔ ضرورت ہے کہ ایسے حالات پیدا کئے جائیں جنمیں اس کالج کے طلبہ اور اساتذہ اطمینان کے ساتھ اپنے تعلیمی مشاغل کو جاری رکھ سکیں اور اس کالج میں ایک ایسی اردو اکیڈمی قائم ہوسکے جو ارباب اختیار پر اردو کے وسیع امکانات کو واضح کر کے یہ ثابت کرسکے کہ اردو فوراً حکومت کی سرکاری زبان بننے کے قابل ہے یہ حکومتوں کی زبان رہ چکی

ھے اور اسے بیس سال تک کسی سرد گودام میں محفوظ کردینے کی ھرگز
ضرورت نہیں - اردو ھماری قومی خود داری کی علامت ھے - عربی اور فارسی
زبانیں ھماری عظمت رفتہ کی نقیب ھیں - ان سے بے اعتنائی اپنے قومی وجود
کا انکار ھے اپنی تاریخ سے بےاعتنائی ھے اور اپنی تہذیب اور ثقافت سے
روگردانی ھے -

*　　　*

Aqai Professor Dr. Ali Asghar Hekmat

I am very glad to learn from your esteemed letter of the 8th March, 1956, that on the 25th March of the current month your renowned College will go in celebrations, marking the 86th year of its very glamorous and exciting career. I am all the more pleased to find that the said auspicious occasion would not be allowed to go without bringing yet another academic laurel to this great College by recording the brief history and achievements of the College.

Indeed I am fully aware of the work of the Oriental College and have had the privilege of knowing some of its old benefactors very closely. The services which your College has rendered over several decades for the promotion and upliftment of the cause of Oriental learning, history and philosophy would be a source of pride for any academic (oriental) institution any where in the world. What is, however, most encouraging is that the Oriental College is not merely satisfied with its glorious past but seems at the present assiduously engaged in carving out a still brighter future for it. I wish you and your great colleagues all success and send you my best wishes.

جناب پروفیسر ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ

ایم - اے ، پی ایچ - ڈی ، ڈی - لٹ

میں اوریئنٹل کالج کے یوم تاسیس پر اس کی درازی عمر اور وسعت اثر کے لئے دست بدعا ہوں - آپ کو یہ دن منانے پر ہدیہ تہنیت پیش کرتا ہوں ، اور ارباب و حکام جامعہ سے متوقع ہوں اور ملتجی کہ پیش نظر اس عظیم کارنامہ کے جو کالج مذکور کے معلمین اور متعلمین کی فرد اعمال میں روشن و فروزاں ہے ، اس ادب خانہ اور علم گہ کو اور زیادہ فروغ ، امداد اور عزت کا مالک بنائیں گے -

مجھے بے حد خوشی ہے ، کہ اس ذی وقار کالج میں نہ صرف میں نے درس دیا بلکہ وہاں اپنے رہنمائے کار سے درس لیا بھی - یوں تو سب کی صحبت سے فقیر نے فیض اٹھایا ، مگر بالخصوص (مرحوم) ڈاکٹر ولنر (مرحوم) ڈاکٹر شیرانی (مرحوم) ڈاکٹر محمد اقبال ، ڈاکٹر محمد شفیع ، ڈاکٹر محمد باقر اور ڈاکٹر سید عبداللہ کے ذکر سے زبان اور دل کو سعادت مند بنانا چاہتا ہے -

> سے اس درس گہ کو رکھیو ابد تک ابر فشاں
> یا رب ہے تو ہی علم و ہنر کا نگاہباں

* * *

پروفیسر عبدالقادر سروری صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی

مجھے یہ سن کر مسرت ہوئی کہ اورینٹل کالج کا سالانہ جلسہ ۲۰ مارچ ۱۹۶۰ کو منعقد ہو رہا ہے - اس موقع پر میں ، ماضی میں کالج نے علوم مشرقیہ کی جو شان دار خدمات انجام دی ہیں ، انہیں سراہے بغیر نہیں رہ سکتا اور مستقبل میں اس کے عظیم تر امکانات کا اندازہ لگا سکتا ہوں -

اوریئنٹل کالج ، لاہور کے علمی اور تہذیبی کارنامے ، زمانہ ماضی میں نہایت شان دار رہے ہیں - اس کالج کے اساتذہ اور تلامذہ میں ایسے نام

ملے ھیں ، جنھوں نے عربی اور فارسی علم و ادب کی یادگار خدمات انجام دی ھیں ۔ اسی لئے علمی اور ثقافتی امور میں کالج کا نام اور کام کبھی بھلایا نہیں جا سکتا ۔ ''اورینٹل کالج میگزین'' نے ملک میں سنجیدہ فکر اور تحقیق کو ترقی دینے میں جو بیش بہا خدمت کی ھے ، وہ ھمیشہ باقی رھے گی ۔

مجھے امید ھے کہ کالج کے اس سالانہ اجتماع میں ، کالج کی فلاح اور ترقی سے متعلق بہت سے امور زیر غور آئیں گے ۔ اس موقع پر میری تجویز یہ ھے کہ عربی اور فارسی علوم اور ادب کو شایان شان طور پر ترقی دینے کے لئے اس کالج کو اورینٹل یونیورسٹی کے مرتبے تک ترقی دینے کے وسائل پر بھی غور فرمائیں ۔ عربی اور فارسی کے علاوہ ، سنسکرت کو بھی اس کے نصاب میں شامل کیا جا سکتا ھے ، کیونکہ اردو ، فارسی اور دوسری قدیم زبانوں کے تعلق سے اس کا مطالعہ نہایت مفید ثابت ھوگا ۔ لاھور مشرقی علوم و فنون کا ھمیشہ گہوارہ رھا ھے اور اورینٹل یونیورسٹی کے قیام کے لئے لاھور سے بہتر کوئی مقام نہیں ھو سکتا ، اور اورینٹل کالج اس یونیورسٹی کا مرکز ھوگا ۔ میں یہ تجویز اس لئے کر رھا ھوں کہ قومی ترقی کے لئے علوم مشرقیہ اور خاص طور پر عربی ، فارسی اور اردو کے مطالعے اور تحقیق کو جدید طریقوں کے مطابق ترقی دینا ضروری ھے ۔

اس کے علاوہ میری ایک تجویز یہ بھی ھے کہ قومی زبان کو صحت خصوصی اور عام مسلمہ اصولوں پر ترقی دینے کے لئے اورینٹل کالج ایک اچھا مرکز بن سکتا ھے ۔ اس کے لئے اس کے پیچھے شاندار روایات ھیں ۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے اورینٹل کالج میں آپ ایک اکیڈیمی قائم کریں ۔ ھر ایسے ملک میں ، جو اپنی قومی زبان کو ترقی دینا چاھتا ھے ، اس طرح کی اکیڈیمی قائم ھے ۔

مجھے امید ھے کہ آپ اور دوسرے ارباب حل و عقد ان تجویزوں پر سنجیدگی سے غور فرمائیں گے ۔ کالج کے سالانہ اجتماع کی کامیابی کے لئے میں دست بدعا ھوں ۔

C. A. Storey, 13 Lawrence Road, Hove 3, Sussex

Having long regarded myself as a beneficiary of the Oriental College, I take particular pleasure in acceding to your request that I should send a message to the College on the occasion of its eighty-sixth anniversary. For a considerable number of years the *Oriental College Magazine* was sent to me and I greatly appreciated the privilege of reading many well-informed and highly interesting articles published therein. The first fifteen volumes, complete and strongly bound, are now among my most valued possessions. Not all of the issues duly reached me, but I was able to obtain through a bookseller the few that failed to arrive. In the years of war few of the issues came through and in 1946 the supply ceased entirely. Having tried unsuccessfully to obtain the missing parts through a bookseller, I wrongly concluded that the *Magazine* had ceased publication and I felt that I must be among its most sincere mourners. Not until several years afterwards did I learn from a reference in *Islamic Culture* that the *Magazine* was still alive. Fortunately there now seems to be evidence that it will be more readily obtainable in this country and that its substantial contribution to Oriental learning will become more widely known in Europe.

The former members of the college staff whom you mention in your letter are indeed honoured names. Under the guidance of similar scholars in the future the college cannot fail to flourish and merit the good wishes of all Orientalists.

* * *

Alfred Master, Keeper of Modern Indian Books and Manuscripts, India Office Library, London

May I congratulate you and your colleagues on the 86th anniversary of the Oriental College of the Panjab University, which you are celebrating this year ?

Your College has a long tradition of sound scholarship, both in the Islamic and Indo-Aryan fields. Long may it continue !

Professor Kyuya Doi, Tokyo University, Tokyo, Japan

I send my hearty congratulations for the College Annual Day which had already been celebrated on March 25th. I am really sorry that I could not send my message in time as I was not at home at that time. Here I am sending my hearty congratulations for your 86th Annual Day although it is too late now. I am sorry to hear that your college had to encounter some difficulties these days while there is a great need for the Oriental studies in your country. Your country has just started as the Islami Republic and there is a great demand for study of Islamic culture and history. Your college had been fulfilling such an important duty as the unique institution which had devoted to oriental studies for a very long time. Indeed your college is the only supplier of professors and teachers of oriental studies to other universities and colleges in your country. It is a very queer thing to hear that your college had to come across a great difficulty while it is the very time for you to do your greatest service to the country.

On this occasion I should like to urge you to enlarge the scope of your research and teaching. As I told you at the meeting of the Urdu Department last year the oriental studies in Japan before the Great War meant only the Chinese studies and in India it meant the studies of various languages of its country and in your institution it means the study of Arabic, Persian and Urdu only. But after the War all the countries in the world were brought very near each other and every country is sincerely endeavouring to understand the neighbouring countries. India has opened the Ph. D. course for the oriental relations such as India and Japan, India and Ceylon, India and Burma etc, and some M. A. courses for Asiatic languages in the Banares Hindu University and the Santiniketan University. Russia has opened a special school for Urdu and Hindi. In Japan the meaning of the oriental studies had been extended very much. The Oriental Study Institute of the Tokyo University has begun its research of the Indonesia and Cambodian history. Urdu, Hindi, Indonesian and Siamese Departments are in full swing both in Tokyo and Osaka Universities of Foreign Studies, and there are some study institutes of Islamic culture and Arabic. In short, the sphere of the oriental studies are extended in every country. I was much pleased to hear that the University of the

Panjab is trying to open the Japanese course, but at the same time I was rather annoyed to hear that the Japanese course will be opened at the University Senate Hall and not at your college. There is no one who goes to the barber's to have his shoes repaired. The oriental studies can be well done only by such an institution which has the long history and experience in this sphere. From that point of view your college is the only one which can carry on that noble duty. I should rather say that if you will delay the oriental studies in wider scope it means as much the loss to your country. I hope you will soon have such Departments.

At the same time I should like to urge you to open the various language sections of your own country, such as Bengali, Punjabi etc. Until now the philological studies of such languages were mainly done by the Europeans and the studies were limited to a great extent. India is now endeavouring much and you also should not delay the studies of such languages and literature. We are expecting such activities at your college and are waiting for the good results. I hope to see some such articles in your magazine in the very near future and your college will become one of the biggest centres of oriental studies in wider scope not only in Pakistan but in the Asian countries.

Wishing you fruitful school year.

اسلوب نثر

معاملات و واقعات کے بیان ، خیالات کی ترجمانی اور جذبات و احساسات کی عکاسی ، غرض جملہ کیفیات و خیالات پر تبصرہ و تنقید کرنے کے لئے جو وسیلہ اختیار کیا جاتا ہے ، وہ زبان ہے ۔ زبان ایک لشکر کے مصداق ہے ، جس کے سپاہ الفاظ ہیں ۔ ادیب ایک سپہ سالار کیطرح نہایت احتیاط و مستعدی کے ساتھ ، اپنی الفاظ پر مشتمل فوج کو ، اپنی ضرورت کے مطابق کام میں لاتا ہے ۔ ادیب کا یہ عمل اصطلاحی زبان میں ابلاغ کہلاتا ہے ۔ یہ مفہوم ادا کرنے کیلئے ابلاغ کے علاوہ اظہار کا لفظ بھی مستعمل ہے ، لیکن بیان کا لفظ جسے بعض لوگ اسی عمل کو ظاہر کرنے کیلئے استعمال کرتے ہیں ، اس سے مختلف مفہوم کا حامل ہے ۔ بیان میں ہم جذبات و احساسات کو وصعی ناموں سے ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں ، لیکن اظہار یا ابلاغ میں بعینہ آن جذبات و احساسات کو پیدا کرنے کی سعی کیجاتی ہے ، جن کا اظہار یا ابلاغ مقصود ہوتا ہے ۔ ادب میں ابلاغ یا اظہار کی دو صورتیں ہیں ، ایک نظم یا شعر کہلاتی ہے اور دوسری نثر ۔ نظم اور نثر کی بالعموم یہ تعریف بیان کی جاتی ہے کہ نظم ''وہ کیفیت اظہار ہے جس‌میں وزن اور بحر کی باقاعدگی کا سختی سے خیال رکھا جاتا ہے اور نثر وہ صورت ابلاغ ہے جو وزن کی قیود سے آزاد ہے اور جسکی بحریں ہر ممکن حد تک متنوع ہوتی ہیں ۔ لیکن نظم اور نثر میں یہ اختلاف قطعی نہیں'' [1] کیونکہ یہ ضروری نہیں کہ وہ چند الفاظ جن کو قوافی ، بحور اور اوزان کی پابندی کیساتھ مصرعوں کی صورت دے دی جائے آن میں شعریت بھی ہو ۔ اور پھر ایسی نثر کا وجود بھی عنقا نہیں جو قافیہ ردیف بحر اور وزن کی رعایت کیساتھ نہ لکھی گئی ہو ۔ عربی ، فارسی‌اور اردو ادبیات میں اس کی مثالیں موجود ہیں ۔ دریں صورت کسی حد تک یہ کہا جا سکتا ہے کہ اختلاف نظم‌یا نثرمیں‌نہیں‌بلکہ شعر اورنثر میں ہے ۔ ''شعر اور نثرمیں ہیئت‌کے اعتبار سے سطحی اختلاف ہونے کے علاوہ مواد کے اعتبار سے

---

(1) English Prose Style by H. Read, pp. ix, x.

اصل اور پائدار اختلاف بھی ہے ، شعر دماغی عمل کے ایک پہلو کا نام ہے اور نثر دوسرے پہلو کا ، شعر تخلیقی اظہار سے عبارت ہے اور نثر تعمیری اظہار سے ، تخلیقی اظہار وہ ہے ، جسمیں الفاظ دوران فکر ہی ذہن میں ابھر آتے ہیں ، یعنی کہ موضوع اور ھیئت ساتھ ساتھ جنم لیتے ہیں ۔ ان میں سے کوئی ایک چیز پہلے سے موجود نہیں ہوتی اس کے برعکس تعمیری اظہار یہ ہے کہ الفاظ پہلے سے موجود ہوں اور نثرنگار ان کو اپنے مجوزہ ڈھانچہ کے مطابق کام میں لے آئے ۔ بالفاظ دیگر ''نثرنگار ایک ایسا معمار ہوتا ہے جس کے ارد گرد عمارت بنانے کا سامان موجود ہوتا ہے اور وہ اسے اپنی ضرورت کے مطابق استعمال میں لے آتا ہے'' [1] الفاظ کا سہارا دونوں صورتوں میں لیا جاتا ہے مگر الفاظ کا استعمال مختلف النوع ہوتا ہے ۔ ہر دو صورتوں میں ان کے استعمال کی غرض و غایت اور صورت ایکدوسرے سے جداگانہ ہوتی ہے ۔ نثر میں الفاظ عام طور پر اپنے مروجہ مفہوم کیلئے ہی استعمال کئے جاتے ہیں مگر نظم میں ان کا مطلب اپنے مروجہ مفہوم سے قدرے مختلف بھی ہو سکتا ہے اور پھر '' نامانوس الفاظ نثر میں تو گراں گزرتے ہیں ، لیکن شعر میں نہیں '' [2] الفاظ کا ہی مختلف طرح سے استعمال نثر اور شعر کے اسالیب میں فرق پیدا کرتا ہے ۔ نثر کے لئے اگر ایک اسلوب موزوں ہے تو شعر کے لئے دوسرا ۔

نثر اور شعر میں کیفیت کا جو فرق ہوتا ہے ، اس کی ایک خفیف سی جھلک اظہار میں نظر آتی ہے ، نثر میں شعر کی نسبت اظہار زیادہ واضح اور روشن ہوتا ہے ، '' جہاں خیال غالب ہوتا ہے ، نثر وجود میں آتی ہے اور جہاں جذبہ غالب ہوتا ہے وہاں شعر جنم لیتا ہے [3] ''

اس مختصر تمہید سے جب یہ حقیقت واضح ہے کہ نثر کیلئے ایک مخصوص اسلوب لازمی ہے تو آئندہ سطور میں اسلوب نثر سے بحث کیجائیگی اور وہ نثر زیر بحث آئیگی ، جو ادبی ہے ، غیر ادبی نثر مطالعہ سے خارج ہوگی ۔ اس مرحلہ پر ادبی اور غیر ادبی نثر کے امتیازی

---

(1) English Prose Style by H. Read, pp. x, xi.
(2) *Ibid.*, p. xii
(3) The Problem of Style by M. Murray, p. 71.

نشانات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ جو کچھ کہا جائے یا معرض تحریر میں آئے، ضروری نہیں کہ اسمیں ادبی عناصر موجود ہوں۔ قتل کی ایک واردات کے متعلق ایک پولیس آفیسر اور افسانہ نویس کی تحریروں میں فرق یقیناً ہوگا۔ اول الذکر کی تحریر بالعموم ادبی عناصر سے عاری ہوگی، اور موخر الذکر کی تحریر ان کی حامل ہوگی۔ ادبی عناصر سے مراد جذبہ اور اسلوب ہیں۔ ادبی نثر میں جذبہ شامل ہوتا ہے اور غیر ادبی میں نہیں۔ دریں صورت پولیس آفیسر کی رپورٹ میں صرف حقائق کا من وعن بیان ہوگا واقعات کا لکھنے والے یا دوسرے لوگوں پر جو اثر ہوا ہے اس کا ذکر رپورٹ میں شامل نہیں ہوگا۔ انتخاب و پسند کا عمل اسکی تحریر میں نظر نہیں آئیگا۔ اس کے برعکس افسانہ نویس کی تحریر میں اسکے اور دوسروں کے تاثرات کی ترجمانی بھی ہوگی اور واقعات میں سے انتخاب بھی کیا گیا ہوگا۔ اس حقیقت کی وضاحت دوسری صورت میں یوں کیجا سکتی ہے کہ ایک ہی پھول کے متعلق ایک انشا پرداز اور ماہر نباتات کے بیانات میں فرق ہوگا۔ انشا پرداز کے بیان میں جذبہ شامل ہوگا اور ماہر نباتات کے بیان میں نہیں، اسی جذبہ کی موجودگی اور عدم موجودگی کے سبب اسالیب بیان میں بھی فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ اظہار کو اسی لئے اپنی نوعیت کی بنا پر ادب میں غیرمعمولی اہمیت حاصل ہے۔ تحریر کے ادبی یا غیر ادبی اور پھر کسی حد تک شعر یا نثر ہونے کا انحصار اسی پر ہے۔

اپنی بات دوسروں کو سنانے اور پھر دوسروں کی بات خود سننے کا جذبہ چونکہ انسانی فطرت ہے۔ اس لئے ہر آن اور ہر لمحہ انسان کو کہنے سننے سے واسطہ پڑتا ہے اور جب اس طرح سے کہنے سننے کی منزل آتی ہے، تو پھر بات کس طرح کہی گئی اور کیسے سنی گئی، تک پہنچ جاتی ہے۔ اسی کہنے اور سننے کی سر زمین سے اسلوب کے سوتے پھوٹتے ہیں۔

اسلوب بیان، طرز تحریر، اسلوب نگارش، سبک، پیرایہ بیان، انداز تحریر اور ان کے ہم معنی دوسرے الفاظ کیلئے انگریزی ادبیات

میں جو لفظ مستعمل ہے ، وہ Style ہے ۔ Style کے متعلق Encyclopedia Britannica اور دیگر متعلقہ کتب میں جو کچھ درج ہے اسکا ماحصل یہ ہے کہ ''Style کا مادہ یونانی لفظ Stilus ہے یہ کہ Stylus ، جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے ۔ Stilus دھات ، لکڑی ، یا ہاتھی دانت کا بنا ہوا ایک نوکدار آلہ ہوتا تھا ، جس کے ساتھ قدیم یونان میں موم کی لوحوں پر حروف اور الفاظ کندہ کئے جاتے تھے ۔ بمرور ایام لفظ Stilus اوزار کا نام ہونے کے علاوہ اوزار سے پیدا شدہ نقوش یعنی جملوں اور عبارتوں کا مفہوم ادا کرنے کیلئے بھی استعمال ہونے لگا اور اس طرح سے ایک عمل جو شروع میں میکانکی تھا رفتہ رفتہ ذہنی یا تصوراتی بن گیا ۔ Stilus سے پہلی مرتبہ جو نقوش بنائے جاتے تھے ، وہ دھندلے اور ناہموار ہوتے تھے دوسری مرتبہ Stilus کے کند حصہ کیساتھ ان کو صاف اور ہموار کیا جاتا تھا ''[1] اسی رعایت سے ادب میں عبارتوں کی کانٹ چھانٹ Style کہلائی یا دوسرے الفاظ میں تحریروں کو بنانے سنوارنے کی عملی کوشش کو اسلوب بیان کا نام دیا گیا ۔

اسلوب نثر سے کیا مراد ہے ؟ اس کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں اور مثالی اسلوب کیا ہے ؟ یا اس سے متعلق جو دوسرے مباحث ہیں ان کے بارے میں مغربی اور مشرقی زبانوں کے اکثر ادبا نے کس صورت میں اظہار خیال کیا ہے ؟ ان سب مضامین سے آشنا ہونے کی واحد اورموزوں صورت یہ ہے کہ انگریزی تصورات کا تجزیہ کرنے سے قبل عربی اور فارسی مصنفین کی آرا کو بھی پیش کر دیا جائے ۔

علامہ ابن خلدون اپنی تاریخ کے دیباچہ میں اسلوب کے اجزائے لازمی ، الفاظ اور معانی سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں '' معنی ہر شخص کے ذہن میں کچھ نہ کچھ موجود ہوتے ہیں ، جن کو وہ نظم کر سکتا ہے ، اس لئے ان کے سیکھنے کی کچھ ضرورت نہیں ہوتی ۔ سیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے ' تالیف الفاظ اور ان کی نشست و بست کی ، جو نظم و نثر کے قالب کہلاتے ہیں اور معانی کے ظروف ۔ اور جیسے پانی بھرنے کے ظروف مختلف

(1) Encyclopedia Britannica, pp. 488-9.

ہوتے ہیں ، کوئی چاندی کا ، کوئی سونے کا ، کوئی تانبے کا کوئی مٹی کا ، اور سب میں پانی یکساں ہوتا ہے ، اسی طرح یہ ظروف معنی ہیں کہ معانی ایک ہیں اور طریق ادا اور اسلوب بیان الگ الگ ، جس کو جیسی زبان پر قدرت ہوتی ہے ، ویسا ہی اس کا اسلوب بیان ہوتا ہے ۔ ایک بلاغت کے اعلیٰ درجہ پر پہونچتا ہے تو دوسرا ادنیٰ درجہ پر ہی پڑا رہتا ہے ، یعنی جو تالیف کلام اور اسلوب بیان کو جانتا اور اس پر قدرت رکھتا ہے اس کا کلام اونچے رتبہ کا ہوتا ہے اور جو ان باتوں کو نہیں جانتا ، وہ اپنا مطلب بھی نہایت ہی بھونڈے طریقے سے ادا کرتا ہے اور اس کی نظم و نثر بدمزہ اور پھیکی رہ جاتی ہے[1] ''

ابن خلدون کے ان خیالات سے دو باتیں ایسی ظاہر ہوتی ہیں جن کا اسلوب بیان کے ساتھ گہرا تعلق ہے ، پہلی بات تو یہ ہے کہ اسلوب کا لسانی عنصر اکتسابی ہے مگر معنوی عنصر اکتسابی نہیں ، دوسری بات یہ ہے کہ الفاظ ظروف کی مانند ہیں اور معانی پانی سے مشابہہ ۔ اس تشبیہ سے جو بدرجہ غایت معنی خیز ہے ، یہ ثابت ہوتا ہے کہ ظاہری خوش نمائی ، دلاویزی اور تنوع کا انحصار سالے یعنی الفاظ پر ہے اور الفاظ سے بحث کرنا چونکہ اسلوب سے بحث کرنا ہے ، اس لئے کسی تحریر کے ظاہری حسن اور اس کے اسالیب کے متنوع ہونے کا دارومدار الفاظ پر ہے ۔

ابن خلدون کے علاوہ عربی زبان کے دوسرے ادبا نے بھی اسلوب کے متعلق اظہار خیال کیا ہے ۔ لیکن ان سب کے ہاں بھی بحث کا وہی رنگ ہے جو ابن خلدون کے یہاں ملتا ہے ۔ لفظ و معنی کے مباحث تک ہی ان کی آرا بھی محدود ہو کر رہ گئی ہیں ۔ صنائع لفظی اور بدائع معنوی کا بیان ہی ان کے خیال میں اسلوب سے عبارت[2] ہے ۔ ابن خلدون کے علاوہ

---

(1) دیباچہ تاریخ ابن خلدون

(2) Rhetorics of the Arabs by Dr. Jogi

(یہ مقالہ صنائع لفظی اور بدائع معنوی سے متعلق مضامین پر مشتمل ہے۔ اس مقالہ کے مطالعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عربی زبان کے ادبا کے خیال میں اسلوب کی بحث صنائع لفظی اور بدائع معنوی تک محدود تھی)

جاحظ[1] اور ابن رشیق[2] کے نام اس سلسلہ میں قابل ذکر ھیں ، لیکن ان کی آرا بھی چونکہ جامع اور مبسوط نہیں ، اور منتشر خیالات کی صورت میں موجود ھیں ۔ اس لئے صرف ابن خلدون کی رائے پر ھی اکتفا کیا جاتا ھے ۔

لفظ اور معنی کی تقسیم عربی سے فارسی میں داخل ھوئی اور امیر خسرو تک اس کا اثر گہرا رھا ۔ نظامی عروضی ، رشیدالدین وطواط ، امیر خسرو ، ابوالفضل ، خان آرزو اور قتیل کی آرا فارسی ادبا میں سے قابل ذکر ھیں ۔ انہوں نے اپنی اپنی تحریروں میں لفظ اور معنی سے بحث کرتے ھوئے اسلوب کے متعلق اپنے خیالات کو پیش کیا ھے ۔ ان آرا کا جائزہ لینے سے معلوم ھوتا ھے کہ فارسی زبان میں علم فصاحت اور علم بلاغت کے تمام مباحث لفظ اور معنی ھی کی تقسیم کا نتیجہ ھیں ۔ فارسی مصنفین کی آرا سے مجموعی تاثر یہ پیدا ھوتا ھے کہ انہوں نے معنی کی بجائے لفظ کو زیادہ اھمیت دی ھے اور اس طرح زبان کو جو محض اظہار خیال کا وسیلہ ھے ، خیال سے زیادہ ضروری قرار دیا ھے ۔ زبان کو غیر ضروری اھمیت دینے کا نتیجہ یہ نکلا کہ لکھنے والے لفظی کھیل کھیلنے لگے ۔

فارسی ادب میں لفظ اور معنی کی تقسیم کے باعث ھی مجاز اور حقیقی کا امتیاز قائم ھوا اور مطبوع اور مصنوع کے دبستان وجود میں آئے ، صنائع لفظی اور بدائع معنوی کے مباحث کو بھی اسی تقسیم نے جنم دیا ۔ معانی کی بجائے جب الفاظ کو زیادہ اھمیت دی جانے لگی تو بعض مصنفین نے اس روش کے خلاف آواز بلند کی ۔ نظامی عروضی ایسے مصنفین میں سے ایک ھے ۔ اس نے اپنی تصنیف چہار مقالہ میں فن دبیری[3] سے بحث کرتے ھوئے لفظ کی بجائے معنی کو زیادہ اھم قرار دیا ھے ۔ بعد ازاں مشہور فارسی انشا پرداز اور اکبر کے درباری ابوالفضل نے بھی اپنے تیسرے دفتر میں معنی اور لفظ کے رشتہ کو جان و تن[4] کا رشتہ قرار دیتے ھوئے معنی

---

(۱) جاحظ نے اپنی تصنیف کتاب البیان میں جو تیسری صدی ھجری میں لکھی گئی ، اپنے نظریات بیان کئے ھیں ۔

(2) ابن رشیق نے کتاب العمدہ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ھے ۔

(3) چہار مقالہ ۔ نظامی عروضی ۔ گب میموریل ایڈیشن (ص ۱۲)

(4) دفتر ابوالفضل مطبوعہ نولکشور پریس لکھنو ۔ (ص۲۸٦)

کی اولین حیثیت کو تسلیم کیا ہے اور اپنی تحریر کے حدیث دل ہونے کی ان الفاظ میں وضاحت کی ہے :—

طلسم خویش را درهم شکستم ٭ بهر حرفی طلسمی باز بستم
بدان باهر که دارد دیدهٔ دوست ٭ بسند مغز جانم را دریں پوست
اگر من جان محبوبم ، تن اینست ٭ اگر یوسف بدم ، پیراهن اینست[1]

ایران کی سیاسی ، سماجی اور مذہبی زندگی کو سامنے رکھتے ہوئے فارسی ادبیات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ اور معنی کی تقسیم اور پھر لفظ کو معنی کی بجائے زیادہ اہمیت دینے کا رجحان وہاں کی درباری زندگی کے سبب ہے ۔ فارسی ادب درباری زندگی سے اس قدر متاثر نظر آتا ہے کہ بعض ادبا فارسی نثر کو درباری نثر تک ہی محدود رکھتے نظر آتے ہیں نظامی عروضی کا فن دبیری کے متعلق مقالہ اسکی واضح مثال ہے ۔ نثر کی اقسام کی تقسیم بلحاظ نسبہ جات بھی اسی نقطہ نظر کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے ۔ امیر خسرو کی تصنیف اعجاز خسروی سے ، جسمیں نثر کی قسمیں بلحاظ نسبہ جات دس[2] بیان کی گئی ہیں ، ہمارے خیال کی تائید ہوتی ہے ۔ فارسی مصنفین کے برعکس مغربی مصنفین نے موضوع کے اعتبار سے نثر کو مختلف اقسام میں تقسیم کیا ہے ۔ درباری زندگی میں چونکہ ہر شخص کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ اپنے علم و فضل کا مظاہرہ کرے ، اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی زبان کے ادبا زبان کا سہارا لیکر اپنی فضیلت کا سکہ منوانے اور دوسروں کو متاثر کرنے کے خیال سے صورت اظہار کیطرف زیادہ توجہ دینے پر مجبور تھے ۔

اردو زبان چونکہ فارسی زبان کے زیر سایہ پروان چڑھی اس لئے جو نظریات فارسی ادب میں پیدا ہوئے ، اردو ادب بھی ان سے اثر پذیر ہوئے بغیر نہ رہ سکا ۔ جس طرح فارسی لکھنے والے اپنے علم و فضل کا مظاہرہ کرنے کیلئے عربی الفاظ بکثرت استعمال کرتے تھے ، اسی طرح اردو

(1) دفتر ابوالفضل — مطبوعہ نولکشور پریس ۔ لکھنو
(2) اعجاز خسروی — امیر خسرو ''مطبوعہ نولکشور پریس ۔ لکھنؤ ص ۵۴

لکھنے والے بھی اکثر اوقات بلا ضرورت عربی اور فارسی الفاظ اپنی تحریروں میں لانے لگے ۔

عربی ، فارسی اور اُردو ادبیات کا مجموعی طور پر جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اول جس طرح سے مطبوع اور مصنوع کی تقسیم ان زبانوں میں موجود ہے ، دوسری زبانوں میں نہیں ، دوئم ۔ معانی اور الفاظ کے متعلق اکثر بحثیں پیچیدہ ، طویل اور تقلیدی رنگ کی ہیں ۔ سوئم ۔ لکھنے والوں کے پیش نظر اپنی ذات کی ترجمانی کی بجائے دوسروں کو متاثر کرنے کا خیال زیادہ رہا ہے اور مروجہ روش یا حکمران طبقہ کی پسند کے خلاف آواز بلند کرنے کی ہمت بہت کم ہوئی ہے ۔ چہارم ۔ بالعموم تذکرہ نگاروں اور مورخوں کی توجہ نثر کے مقابلہ میں نظم کیطرف رہی ہے ۔ عصر حاضر میں لکھی گئی چند کتابوں کو چھوڑ کر باقی سب تذکرے اور تاریخیں اس بات کی شاہد ہیں ۔ اس حقیقت سے ظاہر ہے کہ جب نثر کو قبول عام ہی حاصل نہ تھا تو اس کے اسلوب کے متعلق واضح اور صحیح نظریات مشرق ادب میں کہاں سے آجاتے ۔ پنجم ۔ شاعری چونکہ سب کی پسندیدہ صنف تھی اس لئے شعر کے متعلق جو نظریات قائم کئے گئے نثر کو بھی اکثر و بیشتر اُن ہی کے پیش نظر جانچا گیا ۔ ششم ۔ زبان کو اکثر مصنفین نے جذباتی استعمال کی ، لیکن جذبہ اُن کی تحریروں میں قائم نہ رہ سکا ۔ جذباتی زبان کے استعمال سے روایتی انداز بیان تو پیدا ہوگیا ، لیکن باشعور قاری سے رد عمل کے طور پر کسی قسم کے جذباتی رد عمل کی توقع باقی نہ رہی ۔ اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ مصنف کی ذات اور شخصیت کو ہی اس دور میں اہمیت حاصل نہ تھی ، اسلوب کے ساتھ لکھنےوالے کی شخصیت کا جوگہرا تعلق ہے ، وہ اسی لئے اُن کے سامنے میں نا پید ہے ۔ اُس دور میں لکھنے والا کسی نہ کسی دربار سے وابستہ ہوتا تھا اور وہ یا تو درباری ضرورت کیلئے لکھتا تھا اور یا پھر دوسرے لوگوں کی تفریح طبع کیلئے (دونوں صورتوں میں پیش نظر حکمران طبقہ ہی ہوتا تھا) ۔ ہر دو صورتوں میں اُس کے سامنے قارئین یا سامعین کومتاثر کرنا ہوتا تھا اور اپنی فضیلت و علمیت کا اظہار مقصود ہوتا تھا ،

تا کہ مرتبہ و دولت حاصل ہوسکے ۔ دریں‌صورت لکھنے والا مجبور تھا کہ اپنے آپ کو بھول کر اپنے مخاطب و ممدوح کی پسند کےمطابق اپنی تحریر کو جنم دے ۔ اسی طرز فکر نے اس دور میں تبصرہ و تنقید کرنے والوں کو بھی اسلوب کے اسی پہلو کے متعلق غور کرنے پر اکسایا ، جس کا تعلق سامعین و قارئین کے ساتھ تھا ۔ فصاحت و بلاغت کی جملہ بحثیں اسی غرض سے وجود میں آئیں ۔ ہفتم ، زبان کی طرف غیر ضروری توجہ دینے کا نتیجہ یہ نکلا کہ بعض صورتوں میں پہلے ھی سے موجودہ خیالات و رجحانات کی اشاعت ہونے لگی ۔ جدت و ندرت کے مواقع بہت کم باقی رہ گئے اور مروجہ و منتخب الفاظ میں متداول و مقبول خیال پیش کئے جانے لگے ۔ ھشتم ، صرف و نحو کی طرف زیادہ توجہ دینے کا رجحان فارسی زبان میں اس قدر گہرا ھوا کہ عصر حاضر کے فارسی نقاد بھی اس سے اپنا دامن نہ بچا سکے ۔ دورجدید کے مشہورفارسی شاعر، نقاد اور محقق ملک الشعرا بہار کی تصنیف 'سبک شناسی' اس کی واضح مثال ھے ۔ اس کتاب کے متعلق مصنف نےدعویٰ تو یہ کیا ھے کہ یہ فارسی نثر کے اسلوب کی تاریخ ھے ، مگر اس میں اسلوب کے لسانی پہلو کے علاوہ اس کے دوسرے اہم پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش نہ ہونے کے برابر ھے ۔

۱۸۵۷ء کے سیاسی ھنگامہ کے بعد جب ھندوستان کے سیاسی ، سماجی اور علمی و ادبی ماحول میں تغیر رونما ھوا تو اردو ادب نے سر سید کی تحریک کے زیر اثر انگریزی ادب کے اثرات قبول کرنے شروع کئے اس سے پیشتر فارسی اور عربی ادبیات کے زیر اثر ھی اردو ادب اپنی ارتقائی منازل طے کر رھا تھا ، انگریزی ادب کے اثرات سے اردو نثر کے اسلوب میں جو تبدیلیاں رونما ھوئیں اور اس سے پہلے کی اردو نثر کے اسلوب کی جو خصوصیات تھیں ، ان کے متعلق آئندہ ابواب میں بالتفصیل بحث کی جائیگی ۔ اس موقعہ پر صرف ان خیالات و نظریات کا اظہار مطلوب ھے جو انگریزی زبان میں اسلوب نثر کے متعلق پیش کئے گئے ھیں ۔ ان آرا کے مطابق اردو نثر کے اسالیب بیان کا جائزہ بھی آئندہ ابواب میں ھی پیش کیا جائے گا ۔

مڈلٹن مرے، اسلوب کو لفظ ابلاغ کا تقریباً ہم معنی قرار دیتے ہوئے، نثر اور نظم کے اسالیب میں امتیاز پیدا کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ ''اسلوب زبان کی وہ صفت ہے، جس کی مدد سے احتصار کے ساتھ جذبات یا خیالات کی عکاسی ہوتی ہے۔ یا وہ (اسلوب) مصنف کے ساتھ مخصوص جذبات و خیالات کا ایک ڈھانچہ ہے۔ جہاں خیالات غالب ہوں، وہاں اظہار نثر میں ہوتا ہے اور جہاں جذبات میں شدت ہوں، وہاں اُن کی ترجمانی نظم میں ہوتی ہے اسلوب اُس صورت میں تکمیل پاتا ہے، جب جذبے یا خیال کا اظہار مکمل صورت میں ہو، اسلوب کا انحصار کلی طور پر ابلاغ یا اظہار کے اختصار پر ہے۔ اظہار میں اگر اختصار نہ ہوگا، تو اسلوب کا فقدان ہوگا. . . . (پھر) نظم ادب کی اولین صورت ہے اور نثر بعد کی ترقی یافتہ۔ اسلوب نثر کے لئے ضروری ہے کہ بیان میں اختصار ہو، دلائل منطقی انداز میں ہوں، اوزان وقوافی سے آزاد ہو، اور خیال تیزی کے ساتھ مگر دھیمے پن کی خوبی سے آراستہ پیش کیا جائے۔ انفرادی اسلوب کا معیار یہ ہے کہ ہم اُس اسلوب کے متعلق یہ محسوس کریں کہ تحریر کے لئے وہ ناگزیر ہے۔ پھر جس تجربہ یا جذبہ کا بیان ہو، ہم اُس کو محسوس کر سکیں''[1]۔

سر آرتھر کولر کاؤچ کے خیال میں اچھا اور مناسب اسلوب وہ ہے جو دل و دماغ کے فکری عمل کا نتیجہ ہو[2]، یعنی جس میں جذبہ اور فکر شامل ہوں۔ والٹر ریلے کے نزدیک بھی اسلوب دل و دماغ ہی کا عمل ہے۔ وہ اس عمل کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ '' لکھتے رہنے سے جب آپ کو زبان پر قدرت حاصل ہو جائے، تو اُس وقت آپ چاہیں یا نہ چاہیں، آپ اپنی تحریر میں اپنے آپ کو عیاں کر دیتے ہیں۔ ہر گناہ خواہ وہ کتنا ہی لاشعور کے پردوں میں چھپا ہوا ہو اور ہر نیکی خواہ وہ ظاہر ہونے سے کتنی ہی شرمائے، یعنی آپ کے کردار کا ہر پست و بلند پہلو صفحہ قرطاس پر ظاہر ہوئے بغیر نہ رہیگا۔''[3] بالفاظ

---

(1) The Problem of Style by M Murray, pp 56-8, 71, 73.
(2) On the Art of Writing by Q Couch, p 243.
(3) Style by W. Raleigh, p. 128.

دیگر انسان کے جذبات و خیالات اُس کی تحریر میں یقیناً نمایاں ہو جاتے ہیں۔ تحریر کی اسی خوبی کو انگریزی زبان میں (Sincerity) کا نام دیا گیا ہے۔ ابوالفضل اسے حدیث نفس [1] قرار دیتا ہے اور اُردو میں اسے خلوص کے لفظ سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ ہارڈیس اوگریڈی تو خلوص ہی کو اسلوب قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ " اگر آپ (اپنی تحریر کا) اسلوب چاہتے ہیں، تو یہ آپ کا اپنا ہونا چاہئے [2]۔" یعنی یہ آپ کے اپنے خیالات و جذبات کا آئینہ دار ہونا چاہئے۔ جب اسلوب اس طرح سے مصنف کے ذاتی خیالات و جذبات کا ترجمان بنتا ہے، تو پھر وہ اُس کا اسلوب بیان ہوتا ہے، یعنی اُس کی تحریروں کا خاص ادبی اسلوب قرار پاتا ہے۔ عظیم مصنفین کے اسالیب بیان میں باعتبار سادگی، زور اور زیر و بم، بہت اختلاف ہوتا ہے۔ مگر اختلاف کے باوجود اُن میں بعض صفات مشترک بھی ہوتی ہیں [3]"۔

ہنری بٹ کا خیال ہے " کہ اسلوب کی بحث کا تعلق کسی تحریر کے موضوع کی بجائے اُس کی ہیت سے زیادہ ہے۔ ہر وہ خیال جو ادا کیا جا سکتا ہے، بیان کرنے والے کی اپنی ملکیت بن سکتا ہے، اگر وہ اُسے نہایت حسین پیرایہ میں بیان کر دے، بعض مصنفین کے ہاں قوت خیال زیادہ ہوتی ہے اور بعض کے ہاں قوت اظہار۔ ادب میں عظمت اُس وقت پیدا ہوتی ہے، جب اچھا خیال اچھی زبان میں پیش کیا جائے۔ اسلوب سے بحث کرتے ہوئے، سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ لکھنے والا الفاظ کا انتخاب کیسے کرتا ہے اور پھر اُن کی جملہ بندی کسطرح کرتا ہے، نثر میں بڑی مشکل غیر معمولی بات کا کہنا ہوتا ہے اور شعر میں معمولی بات کا [4]"۔ محولا رائے سے ظاہر ہے کہ ہنری بٹ کے خیال میں اسلوب کا تعلق زیادہ تر زبان سے ہے۔

اس کے برعکس بی۔ ڈابری زبان کی بجائے موضوع اور مصنف کی شخصیت کو زیادہ اہم قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے "پھر یہ پوچھا جائے گا

---

(1) دفتر ابوالفضل۔ مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ۔ ص 259

(2) On Matter, Form and Style by H. O. Grady, p. 123.

(3) The Secrets of Style H. Bett, p. 111.

(4) *Ibid.*, pp. 18-9, 174.

کہ ہمارا واسطہ مصنف کے ساتھ کیسے پڑے گا۔ جواب ہوگا، اس کی آواز کے زیر و بم سے، کیونکہ جب بھی کوئی کتاب پڑھی جاتی ہے، خواہ اسے اونچی آواز سے پڑھا جائے یا مدھم آواز سے، ذہن میں الفاظ بناتے ہوئے ہم ایک آواز سے آشنا ہوتے ہیں یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ہم دوسروں کے ساتھ بات چیت کر رہے ہوں، کوئی ہمیں کچھ بتا رہا ہو، ہمارے جذبات کو ابھار رہا ہو۔ ہر تحریر کی جداگانہ آواز ہے جسے اسلوب کہتے ہیں۔ مصنف اپنی شخصیت کو چھپانے کی کتنی ہی کوشش کیوں نہ کرے، وہ اپنی آواز یعنی اسلوب کو نہیں بدل سکتا۔ اور پھر بالآخر یہ اسلوب ہی ہوتا ہے، جس کی بنا پر ہم کسی مصنف کو عظیم قرار دیتے ہیں[1]"۔

محض زبان ہی کو اگر اسلوب کا معیار قرار دیا جائے تو مڈلٹن مرے کا خیال ہے کہ یہ ایسے ہی ہوگا، جیسے کسی شخص کی عظمت کا اندازہ اس کے لباس سے لگایا جائے۔ " اسلوب " مرے کے خیال میں، "مصنف یا (خیال) کا لباس نہیں، بلکہ اس کا گوشت پوست ہے، اس کا خون ہے۔ اس کی ہڈی ہے۔"[2] مرے کی اس رائے سے پوپ کی اس رائے کی بھی تردید ہوتی ہے جس میں پوپ اسلوب کو محض لباس قرار دیتا ہے، کارلائل بھی اس سلسلہ میں مرے ہی کا ہمخیال ہے۔ اس مرحلے پر مرے اور ابوالفضل کے نظریات میں جو حیرت انگیز مماثلت ہے، وہ قابل ذکر ہے۔ اس سے قبل ابوالفضل کے سلسلہ میں بیان کیا جا چکا ہے کہ وہ لفظ و معانی کے رشتہ کو جسم و جان کا رشتہ قرار دیتا ہے۔ اب غور کیجئے آیا مغرب و مشرق کے دو فنکار کس حد تک اسلوب کے بارہ میں ایک دوسرے کے ہم خیال ہیں۔

فلابیر کے خیال میں اسلوب سے بحث کرتے ہوئے خیال اور ہیئت دونوں ہی اہم ہیں، وہ لکھتا ہے۔ " نہ تو خوبصورت ہیئت کے بغیر خوبصورت خیال ہوتے ہیں اور نہ ہی خوبصورت خیال کے بغیر خوبصورت ہیئت ہوتی ہے۔ خیال کو ہیئت سے الگ کرنا ناممکن ہے۔ کیونکہ خیال کا وجود بھی ہیئت کے سہارے ہے، اسلوب، مصنف کے سوچنے اور دیکھنے کا

---

(1) Modern Prose Style by B. Dobree, pp. 3, 4.
(2) The Problem of Style by M. Murray, p. 134.

ذاتی انداز ہے[1] ''۔ جب ذاتی دید اور فکر کی منزل آ جائے '' تو پھر ذاتی غور و فکر کا انفرادی انداز مصنف کو زبان کے ذاتی استعمال پر مجبور کرتا ہے ۔ اس طرح سے ایک حقیقی اسلوب بالضرور منفرد اسلوب کی حیثیت حاصل کر لیتا ہے[2] ''۔

والٹر پیٹر کا خیال ہے کہ '' اسلوب کی بحث اُس مرحلے پر چھڑتی ہے ، جب فنکار پہلے اپنے آپ کا محاسبہ کرتا ہے ، سوچتا ہے کہ اُسے کیا کہنا ہے اور پھر سوچ بچار کے بعد اپنے خیالات کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ دوسرے اُن سے پوری طرح آگاہ ہوجائیں[3] ''۔ چیخوف نے بھی گورکی کو ایک خط میں اسلوب کے بارہ میں تقریباً یہی کچھ لکھا ہے ۔ '' جب آپ کسی چیز کا خاکہ اس طرح پیش کریں کہ اُسے دیکھا اور چھوا جا سکے ، تو تحریر کا اسلوب حقیقی ہوگا[4] ۔'' بالفاظ دیگر جب تحریر ایسی ہو کہ جس کے مطالعہ سے پیش کی گئی چیز ہو بہو آنکھوں کے سامنے آ جائے ، تو اُس صورت میں تحریر کا اسلوب مثالی اسلوب ہوگا ۔ یعنی وہ ایسا اسلوب ہوگا ، جس سے بہتر اُس موضوع کے لئے ممکن نہیں ۔ اسی بات کو استان دالی ان الفاظ میں پیش کرتا ہے ۔ '' خیال سے مکمل مطلوبہ تاثر پیدا کرنے کے لئے متعلقہ حال کا پورا ماحول بھی پیش کیا جاتا ہے[5] ۔'' یعنی کہ وہ تحریر جس سے ابلاغی مقصد کی تکمیل بحد کمال مطلوب ہو ، اُس کا اسلوب ایسا ہونا چاہئے کہ جو قابل ابلاغ خیال ، جذبہ یا تجربہ کا مکمل ماحول بھی پیش کرے ۔

اسلوب کے متعلق ٹیلی سن کا یہ خیال ہے کہ اسلوب کا تعلق بات کہے جانے کی نوعیت سے ہے ۔ وہ کہتا ہے '' قابل توجہ یہ بات نہیں کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں ، بلکہ یہ ہے کہ ہم کس طرح کہہ رہے ہیں ۔[6]'' یہی کس طرح کہنا اسلوب کا اہم پہلو ہے ۔ نیو مین بھی زبان ہی کو

(1) Appreciation with an Essay on Style by Pater, p. 30
(2) The Problem of Style by M. Murray, p. 15.
(3) Appreciation with an Essay on Style by Pater, p. 34.
(4) The Problem of Style by M. Murray, p. 89.
(5) *Ibid.*, p. 79.
(6) اردو کے اسالیب بیان—زور ص 149

زیادہ اهمیت دیتے هوئے کہتا هے - ''جس طرح کسی شخص کے تخیلات اور احساسات ذاتی هوتے هیں - اسی طرح اس کی زبان بھی اس کی ذاتی هوتی هے - دوسرے الفاظ میں اسلوب ، زبان کے ذاتی طریقہ استعمال کا نام هے[1] -'' جملہ مذکورہ آرا کے مقابلہ میں بفون Buffon کے مشہور الفاظ ''اسلوب هی مصنف هے[2] -'' مختصر هونے کے باوجود جامع اور پر معنی تعریف پیش کرتے هیں - اسلوب کی بحث چونکہ مصنف کی ذات کے گرد هی گھومتی هے اور اسلوب کے تمام پہلوؤں کا مرکز لکھنے والے کی ذات هی هوتی هے ، اس لئے مصنف کی ذات سے واقف هونا هی دراصل اسلوب سے واقف هونا هے - کسی مصنف کی تحریر کے اسلوب سے بحث کرتے هوئے همیں مصنف کے پسند کردہ خیالات و جذبات اور اسی کی استعمال کردہ زبان کا جائزہ لینا هوتا هے - دوسری صورت میں اس مطلب کو اس طرح ادا کیا جا سکتا هے کہ اسلوب مصنف هی کی ذات کا ترجمان هوتا هے یا اسلوب هی مصنف کے راز افشا کرتا هے ، یا مصنف کے دل و دماغ کا جملہ تخلیقی عمل هی اسلوب کا دوسرا نام هے -

مغربی مصنفین کی پیش کردہ جملہ آرا سے معلوم هوتا هے کہ غالب اکثریت ان مصنفین کی هے جو اسلوب کے متعلق بحث کرتے هوئے مصنف کی شخصیت کو نہیں بھولتے اور اسے اولین اهمیت دیتے هیں ، الفاظ یعنی زبان ان کے هاں ثانوی حیثیت رکھتی هے - وہ ابلاغ کے ذریعہ یا وسیلہ کو زیادہ ضروری نہیں سمجھتے بلکہ قابل ابلاغ جذبہ ، تجربہ یا خیال کو زیادہ اهمیت دیتے هیں - پھر مشرقی مصنفین کے برعکس وہ نثر کو بلحاظ پیشہ جات تقسیم نہیں کرتے ، بلکہ موضوع کے مطابق اسکی مختلف اقسام کا جائزہ لیتے هیں - گو مشرقی مصنفین کے طریقہ کے مطابق بھی بات آخر میں موضوع تک هی پہنچ جاتی هے ، کیونکہ هر پیشہ کے متعلق موضوع بھی دوسرے پیشہ کے موضوع سے مختلف هوتا هے ، لیکن مشرقی مصنفین کے اس انداز فکر سے ان کے هاں الجھن اور پیچیدگی پیدا هو جاتی هے اور بیان میں قطعیت نہیں آتی - موضوع جو قابل ابلاغ هوتا هے

---

(1) اردو کے اسالیب بیان—زور ص 149

(2) The Problem of Style by M. Murray, p. 14.

وہ پس پردہ رہ جاتا ہے اور وسیلہ سامنے آجاتا ہے ۔گذشتہ مباحث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مشرقی مصنفین کے مقابلہ میں مغربی مصنفین کی آرا ، اسلوب کے بارہ میں ، زیادہ سائنسی اور جامع ہیں ۔ مغربی مصنفین اسلوب کے جملہ پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں اور پھر ساتھ ہی ساتھ اسلوب کے متعلق پیش کردہ نظریات کے مطابق انگریزی نثر کا جائزہ بھی لیتے ہیں ۔ مشرقی مصنفین اس طریقہ سے کام کرتے ہوئے شاذ و نادر ہی نظر آتے ہیں اور پھر ان کے مباحث اسلوب کے جملہ پہلوؤں پر حاوی بھی نہیں ہوتے ، وہ صرف اسلوب کے لسانی پہلو کی طرف ہی متوجہ دکھائی دیتے ہیں ۔ اس کی غالباً ایک وجہ یہ ہے کہ وہ چونکہ زبان کو قابل درس و تدریس خیال کرتے ہیں ، اس لئے اپنی مساعی کا مرکز اسی کو بناتے ہیں اور تحریر سے بحث کرتے ہوئے زبان ہی کی طرف زیادہ زور دیتے ہیں ۔

عربی ، فارسی اور انگریزی میں اسلوب کے متعلق کہی گئی اہم باتوں کو احاطۂ تحریر میں لانے کے بعد اب یہ بیان کردینا مناسب ہے کہ ان نظریات کو جو اردو زبان میں اسلوب کے متعلق بیان کئے گئے ہیں آئندہ ابواب میں جہاں اردو نثر نگاروں کے اسالیب کا تجزیہ ہوگا ، وہاں ہی پیش کر دیا جائیگا ، کیونکہ بصورت دیگر غیر ضروری تکرار کا امکان ہے ۔

اسلوب کے متعلق بالعموم اور اسلوب نثر کے متعلق بالخصوص ضروری باتیں بیان کر دینے کے بعد اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام عناصر یا پہلوؤں کا علیحدہ علیحدہ جائزہ لیا جائے ، جن کو اسلوب نثر کے متعلق بحث کرتے ہوئے زیر بحث لانا ناگزیر ہوتا ہے ۔ یا بالفاظ دیگر موضوع ، اجتماعی اور شخصی ماحول ، روایت ، لفظ ، تشبیہ ، استعارہ ، تکیہ کلام ، جملہ اور مثالی اسلوب وغیرہ مباحث کے متعلق اظہار خیال کر دیا جائے ۔

موضوع ۔ تقریباً سبھی ادیب اس بات پر متفق ہیں کہ تمام موضوعات کے لئے ایک ہی قسم کا اسلوب ناممکن ہے اور اگر ناممکن نہیں ، تو ناموزوں ضرور ہے مختلف موضوعات کے لئے مختلف قسم کے اسالیب کی

ضرورت ہوتی ہے۔ بی۔ ڈابری ' اسی خیال کو مدنظر رکھتے ہوئے انگریزی نثر کے اسلوب سے بحث کرتے ہوئے نثر کو موضوعات کے اعتبار سے Descriptive (تشریحی) Narrative (محاکاتی) Explanatory (بیانیہ) اور Emotional (جذباتی) میں تقسیم کرتا ہے۔ اسی تقسیم کی وضاحت کرتے ہوئے وہ کہتا ہے ''ہم یہ توقع کرسکتے ہیں کہ ایک ہی شخص مختلف اسالیب کا مالک ہو، جبکہ وہ مختلف موضوعات پر قلم اٹھا رہا ہو۔ جب مصنف ہمیں کچھ بتانا چاہتے ہیں ' کسی واقعہ کو ہمارے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں، کسی چیز کا خاکہ ہمارے سامنے لانا چاہتے ہیں تو ان کی تحریر کا اسلوب Descriptive ہوتا ہے۔ یا جب وہ کسی بات کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں (مثلاً سائنس کے مطالب ومضامین) یا تبصرہ و تنقید کرنا چاہتے ہیں ' تو ان کا اختیار کردہ اسلوب Explanatory ہوتا ہے یا جب وہ محض ہمارے جذبات کو ابھارنے مثلاً رنج، خوشی یا غصہ کا جذبہ پیدا کرنے کے خواہشمند ہوتے ہیں ' تو ان کی تحریر کا اسلوب Emotional ہوتا ہے[1]۔''
ہینری بٹ کے خیال میں تو ''اسلوب کا راز ہی موضوع اور ہیئت کے باہمی تعلق میں مضمر ہے[2]۔'' موضوع اگر شدید جذبہ ہوگا تو مصنف اکثر تیور حروف استعمال کریگا ' موضوع اگر منطقیانہ ہوگا تو بات طویل فقرات میں کہی جائیگی اور پھر بعض موضوع ہی ایسے ہوتے ہیں کہ جن کے لئے پیچیدہ اسلوب کی ضرورت ہوتی ہے ' مثلاً تخیل کی پیداوار پریشان خیالات کے اظہار کیلئے پیچیدہ اسلوب اختیار کیا جاتا ہے۔ موضوع اگر مصنف کے ذہن میں صاف، نمایاں اور قطعی صورت میں ہو تو اسلوب پیچیدہ نہیں ہوتا، بلکہ صاف۔ سادہ اور رواں ہوتا ہے۔

شخصی اور اجتماعی ماحول ۔ موضوعات کا تعلق چونکہ زندگی سے ہے، اس لئے اسلوب ہماری شخصی اور اجتماعی زندگی یعنی انفرادی اور اجتماعی ماحول سے بھی متاثر ہوتا ہے۔ بعض اوقات مصنف صرف روایت پرستی کیخاطر ہی ایک خاص اسلوب کو اپنانے

(1) Modern Prose Style by B. Dobree, p. 10.
(2) The Secrets of Style by H. Bett, p. 271.

کی کوشش کرتا ہے اور بعض صورتوں میں وہ اپنے ذاتی میلانات و رجحانات کی بنا پر مجبور ہوتا ہے کہ روایت کیخلاف بغاوت کرتا ہوا موضوع اور اپنی رفتار طبع کے مطابق انفرادی اسلوب اختیار کرے، بہر صورت اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ادبی روایات کا بھی اسلوب کےساتھ گہرا تعلق ہے۔ ہربرٹ ریڈ اس بارہ میں لکھتا ہے۔ ''روایت کامفہوم بہت وسیع ہے۔ اسے وراثت میں نہیں پایا جا سکتا، بلکہ اسے حاصل کرنے کیلئے بہت تکلف اٹھانی پڑتی ہے، اس میں پہلی چیز جس کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاریخی شعور ہے۔ اور تاریخی شعور ایک ایسا تصور ہے، جس کے احساس اور کردار کے باہمی عمل سےایک خاص اسلوب پیدا ہوتا ہے، جسےروایتی اسلوب کہا جاتا ہے۔ (یعنی ادبی روایات کے احساس کے ساتھ ذاتی رجحانات کی کشمکس کے بعد جو اسلوب پیدا ہوتا ہے، وہ روایتی کہلاتا ہے۔) اسلوب نثر میں روایت کا دخل اُس وقت ہوتا ہے، جب تنقیدی آرا زبان کی محاوراتی ساخت (یعنی محاورات) کے گرد گھومنے لگتی ہیں، کچھ عرصہ کیلئے ذاتی، ابتدائی اور سماجی و مذہبی اثرات زبان کو ایک خاص سانچے میں ڈھالتے رہتے ہیں اور پھر ایک مقام ایسا آ جاتا ہے، جہاں یہ اچانک محسوس ہوتے لگتا ہے کہ اُن اثرات کا نتیجہ ایک ایسی خاص اپنایت کی صورت میں نکلا ہے جو آواز، احساس اور سہولت سے بالکل ہم آہنگ ہے۔ روایت کا تعلق زیادہ تر اظہار کے لب و لہجے اور زمانے کے ساتھ ہے۔'' (1)

انگریزی، عربی، فارسی اور اُردو تقریباً سب زبانوں کی تاریخ میں ہمیں اُن ادوار کا سراغ ملتا ہے، جب مصنفین نے روایت کو اپنایا اور مروجہ اسلوب اختیار کرنے کی کوشش کی، اکثر ایسا بھی ہوا کہ ایک ہی موضوع کو دو مختلف اسالیب میں پیش کیا گیا اور بعد کے آنے والے مصنفین نے ہر دو اسالیب کی تقلید میں کتب لکھیں، فارسی ادب میں اس کی واضح مثال اخلاق جلالی اور اخلاق ناصری ہے۔ اور اُردو ادب میں اس کی روشن مثال نوطرز مرصّع اور باغ و بہار ہے اجتماعی

(1) English Prose Style by H. Read, pp. 203 to 211.

میلانات یا ماحول کا اثر لکھنے والے پر یہاں تک ہوتا ہے کہ وہ الفاظ کے انتخاب کے علاوہ موضوع کا انتخاب بھی عام رجحانات کو سامنے رکھ کر کرتا ہے ۔ عصر حاضر کے اُردو ادب میں افسانوں کی زبان اور اُن کا موضوع مذکور طرز عمل کے نمایاں شواھد ہیں۔

شخصی ماحول جو ادیب کے گھر ، اسبابِ خانہ اور افراد خانہ سے عبادت ہے ، اُس سے بھی ادیب اثر قبول کئے بغیر نہیں رہ سکتا ۔ رات دن شخصی ماحول کے جن عناصر سے اُس کا واسطہ پڑتا ہے وہ شعوری یا غیر شعوری حالت میں یقیناً اُسکی تحریر میں اپنی جھلک دکھا دیتے ہیں۔ افسانہ نویس اگر ایک امیر خاندان کا چشم و چراغ ہے ، تو وہ بالعموم اپنے افسانوں میں جس زندگی کو پیش کریگا اور اور جس زبان کو وسیلہ اظہار بنائیگا ۔ اس سے امارت کا اظہار لازماً ہوگا۔ اردو میں قرہ العین حیدر کے افسانے اسکی نمایاں مثال ہیں ۔ الفاظ اور موضوع کیساتھ بھی چونکہ اسلوب کا تعلق ہے اس لئے بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اسلوب شخصی اور اجتماعی ماحول سے بھی متاثر ہوتا ہے ۔

لفظ اجتماعی یا شخصی میلانات سے مجبور ہو کر یا دیگر محرکات کی بنا پر موضوع منتخب کر لینے کے بعد، اسکے اظہار کیلئے مصنف کے پاس جو خام مسالہ موجود ہوتا ہے، وہ زبان ہے یعنی الفاظ کا انتخاب بھی موضوع کیطرح ہمارے سامنے مصنف کی پسند و ناپسند کو بے نقاب کر دیتا ہے ۔ جس طرح ایک جنسی مسائل کو پیش کرنے والے افسانہ کے مطالعہ سے ہم افسانہ نگار کے متعلق یہ اندازہ لگا لیتے ہیں کہ وہ جنسی مسائل سے بحد متاثر ہے اُسی طرح ہم کسی تحریر میں فلسفیانہ اصطلاحات دیکھکر تحریر کے مصنف کے بارہ میں یہ فیصلہ صادر کر سکتے ہیں کہ وہ فلسفی ہے ۔ شعروں کے انتخاب کیطرح لفظوں کا انتخاب بھی اُن کے استعمال کرنے والے کے ذہن کی غمازی کرنے سے گریز نہیں کرتا ۔ اس موقعہ پر غالب مرحوم کا ایک مصرع ہماری راہبری کیلئے کافی ہے ۔ کہتے ہیں۔

در ته هر حرف غالب چیده ام میخانه ها

جن میخانوں کی طرف غالب مرحوم نے مذکورہ مصرع میں اشارہ کیا ہے، فی الحقیقت اُن میخانوں سے آگاہ ہونا ہی اسلوب کی بحث سے آشنا ہونا ہے ۔

بعض مصنفین نے اسلوب کو محض لفظوں کا ہی کھیل بتایا ہے ۔ مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہے ۔ ''موضوع کو ہم رئیت یا الفاظ سے الگ نہیں کر سکتے[1] ۔'' لفظوں کے انتخاب کے متعلق کولر کاؤچ لکھتا ہے ۔ ''لفظوں کے انتخاب میں زیادہ احتیاط کی عادت کا اکثر اوقات یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عبارت میں روانی باقی نہیں رہتی اور اس سے بھی بڑی خامی یہ پیدا ہو جاتی ہے کہ مصنوعی الفاظ اختیار کرنے کی عادت پڑ جاتی ہے[2] ۔''

لفظ بھی انسانوں کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں ۔ ''لیکن اُن کی زندگی اپنی ذات ہی کی وجہ سے نہیں ہوتی ۔ اُن کی زندگی یا موت ۔ چمک یا فرسودگی اُن کے سیاق و سباق پر منحصر ہوتی ہے ۔ بعض اوقات لفظ کے خوبصورت دکھائی دینے کی وجہ یہ ہوتی ہے ۔ کہ وہ لفظ مدت سے جن الفاظ کے ساتھ استعمال ہو رہا ہوتا ہے ۔ اب بھی ان کے ساتھ ہی استعمال کیا گیا ہوتا ہے ۔ لفظ کا دیگر الفاظ کے ساتھ یہ رشتہ ایسا ہی ہے جیسا ایک ماں کا اپنے بچوں کے ساتھ، جسطرح ماں اپنے بچوں کے ساتھ ہی اچھی دکھائی دیتی ہے اسی طرح ایک لفظ ان لفظوں کے ساتھ اچھا معلوم ہوتا ہے ۔ جن کے ساتھ وہ مدت سے استعمال ہو رہا ہوتا ہے ۔ اور پھر (اس کے برعکس) بعض صورتوں میں لفظ کے اجنبی یا ناموزوں ہونے کا سبب یہ ہوتا ہے کہ وہ لفظ اجنبی یا غیر مانوس الفاظ کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہوتا ہے[3] ۔''
محاوروں کی صورت میں یہ بات خاص طور پر قابل غور ہے ۔

---

(1) Appreciation with an Essay on Style by Pater, p. 38.
(2) On the Art of Writing by Q. Couch, p. 241.
(3) Matter, Form and Style by H. O'Grady, pp 69, 121.

لفظ کے ساتھ خیال کا جو تعلق ہے - اُس کے پیش نظر سپنسر لکھتا ہے، ”جب خیال کو مختصر الفاظ میں بیان کرنا مناسب ہے- تو پھر الفاظ بھی کم حروف والے استعمال کرنے چاہئیں - زیادہ حروف والے الفاظ اور وہ الفاظ جن کو منہ بھر کر کہا جائے - اُن سے خیال کے طویل اور زور دار ہونے کا پتہ ملتا ہے[1] -“ اور پھر ”تحریر میں مصنف کی شخصیت کا دخل جسا بھی کم ہو، اُتنی ہی زبان سادہ ہوتی ہے - حساب اور الجبرا کے مضامین میں ایسا ہی ہوتا ہے[2] -“

مڈلٹن مرے کا لفظ کے بارہ میں یہ خیال ہے کہ ”تخلیقی فنکار ایک ڈاکٹر کی مانند زبان کے جسم میں نئے معانی اور تازہ تصورات داخل کرتا ہے - تاکہ زبان دوبارہ جوان ہو جائے اور اُس کی رگوں میں خون دوڑنے لگے - صحافی بالعموم اوسط درجہ کے لوگوں کی زبان استعمال کرتا ہے اور تخلیقی فنکار نئے نئے محاورے بناتا ہے- زبان کو اگر مصنف حیات نو بخشنے سے قاصر رہے، تو اُسے زبان کو زندہ تو ضرور رکھنا چاہئے[3] -“ زبان کو زندہ رکھنے سے یہ مراد ہے کہ لفظ استعمال ہوتے رہیں- وہ متروک نہ ہو جائیں ــــــاور پھر لفظوں کے ساتھ کچھ روایات وابستہ ہوتی ہیں، ”اُنہی روایات اور لفظ کی اسی زندگی یا سرگزست کو سامنے رکھ کر کسی خیال کو ادا کرنے کیلئے لفظ کا انتخاب عمل میں آتا ہے[4] -“

ہنری بٹ اسی سلسلہ میں لکھتا ہے - ”ہر لفظ کی ایک خاص آواز ہوتی ہے، اُس کا خاص مفہوم ہوتا ہے اور فقرے میں دوسرے الفاظ کے ساتھ اُس کا خاص تعلق ہوتا ہے اور پھر وہ تمام ادبی روایات ہوتی ہیں، جو بمرور ایام اُس کے گرد جمع ہو چکی ہوتی

---

(1) The Philosophy of Style by Spencer, p. 9.
(2) Style by W. Wright, p. 52.
(3) The Problem of Style by M. Murray, pp. 112—17.
(4) Appreciation with an Essay on Style by Pater, p. 17.

ھیں - بعض صورتوں میں لفظ کی آواز اور اُس کے مفہوم میں گہرا اور واضح تعلق ہوتا ہے (مثلاً لفظ کھڑ کھڑاھٹ)، لفظ کی آواز کا انحصار ایک حد تک اُن الفاظ کی آواز پر بھی ہوتا ہے، جن کے ساتھ وہ استعمال کیا جا رہا ہو - یہی لفظ کے معنی کی نوعیت ہے - اس کے علاوہ آواز اور مفہوم کا انحصار الفاظ کی حرکت پر منحصر ہے - فقرے میں لفظ کا اثر بھی آواز اور مفہوم کے اعتبار سے اُس کے محل استعمال پر مبنی ہوتا ہے - ہر لفظ کی آواز کا انحصار اُس کے حروف کی آوازوں پر ہوتا ہے اور پھر یہی حروف لفظ کے مفہوم کی طرف اشارہ کر رہے ہوتے ہیں - حروف کی ترتیب و تکرار سے نغمہ اور ترنم پیدا ہوتا ہے (اور لفظ کی تکرار سے تکیہ کلام کا سراغ ملتا ہے - کسی مصنف کا تکیہ کلام معلوم ہو جانے کے بعد بآسانی اُسکی تحریروں کی نشاندھی کی جا سکتی ہے) اور پھر لکھنے والے کی اُفتاد طبع کا بھی پتہ چلتا ہے - بعض حروف ایک موضوع کیلئے مناسب ہوتے ہیں اور بعض ناموزوں - متحرک حروف کی تکرار لکھنے والے کے حرکت پسند ہونے پر دلالت کرتی ہے - لکھنے والے کے سامنے لاتعدادِ الفاظ ہوتے ہیں - لیکن وہ ان میں سے اپنی ضرورت کے مطابق کسی لفظ کو اُس کے مفہوم ' اُسکی آواز اور اُس کی ادبی سرگزشت کو مد نظر رکھتے ہوئے منتخب کر لیتا ہے - اچھا مصنف بننے کیلئے ضروری ہے کہ ہمیشہ نہایت موزوں الفاظ سے کام لیا جائے- ہم معنی الفاظ وجود ہی نہیں رکھتے - تھوڑا بہت فرق ان میں ضرور ہوتا ہے - زبان کا کام چونکہ خیالات کا دوسروں تک پہنچانا ہے ' اس لئے اسلوب اگر زبان کو اپنا ابلاغی فرض بآحسن طریق ادا کرنے میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے تو وہ اسلوب پسندیدہ نہیں - اگر کسی لفظ کا مفہوم اُس کے تاریخی مفہوم (یعنی جو اس کا لغوی مفہوم تھا) سے مختلف لیا جانے لگے - تو اُسے قبول عام حاصل ہو جانے کی صورت میں صحیح تسلیم کر لینا چاھیئے یعنی غلطالعوام الفاظ کو درست خیال کر لینا چاھیئے - لیکن کوشش

یہی ہونی چاہیئے کہ یہ صورت پیدا نہ ہو[1]۔''

الفاظ کی فرسودگی کے سلسلے میں یہ خیال ہونا چاہئے کہ ''الفاظ کثرت استعمال سے فرسودہ ہوتے ہیں لیکن اچھا مصنف اس سے بچنے کیلئے الفاظ کو فقرے میں اس طرح استعمال کرتا ہے کہ جیسے وہ خزانہ سے نکلے ہوئے نئے سکے ہوں۔ اسمیں سک نہیں کہ مصنف نئے الفاظ یا ایک بھی نیا لفظ نہیں بنا سکتا۔ لیکن وہ یہ نو کر سکتا ہے کہ جملہ میں اُن کی ترتیب کو بدل کر اُن میں ایسی تازگی، جذب اور موزونیت پیدا کر دے کہ وہ نئے دکھائی دینے لگیں۔ تکرار کی صورت میں یہ بات ممکن نہیں ہوتی، کسی مصنف کی انفرادیت معلوم کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اُن الفاظ کا سراغ لگا لیا جائے، جو وہ بکثرت استعمال کرتا ہے۔ الفاظ کا تعلق چونکہ بہت بڑی حد تک دماغ کے ساتھ ہے اور دماغ شخصیت کا ایک حصہ ہے[2]'' اس طرح اس لحاظ سے بھی الفاظ کا رشتہ مصنف کی ذات کےساتھ نمایاں ہے۔ الفاظ تحریر میں پکار پکار کر کہتے ہیں کہ ہمارا خالق فلاں شخص ہے، اُس کی تعلیم اس درجہ کی ہے، اُس کے مطالعہ میں فلاں فلاں کتب رہی ہیں اور اُس نے فلاں فلاں اساتذہ فن سے اکتساب فیض کیا ہے۔ جس طرح ہم ریڈیو پر بولنے والے کو اُس کی آواز سن کر پہچان لیتے ہیں، اُسی طرح ہم کسی مصنف کی تحریر کو دیکھ کر مصنف کا سراغ لگا لیتے ہیں۔

استعارہ

لفظ بعض اوقات صرف اپنے لغوی معنوں کیلئے ہی استعمال نہیں ہوتا، بلکہ مجازی معنوں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً جب یہ کہا جاتا ہے کہ امجد شیر ہے۔ تو شیر کا لفظ اپنے لغوی معنوں میں استعمال نہیں ہو رہا ہوتا بلکہ بطور استعارہ مجازی مفہوم ادا کر رہا ہوتا ہے۔ یعنی شیر کی ایک صفت جو کہ بہادری ہے، مذکورہ فقرہ میں شیر کا لفظ اُس کیطرف اشارہ کر رہا ہوتا ہے۔ استعارہ کی ضرورت تحریر میں اُس

---

(1) The Secrets of Style by H. Bett, p. 77.

(2) English Prose Style by B. Dobree, pp. 10, 11.

وقت پیدا ہوتی ہے ۔ جب خیال کو سیدھے سادھے طریقہ میں پیش نہیں کیا جا سکتا ، بلکہ اُسے محسوس اور معروف صورت دیکر پیش کرنے کی ضرورت ہوتی ہے ۔ مثلاً مذکورہ بالا مثال میں جب ہم نے امجد کی بہادری کو واضح کرنا چاہا ، تو ہم نے سیر کا نام دے دیا ، جو بہادری کیلئے مشہور ہے ۔

اگر کسی سخص میں استعارات پیدا کرنے کی صلاحیت موجود ہو تو اس سے اُس سخص کے شاعرانہ ذہن رکھنے کا پتہ چلتا ہے ۔ '' استعاروں کا بکثرت استعمال ہمیشہ ساعرانہ انداز بیان میں ہوتا ہے ، نثر میں استعارات کو اکثر اوقات اُس مرحلہ پر کام میں لایا جاتا ہے جب نثر اور ساعری کی حدود آپس میں مل رہی ہوتی ہیں[1] ۔'' یعنی وہ نثر جسے انشا ، ادب لطف اور جذبہ آمیز نثر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ، اُسمیں استعارات بالعموم استعمال ہوتے ہیں ۔

''استعارے کسی تحریر میں ایسے ہی ہوتے ہیں ، جیسے کپڑے پر زر و جواہر ، جس طرح کپڑے سے زر و جواہر اُتار دینے سے اس کی افادیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی ، اسی طرح استعاروں کو تحریر سے الگ کردینے کی صورت میں تحریر کے افادی پہلو میں کوئی فرق نہیں پڑتا ''۔[2] یعنی وہ تحریر اپنے ابلاغی مقصد کو پورا کرنے میں کوتاہی نہیں کرتی ۔ استعارہ کو جو مذکورہ رائے میں زر و جواہر کی حیثیت دی گئی ہے ، معلوم ہوتا ہے اس رائے کی تخلیق کا سبب اسلوب کے متعلق وہ تصور ہے ، جس کے مطابق تشبیہات اور استعاروں کو محض آرائش کلام کا سامان قرار دیا جاتا ہے ، لیکن درحقیقت صورت حال اس سے مختلف ہے ، کیونکہ اگر استعارے یا تشبیہات کسی خیال ، جذبہ یا تجربہ کے ابلاغ میں مد و معاون ثابت ہوں ، تو پھر ان کی حیثیت زر و جواہر کی نہیں رہ جاتی ۔ کیونکہ اس طرح ابلاغی مقصد کی تکمیل میں شریک کار ہو کر وہ اپنی افادیت پیدا کرلیتے ہیں ۔ اس میں شک نہیں کہ اگر وہ ابلاغی مقصد کو پورا کرنے میں مد و معاون ثابت ہونے سے قاصر رہیں تو پھر وہ واقعی محض

(1) English Prose Style by H. Read, p. 26.
(2) The Problem of Style by M. Murray, p. 12.

آرائش کے سامان کی حیثیت رکھتے ہیں۔

تشبیہ اور استعارہ میں اسلوب کے اعتبار سے محض درجاتی فرق ہے۔ تشبیہ اولین صورت ہے اور استعارہ بعد کی ترقی یافتہ۔ تشبیہ میں دو چیزوں کو ایکدوسرے کے ساتھ مشابہت دینے کے علاوہ وجہ شبہ کو بھی ظاہر کردیا جاتا ہے، یا علامات مشابہت، مثل، مانند وغیرہ بیس کردی جاتی ہیں، مثلاً جب یہ کہا جاتا ہے کہ "میرا محبوب آہو چشم ہے" تو چشم جو وجہ شبہ ہے اس کا ذکر موجود ہے، لیکن استعارہ میں وجہ شبہ غائب ہوتی ہے۔ جیسا کہ استعارہ کے سلسلہ میں دی گئی مثال "امجد شیر ہے" سے ظاہر ہے۔ تشبیہ میں ذہن کو سوچ بچار سے بہت کم کام لینا پڑتا ہے، گو اس سے انداز بیان میں طوالت آجاتی ہے، لیکن استعارہ میں ہمیں چونکہ کسی چیز کو فوراً اس کی متبادل صورت میں دیکھنا ہوتا ہے، اس لئے ذہن کو فوری جست لگانی پڑتی ہے[1]۔" اور بعض صورتوں میں اسے سمجھنے کے لئے کافی غور و فکر سے کام لینا پڑتا ہے۔ تشبیہ کے برعکس استعارہ کے استعمال سے انداز بیان میں اختصار پیدا ہو جاتا ہے اورتحریر طوالت سے بچ جاتی ہے۔ "لیکن استعارہ کے استعمال میں اس بات کو مدنظر رکھنا پڑتا ہے کہ وہ سادہ ہو، تاکہ تفہیم میں دشواری اور تاخیر کا سامنا نہ کرنا پڑے[2]۔" اور کلام میں زور پیدا ہونے کے علاوہ تاثر میں شدت آجائے۔

اسلوب سے بحث کرتے ہوئے تشبیہات اور استعاروں کا مطالعہ اسلئے بھی ضروری ہے کہ ان سے ہمیں مصنف کے رجحانات کا سراغ ملتا ہے، ہر عظیم ادیب ایک خاص قسم کے استعارے اور ایک خاص نوع کی تشبیہات کو اپنی تخلیقات میں جگہ دیتا ہے، علامہ اقبال اس بات کی زندہ جاوید مثال ہیں۔ انہوں نے اپنے کلام میں جن تشبیہات اور استعاروں کا استعمال کیا ہے، ان سے ان کے نظریات و تصورات کا اظہار ہوتا ہے۔ شاہین، جوُ، دریا اور انجم سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ قوت حرکت اور مسلسل جستجو کے دلدادہ ہیں۔

(1) The Philosophy of Style by Spencer, p. 26.
(2) *Ibid.*

بعض صورتوں میں لفظ علامت یا اشارہ کی حیثیت بھی حاصل کرلیتا ہے ، جیسے علامہ اقبال کے کلام میں لفظ 'لالہ' ہے ۔ 'لالہ' ان کے ہاں 'ملت اسلامیہ' سے عبارت ہے ۔ لیکن لفظ کی یہ جملہ حیثیتیں ایسی ہیں کہ جن کا تعلق زیادہ تر نظم یا شعر کے ساتھ ہے ۔ نثر کا اپنے مزاج اور اپنی ساخت کے سبب ان سے شاذ و نادر ہی واسطہ پڑتا ہے ۔

لفظ بے معنی بھی ہوتے ہیں اور بامعنی بھی ، ہمارے پیش نظر جملہ مباحث میں بامعنی لفظ ہے ، جسے گریمر کی رو سے کلمہ کہا جاتا ہے ۔

جملہ

ایک لفظ چونکہ مکمل خیال کو ظاہر کرنے سے معذور ہوتا ہے ، اس لئے ادیب کو لاتعداد الفاظ سے کام لینا پڑتا ہے ، وہ اپنی ضرورت کے مطابق الفاظ کی سپاہ کو قطاروں اور گروہوں میں سہولت اور تقسیم کار کے لئے منقسم کردیتا ہے ۔ دوسرے الفاظ میں وہ الفاظ کو جملوں اور پیروں (Paragraphs) کی صورت دیدیتا ہے ۔ جملہ اکائی کی حیثیت رکھتا ہے اور مختلف اکائیوں سے ایک پیرہ بنتا ہے ۔ ہربرٹ ریڈ جملے کے متعلق لکھتا ہے ۔ ''جملہ ایک منفرد چیخ و پکار اور اظہار کی ایک اکائی ہے - اس کی مختلف خصوصیتوں ، لمبائی ، بحر اور ساخت کا تعین ان کے باہمی اتحاد کے صحیح شعور پر مبنی ہوتا ہے ۔ فقرے میں اسماء اور افعال کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے ، بعض فقرے سادہ ہوتے ہیں ، بعض مرکب اور بعض پیچیدہ ۔ لیکن پیچیدگی یا سادگی کا انحصار طوالت پر نہیں ہوتا ۔ ایک جملہ طویل ہونے کے باوجود سادہ ہوسکتا ہے اور ہونا بھی چاہیئے اگر اسے ابلاغی مقصد پورا کرنا ہے ۔ مختصر فقرات سے رفتار کا اظہار ہوتا ہے اور اسی لئے وہ کسی عمل یا تاریخی واقعہ کے بیان کے لئے موروں ہوتے ہیں ۔ طویل فقرات سے تحریر میں سکون اور تدبر کا اظہار ہوتا ہے ۔ اور اسی لئے وہ فلسفیانہ مطالب کے لئے مناسب ہوتے ہیں ۔ مرکب جملوں میں تنوع کے لئے وسیع مواقع میسر آتے ہیں ، لیکن مختصر فقرات میں نہیں ، طویل اور پیچیدہ جملوں میں یہ خدشہ ہوتا ہے کہ شاید توازن قائم نہ رہے ۔ اور پھر منطقیانہ طور پر مفہوم صاف اور رواں ہونے کے باوجود ، پڑھنے والے کے لئے صبر آزما

ہوتے ہیں[1] ۔'' فقرے میں الفاظ کی ترتیب بہت زیادہ قابل توجہ ہوتی ہے ۔ ''ہر جملے میں الفاظ کی ترتیب کی ایک ایسی صورت ہوتی ہے ، جو ترتیب کی دوسری صورتوں سے زیادہ موثر اور موزوں ہوتی ہے ۔ جملے میں الفاظ کی ترتیب ایسی ہونی چاہئیے کہ خیال کے اجزا موزوں ترین صورت میں یکجا ہو جائیں[2] ۔'' جوش میں آئے ہوئے لوگوں کی زبان سے بلا واسطہ (Direct) جملے بے ساختہ نکل آتے ہیں[3] ۔''

جملے میں الفاظ کی ترتیب اگر بدل دی جائے ، تو اس کے مفہوم میں بھی تبدیلی آجاتی ہے ، خواہ یہ تبدیلی کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو ، لفظوں کی ترتیب بدلنے کے ساتھ ہی چونکہ لہجہ بھی بدل جاتا ہے ، اس لئے مطلب میں تغیّر ناگزیر ہوتا ہے لکھتے ہوئے اس بات کا خیال رکھنا بہت ضروری ہوتا ہے کہ جملے میں جو الفاظ استعمال کئے جائیں ، ان سے مطلب پوری طرح واضح ہو ، پیچیدگی یا الجھن اسلوب میں صرف اسی وقت ہونی چاہئیے ، جب مقصد الجھن یا پیچیدگی پیدا کرنا ہو ، خیال اگر ذہن میں صاف اور قطعی صورت میں موجود ہو ، تو اسلوب میں بھی قطعیت پیدا ہو جاتی ہے ۔ اسلوب میں قطعیت سے مراد یہ ہے ، کہ جب ہم کچھ کہنا چاہیں ، تو وہ ان الفاظ میں کہیں ، جن سے مطلب مکمل صورت میں دوسرے لوگوں کے ذہن میں منتقل ہو جائے ۔ پیچیدہ نگاری سے لکھنے والے کی عظمت بڑھتی نہیں ، بلکہ کم ہوتی ہے ، کیونکہ درآں صورت لکھنے والے سے کما حقہ واقف ہونا بہت دشوار ہوتا ہے اور نامکمل واقفیت کی صورت میں ظاہر ہے کہ کسی کی عظمت کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جاسکتا ۔ ''شعوری طور پر پیچیدہ اسلوب بنانا بہت ہی معیوب ہے[4] ۔'' کیونکہ اس سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والے کے ذہن میں خود پیش کردہ موضوع صاف اور مکمل صورت میں موجود نہیں اور وہ اپنی ذہنی الجھن کو چھپانے کے لئے پیچیدہ فقروں میں دوسروں کو

(1) English Prose Style by H. Read, pp 35-7, 41-6.
(2) Philosophy of Style by Spencer, p 9.
(3) *Ibid.*, p. 42.
(4) The Secrets of Style by H. Bett, p. 173.

الجھا دینے کا خواھشمند ھے ۔

پیرہ | پیرہ جملوں کے مجموعہ کا نام ھے اور اس میں موضوع کے ایک پہلو کا مکمل بیان ھوتا ھے ۔

''منطقیانہ انداز میں اس کی تعریف یہ کہجا سکتی ھے کہ پیرہ کسی ایک خیال کے مکمل ارتقا کو ظاھر کرتا ھے ، لیکن خیال چونکہ خود ایک ایسی اصطلاح ھے کہ جس کی معنوی وسعت اور تعریف کی قطعی حد بندی مشکل ھے ، اس لئے پیرہ کی واضح اور قطعی حدود کا تعین بھی دسوار ھے[1] ۔'' نتیجتاً پیرہ کی طوالت اور اختصار کی بحث بھی بے محل غیر ضروری اور پیچیدہ ھے ۔

''جملہ اور پیرا گراف دونوں کے سروع اور آخر کے الفاظ بہت اھم ھوتے ھیں ، کیونکہ سروع میں لکھنے والا پڑھنے والے کے لئے دلچسی پیدا کرنے کی خاطر اور اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی غرض سے خاص پر کشش الفاظ استعمال کرتا ھے اور پھر آخر میں پڑھنے والے کی دلچسپی کو قائم رکھنے کی خاطر الفاظ کی طرف غیر معمولی توجہ دیتا ھے ۔ بعض صورتوں میں دلچسپی پیدا کرنے کے لئے طویل و عریض تمہید کے بغیر ھی اچانک نفس مضمون کا بیان شروع کردیا جاتا ھے ۔ آج کل یہ روش عام ھے ۔ بعض اوقات مصنف جملہ یا پیرا گراف کا آغاز اور خاتمہ الفاظ کی تکرار کے ساتھ کرتا ھے ۔ اس صورت میں یہ دیکھنا چاھئے کہ تکرار موزوں ھے یا نامناسب ۔ بعض صورتوں میں جملے یا پیرا گراف کو نامکمل بھی چھوڑ دیا جاتا ھے ، تاکہ پڑھنے والا تخیل سے کام لے سکے ۔ مصنف کے اسلوب بیان سے آگاہ ھونے کے لئے فقرے میں لفظوں کی تعداد اور پیرے میں جملوں کی تعداد بھی قابل غور ھوتی ھے[2] ۔'' کیونکہ عام طور پر ھر مصنف ایک ھی قسم کے جملے یا پیرے بنانے کا عادی ھوتا ھے ۔ اگر ھمیں کسی مصنف کے متعلق یہ معلوم ھو جائے کہ وہ بالعموم جملہ میں آٹھ یا نو الفاظ لاتا ھے اور پندرہ یا سولہ جملوں سے پیرا گراف بناتا ھے ، تو ھم اس کی تحریروں کو دوسروں کی تحریروں سے فوراً الگ کرسکتے ھیں ۔

---

(1) English Prose Style by H. Read, p. 58.
(2) The Secrets of Style by H. Bett, p. 194.

مثالی اسلوب | اپنی پسند یا ضرورت کے مطابق موضوع منتخب کر لینے کے بعد زبان پر قدرت رکھنے والا مصنف جب کسی تحریر کو جنم دیتا ہے ، تو پھر اس کی تحریر کے اسلوب کے متعلق بحث کرتے ہوئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا زیر بحث تحریر کا اسلوب ایسا ہے کہ جسے مثالی اسلوب قرار دیا جا سکے یا وہ اسلوب ایسا ہے کہ جس کی تقلید کی جا سکے یا بعض دوسرے مصنفین کا اسلوب بھی اس کی مانند ہے ، دوسرے الفاظ میں مصنف کے صاحب اسلوب ہونے کا سوال سامنے آتا ہے ۔

مثالی اسلوب کے سلسلہ میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مثالی اسلوب اور منفرد اسلوب میں قدرے فرق ہے ، کیونکہ ایک مصنف کا اسلوب منفرد ہوتے ہوئے بھی مثالی نہیں ہوسکتا ۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ اُردو ادب کی تاریخ قلمبند کرتے ہوئے زبان سادہ ، صاف ، رواں اور تشبیہات و استعارات سے پاک استعمال کرنی چاہئیے ۔ تو در حقیقت تاریخ کے موضوع کے لئے مثالی اسلوب کا تصوّر پیش کیا جا رہا ہوتا ہے ۔ دریں صورت محمد حسین آزاد کی تصنیف 'آب حیات' کا اسلوب منفرد تو قرار پاسکتا ہے ، لیکن اُسے مثالی قرار نہیں دیا جاسکتا ۔ ''جب بہت سے مصنف ایک ہی موضوع پر قلم اُٹھاتے ہیں ، تو ان کا موضوع ایک ہی ہونے کے باوجود اُن کے اسالیب منفرد اور مختلف ہوتے ہیں ، کیونکہ اسلوب ایک شخص کے ذاتی تاثرات کا آئینہ ہوتا ہے[1]'' اسالیب کے مختلف ہونے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اُن اسالیب میں کوئی ایک عنصر بھی مشترک نہیں ہوتا ، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ایک اسلوب کا کوئی نہ کوئی پہلو ایسا ضرور ہوتا ہے کہ جو دوسرے اسلوب میں موجود نہیں ہوتا ، ایک ہی جیسے اسالیب سے یہ مراد ہے کہ اُن کے اکثر یعنی غالب پہلو ایک ہی جیسے ہوتے ہیں ۔

مثالی اسلوب کے متعلق ڈبلیو رایٹ کا یہ خیال ہے کہ ''ہر حالت میں ، اظہار کی کوئی نہ کوئی صورت ضرور بالضرور ایسی ہوتی ہے ۔ جو ہر

(1) The Problem of Style by M. Murray, p. 15.

اعتبار سے موزوں ترین قرار پاتی ہے[1] ۔'' یعنی ایک موضوع کے لئے ایک مثالی اسلوب ضرور ہوتا ہے ۔

منفرد اور مثالی اسالیب سے بحث کرتے ہوئے تقلیدی یا روایتی اسلوب کا بھی خیال ذہن میں آبھرتا ہے ، روایتی اسلوب کو مشخص کرنے کے لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک ایسا اسلوب ہے ۔ جس میں مصنف نے اپنی شخصیت کو کم سے کم داخل کیا ہوتا ہے ۔ اور اس کے بیشتر پہلوؤں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مصنف نے دوسرے مصنفین کی تقلید کی ہے ۔ یعنی خیالات کی ترتیب اور فقرات کی ساخت سے مصنف کے مقلد ہونے کی غمازی ہوتی ہے ۔

فنکار اگر اپنے آپ کا محاسبہ کرنے اور سوچ بچار کے بعد اپنے مشاہدات اور خیالات و جذبات کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ جس سے دوسرے کلی طور پر آگاہ ہو جائیں ، تو اس صورت میں آس کا اسلوب یقیناً منفرد ہوتا ہے ، لیکن اگر وہ دوسروں کے احساسات و خیالات کا ترجمان بنتا ہے ، تو یقیناً آس کا اسلوب بھی روایتی بن کر رہ جاتا ہے ۔

شخصیت

مصنف کی شخصیت کو اسلوب کے جملہ مباحث میں اس قدر اہمیت حاصل ہے کہ بعض مصنفین نے ''شخصیت کی بنا پر ہی اسلوب کو شخصی اور غیر شخصی اسالیب میں تقسیم کر دیا ہے ۔ شخصی اسلوب (آن کے خیال میں) وہ ہے جس میں مصنف کی شخصیت کی جھلکیاں جا بجا دکھائی پڑتی ہوں اور غیر شخصی اسلوب وہ ہے ، جس میں مصنف اپنی شخصیت کو کم سے کم داخل ہونے دے[2] ۔'' یعنی موضوعات اور زبان دونوں کے برتنے میں اپنی پسند اور ناپسند کو داخل نہ ہونے دے ۔ ''شخصی اسلوب بالعموم واضح اور صاف ہوتا ہے ، گو اس میں باقاعدگی نہیں ہوتی ۔ تصویریں اس میں صاف ہونے کے باوجود بے ڈھب ہوتی ہیں[3] ۔'' اس کے مقابل غیر شخصی اسلوب میکانکی اسلوب بیان ہوتا ہے ۔ جس میں مصنف ایک

---

(1) Style by W. Wright, p 49

(2) Modern Prose Style by B. Dobree, pp. 4-7.

(3) English Prose Style by H. Read, p. 178.

مشین کی طرح سے کام کرتا ھے ۔ وہ اپنی بیاں کردہ چیز میں کوئی دلچسپی نہیں لیتا اور نہ ھی اس کا مقصد کسی قسم کا تاثر پیدا کرنا ھوتا ھے ۔ اس کے پیش نظر صرف ایک بات ھوتی ھے اور وہ یہ کہ جس طرح سے کوئی چیز موجود ھے ، اس کو ھو بہو اسی طرح سے پیش کردے ، یعنی انتخاب اور پسند سے بالکل کام نہ لے ۔

''حقیقت یہ ھے کہ اسلوب میں شخصی اور غیر شخصی کی قطعی تمیز ممکن ھی نہیں[1] ۔'' کیونکہ مصنف کی تمام تر کوشش کے باوجود اس کی پسند کا اظہاراوراس کے انتخاب کا عمل اگر موضوع میں ممکن نہیں، تو زبان کے معاملہ میں ضرور اپنا جلوہ دکھاتا ھے ۔ حقیقت یہ ھے کہ ''جب ھم حواس خمسہ کے ذریعے اثرات قبول کرتے ھیں تو ھمارے جسم سے خود بخود ان کے رد عمل کا اظہار ھو جاتا ھے[2] ۔''

بی ۔ دوبری شخصی اسلوب کے متعلق لکھتا ھے کہ ''ھم جب ایک کتاب کو پسند کرتے ھیں ، تو اس کی وجہ یہ ھوتی ھے کہ اس کتاب میں جس شخصیت کی تصویر پیش کی گئی ھوتی ھے ، وہ شخصیت ھمیں پسند ھوتی ھے ، (اس کا خیال ھے) کہ پڑھنے والا وھی کتاب پسند کرتا ھے ، جس میں لکھنے والے نے اپنی شخصیت کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کیا ھو ۔ اگرچہ بڑا فنکار اپنی شخصیت کی جھلک صاف نہیں دکھاتا ، بلکہ اسے پس پردہ رکھتا ھے[3] ۔'' بہر کیف اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مصنف کی شخصیت اس کی ھر ادبی تحریر میں کسی نہ کسی حد تک ضرور کارفرما ھوتی ھے ۔

انفرادی اسلوب کا تو انحصار ھی مصنف کی شخصیت پر ھوتا ھے ۔ ''کیونکہ انفرادیت خیال کی بجائے اظہار کی انفرادیت ھوتی ھے ۔ (اور پھر) کسی نئی چیز کا انکشاف نہیں کیا جاتا بلکہ کسی قدیم چیز کے ھی ایک نئے پہلو کو پیش کیا جاتا ھے[4] ۔'' مختصر یہ کہ اظہار کی

---

(1) The Problem of Style by M. Murray, p. 41.
(2) English Prose Style by H. Read, pp. 76-7.
(3) Modern Prose Style by B Dobree, p. 4.
(4) Style by W. Raleigh, p. 4.

انفرادیت کا انحصار ھی چونکہ انفرادی سوچ بچار اور احساس پر ھوتا ھے ۔ اس لئے مصنف کی شخصیت سے گریز ناممکن ھے ۔

اسلوب اور شخصیت کے تعلق کو تسلیم کرلینے کے بعد یہ خیال ذھن میں پیدا ھوتا ھے کہ آیا کسی مصنف کا اسلوب خلوص کا حامل ھے یا نہیں ۔ بعض مصنف تو اس سلسلہ میں شخصیت کی عکاسی کو ھی مصنف کا خلوص قرار دیتے ھیں ، یعنی اُن کا خیال ھے کہ مصنف جو کچھ محسوس کرتا ھے ، اگر بعینہٖ اُس کو پیش کر دیتا ھے ، تو اُس کے اسلوب میں خلوص ھے ، ورنہ نہیں ۔ ھارڈ ریس او گریڈی کے خیال میں تو ”خلوص ھی اسلوب ھے[1]“ ۔ لیکن مڈلٹن مرے کی رائے کے مطابق ”عظیم اسلوب وہ ھے ، جس میں شخصیت کی موجودگی اور عدم موجودگی انتہائی درجہ تک ھو[2] ۔“ یعنی تحریر شخصی ھوتے ھوئے بھی غیر شخصی اور غیر شخصی ھوتے ھوئے بھی شخصی ھو ۔ ابوالفضل اسی چیز کو ”حدیث نفس[3]“ قرار دیتا ھوا شخصیت اور اسلوب کے باھمی تعلق کی وضاحت کرتا ھے ۔

قارئین یا سامعین

کسی تحریر کے اسلوب سے بحث کرتے ھوئے ، موضوع ، زبان اور مصنف کی شخصیت کا جائزہ لینے کے بعد یہ غور کرنا بھی ضروری ھے کہ مصنف نے تحریر لکھتے ھوئے کس قسم کے قارئین کو اپنے سامنے رکھا ھے ۔ اور اگر سعوری طور پر اُس نے یہ کوشش نہیں کی تو غیر سعوری طور پر اس نے اپنی تحریر کے متوقع قارئین سے کس حد تک اثر قبول کیا ھے ۔ یا اگر کیفیت ان دونوں صورتوں سے مختلف ھے تو قارئین پر اُس تحریر کا کیا اثر ھوا ھے ۔ ابلاغی عمل کا تعلق ھی چونکہ ایک طرف مصنف کی ذات کے ساتھ ھے اور دوسری طرف قارئین کے ساتھ ۔ اس لئے تحریر کی صورت میں قارئین اور تقریر کی صورت میں سامعین کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ۔ والٹرریلے کے خیال میں تو ”ھر فن میں فنکار کے علاوہ جن دو چیزوں پر غور کرنا

---

(1) Style by W. Wright, p. 59.
(2) Matter, Form & Style by H. O'Grady, p. 121.
(3) دفتر ابوالفضل—مطبوعہ نولشکور پریس لکھنؤ ص—۲۰۹

ضروری ہوتا ہے ۔ وہ اظہار کا ذریعہ اور سامعین (قارئین) ہیں[1] ۔" اسلوب کا تعلق قارئین کے ساتھ اس قدر گہرا ہے کہ اگر یہ کہدیا جائے کہ "قارئین بدل جانے کے ساتھ اسلوب بھی بدل جاتا ہے[2] " ، تو یہ نامناسب نہیں ہوگا ۔ کیونکہ ہر زبان کے ادب کا مطالعہ کرنے سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے ۔ اشراف ادب اور عوامی ادب کی تقسیم ہی اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے کافی ہے ۔ اشرافی ادب میں چونکہ مصنف کے پیش نظر اُمرا وعلما و فضلا کا گروہ ہوتا ہے ۔ اس لئے اس کے موضوع اور زبان دونوں سے بالفاظ دیگر اسلوب سے امارت اور علمیت و فضیلت کا اظہار ہوتا ہے ۔ اس کے برعکس عوامی ادب میں عوام مخاطب ہونے کے سبب مصنف کی استعمال کردہ زبان بھی عوام کی ہوتی ہے اور اُس کا پیش کیا ہوا موضوع بھی عوام کی زندگی سے متعلق ہوتا ہے ۔ اس سلسلہ میں یہ بات مدنظر رکھنے کے قابل ہے کہ اگر مصنف تحریر کو جنم دیتے ہوئے قارئین کو بھول جاتا ہے ۔ تو وہ اپنے معیار سے نیچے نہیں گرتا ۔ اس کے برعکس اگر وہ قارئین کو بھول کر تحریر کو وجود میں لاتا ہے ، تو اُس صورت میں اُس کے اپنے آبگینہ دل کو ٹھیس لگتی ہے اور اُسے اپنے معیار سے نیچے آنا پڑتا ہے ۔ اور اس طرح اُس کی تحریر خلوص سے عاری ہوجاتی ہے ، کیونکہ وہ اپنے قارئیں کے نقطہ نظر کے مطابق ہی سوچتا ہے اور اُن کی پسندیدہ زبان ہی استعمال کرتا ہے ۔ اس کوشش کے نتیجہ میں جو ادب تخلیق ہوتا ہے ۔ اُس میں یہ خامی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ پائیداری اور دائمی زندگی سے عاری رہ جاتا ہے ۔ کیونکہ قارئین کے بدلنے کے ساتھ ہی اُس کی مقبولیت بھی ختم ہو جاتی ہے ۔ "اسی طرح لکھنے سے پیشتر اگر مصنف اسلوب کے متعلق غور کرنا شروع کر دیتا ہے ، تو وہ اپنی راہ سے گمراہ ہو جاتا ہے ۔ کیونکہ اس کا پہلا کام واضح ۔ صاف اور قطعی فکر ہے[3] ۔" جس کا نتیجہ اسلوب ہے ۔ لیکن اس صورت حال کے باوجود

---

(1) Style by W. Raleigh, p. 4.

(2) *Ibid.*, p. 71.

(3) Modern Prose Style by B. Dobree, p. 218.

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مصنف کو قارئین کی دلچسپی کے لئے ، ان کو متاثر کرنے کیلئے اور ان میں خاص قسم کے جذبات اور خیالات پیدا کرنے کیخاطر ، ان کی پسند و ناپسند کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ ہر دو مذکورہ صورتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے مصنف کیلئے جو سلامتی کی راہ دکھائی دیتی ہے۔ وہ ان ہر دو صورتوں کا امتزاج ہے اور توازن و اعتدال کی کیفیت ہے۔ مصنف کی کامیابی کا راز اس کوشش میں مضمر ہے کہ وہ نہ ہی بالکل اپنی پسند کا خیال رکھے اور نہ ہی اپنے آپ کو کلی طور پر قارئین کے سپرد کر دے ، یہ راہ دشوار۔ مشکل پسند اور ہمت آزما ضرور ہے۔ لیکن اِس سے گریز بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ایک اعلٰی درجہ کے ادب پارہ کی تخلیق خون جگر کے بغیر ممکن بھی نہیں۔ ایک اسلوب سے قارئین کس حد تک متاثر ہوتے ہیں؟ اِس سوال کا جواب وہ تمام ادبی تحریکات ہیں۔ جو مختلف زبانوں کے ادب میں جنم لیتی رہی ہیں۔ اِن تحریکوں کے پیش رو ایک دو مصنف ہی ہوا کرتے تھے۔ اُردو ادب میں سجاد حیدر یلدرم اور منشی سجاد حسین ایسے ہی دو درخشندہ ستارے ہیں ، جن کی روشنی میں بہت سے ادیب ادب لطیف اور مزاح نگاری کی منزلوں تک پہنچے ہیں۔

اسلوب نثر کے متعلق پیس کردہ مباحث سے یہ نتائج مرتب ہوتے ہیں کہ گو نثر کیلئے نظم سے نہیں ، بلکہ شعر سے الگ تھلگ ایک اسلوب کی ضرورت ہوتی ہے ، لیکن شعر اور نثر کے اسالیب کے ڈانڈے بھی ایکدوسرے کیساتھ اس طرح پیوست ہیں کہ ان کی تمیز کیلئے کوئی قطعی حد بندی دشوار ہے۔ جس طرح سے دوسری تنقیدی اصطلاحات کا قطعی مفہوم متعین کرنا دشوار ہوتا ہے۔ اسی طرح سے اسلوب کی اصطلاح کی معنوی وسعت کا تعین بھی مشکل ہے۔ ہم اسلوب سے بحث کرتے ہوئے صرف اُن پہلوؤں اور عناصر کی نقاب کشائی کرسکتے ہیں ، جن کا جائزہ لینا کسی تحریر کے اسلوب سے بحث کرتے ہوئے ناگزیر ہوتا ہے۔

تحریر کے تجزیہ سے دو اهم چیزیں همارے سامنے آتی هیں ، مضمون یعنی معانی اور زبان یعنی الفاظ اور اُن کی ترکیب و ترتیب ۔ اسلوب سے متعلق دیگر جملہ مباحث ، اسلوب کی ان دو شاخوں کے هی برگ و بار هیں ، گو مشرق مصنفین زیادہ اور مغربی مصنفین کم ' زبان کی بحث کو هی اسلوب کی بحث قرار دیتے رهے هیں ' لیکن موجودہ دور میں تحقیق و تنقید جن راهوں پر چل نکلی هے ۔ اُن کے پیش نظر اسلوب کی اصطلاح معانی اور زبان دونوں پر حاوی هے ۔ اسلوب سے بحث کرتے هوئے نہ تو موضوع هی سے مفر هے اور نہ زبان هی سے گریز ۔ جس طرح سے تندرست هونے کیلئے ذهن کی سلامتی کے ساتھ جسم کے درست اور بے داغ هونیکی ضرورت هے ۔ اُسی طرح سے اسلوب کی عظمت اور اُس کے حسن کیلئے معانی کا پر وقار اور زبان کا صحیح هونا لازمی هے ۔

اهل معنی کو هے لازم سخن آرائی بھی
بزم میں اهل نظر بھی هیں ، تماشائی بھی

and had suggested to make it a centre of Oriental Learning like London School of Oriental Studies, Bhandarkar Institute, and Shanti Nekitan in India, and Alazhar in Egypt. Two years have elapsed and the revitalisation process has not even been initiated. I appeal to the Chancellor's Committee to take initiative in the matter and prepare a scheme for rehabilitating and revitalising the college I also appeal to the Orientalists to come together and work for the advancement of the Oriental Studies If you join, I am sure, nobody on Earth will be able to touch your institution.

In the end I have to thank you Mr. President and Dr. Sayyed Abdullah, Principal of the College who have done yeomen service to URDU and other Orienal Languages for giving me the pleaure of addressing the Old Boys of the College to-night. Khuda Hafiz! Ulum-i-Mashriqi Zinda Bad!

and Colleges in URDU so that its votaries think and talk in it to our Agricultural population which forms 85% of our people. I am not for a moment suggesting that URDU has reached that stage in its development which is attained by English, Arabic, Persian, German, Turkish, Japanese, etc., but what I do say is that it is capable of making those heights which are at present attained by these languagges and further that URDU is capable of replacing English as medium of Instruction almost with immediate effect. No doubt we will face difficulties in the beginning but is it not that all paths leading to greatness are always beset with difficulties and it is by surmounting these difficultie that individuals as well as nations reach the highest pinnacle of glory and achievement. English which is at present a queen among modern languages has not attained its present position overnight but those who write and think in it or whose mother-tongue it is have worked hard over the centuries to expand and develop it. We all know that not many centuries ago, Latin and Greek held sway over the native land of ENGLISH, just as ENGLISH is holding sway at present over the native-land of URDU, and it is only by removing the hold of Latin and Greek that not only the ENGLISH languague but the nations whose mother-tongue it is, became foremost nations in the world. Obviously no nation can either prosper and progress or develop its personality and intellect by talking and thinking in Foreign language : at present with ENGLISH as medium of instruction we are producing a fair number of young men who use their heads for carrying loads rather than for thinking. A couple of years ago when I visited Academic Institution in Istanbul and Ankara, Professors there expressed amazement at our retaining ENGLISH as medium of Instruction, because as one of them put it, it is shackling Pakistani intellect in rings of Foreign steel.

Your Alma Mater is the haven for URDU and other Oriental Languages whose cause it has served since its start in 1870 and because of its signal service to these languages it has acquired an international position in the intellectual world of to-day. The Punjab University Commission wanted to re-vitalize the College

to-day nothing that is Pakistani is good enough for us so much so that some of us believe, surely mistakenly that we have no language which we may call our own and that no intellectual heritage worth the name has come down to us from our progenitors. That both these conceptions are wrong need no elaborate arguments, we have both a language and an intellectual heritage -URDU is our national language which has Snfficeint literature and is capable of making further progress Unfortunately there are some people to-day who consider that URDU and other Oriental Learning are of no importance in human progress. They think that URDU has no special claim to be considered the National Language of Pakistan and that Punjabi, Sindhi, Pushto, Baluchi, etc,, have equal claims to that honour In their own way and in their own limited spheres of influence, these dialects are useful as are Scotch in Scotland, and Welsh in Wales in the United Kingdom but none of these are as widespread as is the case with URDU. Further, none of these dialects would appear to possess the capacity to be developed into a language which, depicts truly and correctly, the genius of our people URDU language which is said to be born in the Punjab, has already made its mark by doing remarkable sevice to literature and religious thought in the Indo-Pakistan subcontinent. Thanks to the Official Language Committee who under the very able guidance of the learned Chief Justice, Dr. S. A. Rahman has translated thousands of official terms and phrases into URDU thereby rendering it fit for adoption as "office language" without any further loss of time Its usefulness to Science is in no way less than its usefulness to History, Religion and as an Official language, it possesses the remarkable quality of expansion Speaking with some authority about the Usefulness of URDU to Agriculture, I can say that of the odd 10,000 or so Technical Terms employed in the Teaching of Agriculure, URDU has words and equivalents for 75% of them and the remaining 25% are Technical Terms which because of their International Status and usage have to be retained, as they are retained in other languages like English, German, French, etc. I would further say that in order to make modern Agriculture a going concern and to hasten its popularity and adoption among our rural people, it should be taught in our Schools

mad Iqbal, Dr. Leitner, Fayzul Hasan, Shairani Dr. Shafi and several other younger galaxy of talent like Faiz, Akhtar Shairani etc , etc. I have however listened with great concern from you, Mr. President, that this great College is at present facing certain difficulties, and certain prejudices are weakening the institution and are hindering its progress and also that there is some whispering about its abolition or curtailment As regards its abolition, let me assure you, Mr. President, we will not allow it to happen and I am absolutely certain that this will never happen. I am also positive that other difficulties will also be overcome in the near future, because, personally I have great faith in the wisdom of the learned members of the Chancellor's Committee who will surely come to the rescue of the institution, if there is any real danger to it at all. I hope, the Arabic Professorship will also be filled and other necessary adjustments will also be made in the immediate future and the College will be allowed to develope in the natural direction But all this would require organisation and collaboration on your part and, my dear friends, let me once more assure you that I will always be prepared to join hands with you in all the efforts that you will make for the defence and progress of this great institution of yours-which has been a centre of culture and thought for about a century

Mr. President, kindly permit me now to refer briefly to some general questions relating to Urdu and Oriental Learning. A few moments earlier, I had referred to the mental weariness witnessed among our intelligentsia and had emphasised the need for taking stock of the situation. Let us pause and ask ourselves the question: What is the reason for our present position in the presentday field of human knowledge, thought and endeavour? Is it poverty? Is it malnutrition? Is it lack of proper clothing and shelter? No doubt, for ordered development of human society, prosperity, clean and healthy surroundings, sufficiency in food, clothing and shelter are essential but to attain proper growth and position as Thinkers, suitable language to serve as vehicle for our thoughts as well as easy access to the library of wisdom of our forefathers are essential pre-requisites.

A century and a half of slavery to a Foreign rule has so obsessed us with inferiority complex that

ADDRESS
TO THE
Oriental College Old Boys' Association

delivered by

Dr. KHAN A. RAHMAN,

on the 25th of March, 1956.

Mr. President, Ladies and Gentlemen !

I am most grateful to you, Sir, for asking me to address the Old Boys of the University Oriental College to-night. It is indeed a great honour conferred by the Alumni of the Oriental College on one who has no pretentions to Oriental Learning. No doubt, I believe in my own small way, as you have been generous enough to mention it, that the progress and prosperity of our young Province, as of the whole of our Country is fundamentally and intimately associated with our Oriental Learning which can be rightly described as the Golden Key to the Treasure House of the Wisdom, Knowledge, and Experience of our forefathers who were the leaders of thought and men of noble deeds in this world only a couple of centuries ago. By allowing the Golden Key to rust through disuse born of mental weariness, we have relegated ourselves to the present day world of art, science and action. If we have to live, it is high time we took stock of the situation and moulded our actions and thoughts accordingly.

The Oriental College is one of the oldest institutions of the Indo-Pakistan Sub-Continent and has served the cause of Oriental Learning in a most splendid manner throughout its long life. It has a brilliant tradition of scholarship and authorship and too numerous achievements to be enumerated here. The names of some very great personalities in the realm of letters are aasociated with it; such as Muhammad Hussain Azad, Sir Muham-

Presidential Address

OF

Dr. Khan A. Rahman

B.Sc. (Hons.) (Edin), Ph.D. (London)
Ex-Director, Agriculture Punjab and
Ex-Member, Syndicate Punjab University

READ AT THE

2nd Annual Meeting

OF THE

University Oriental College Old Boys' Association

1956.

اورینٹل کالج میگزین

اگست ۱۹۵۶ء

جلد ۳۲ عدد ۴

عدد مسلسل ۱۲۶

مدیر :—

ڈاکٹر سیّد عبداللہ

★

باہتمام مسٹر احسان الحق ہڈ کلرک اورینٹل کالج میگزین لاہور،
پرنٹر و پبلشر اورینٹل کالج میگزین، پنجاب یونیورسٹی پریس لاہور
میں طبع ہو کر اورینٹل کالج لاہور سے شائع ہوا۔

ترتیب

---

۱۲ پنجاب یونیورسٹی پریس ، لاہور-- ۳۰۰--۵۶-۱۰-۱

انتشارات دانشگاه پنجاب

مدار الافاضل

تالیف

الله داد فیضی سرهندی بن اسد العلماء علیشیر السرهندی

مؤلف بسال ۱۰۰۱ هجری قمری

بامقابلهٔ نسخ متعدد خطی و تصحیح و توضیح

باهتمام

دکتر محمد باقر

استاد دانشگاه پنجاب و رئیس قسمت فارسی

لاهور ۱۳۳۴ شمسی

مدار الافاضل

اثر

الله داد فیضی سرهندی

رب یسّر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم و تمم بالخیر

ای نام تو ورد هر زبانی دگراست[1]
وز[2] هر دهنی کام و بنای دگر است
نام تو مدار عالم آمد برحق[3]
زان نام ترا نام و نشانی دگر است

مدار افاضل روزگار و مختار اخیار[4] نکته گذار در مبداء هرکار و در مطلع هرگفتار به حمد و ثنای آفریدگار عزّ شانه، و جل برهانه، است که نوع انسانرا از سایر اجناس بتفضیل نطق رنگا رنگ و مراتب[5] خرد و فرهنگ مختار[6] ساخت و علم علّم آدمَ الاَسماءَ کلّها بر فراز ملک و ملکوت بر افراخت و در مکتب ارشاد و هدایت از مرتبه تعلم و تلمذ بدرجه تعلیم و استادی ثم اَنبِئْهُم بِاَسْمَائِهِمْ رسانید و بهمین قدر و تعلم و تعلیم بموجب قُلْ هَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ وَالَّذِیْنَ لَاْ یَعْلَمُوْنَ او را مشرف و مکرم برملایکه گردانید، تا لغات مختلفه و کتاب مؤتلفه که چون جواهر زواهر و لآلی متلالی از حقهای افواه اسافل و اعالی بتواتر و توالی بیرون می آید صرف ذکر او نماید والحق که ذکر ذاکران بهر لغت و زبان[7] راجع بهمان ذات مستجمع صفاتست:

هرکس بزبانی سخن عشق تو گوید
مطرب[8] بسرود و غم عاشق بترانه

---

۱ - فقط در متن نسخهٔ (ب) این ذکر شده است که این دو بیتی از آثار مؤلف است، در نسخ دیگر سخنی از آن نیست -
۲ - در (پ) ۳ - الحق (ا) ۴ - اختیار (پ) ۵ - بمزیت (ب) ۶ - ممتاز (پ)
۷ - بیان (پ) ۸ - عاشق بسرود غم و مطرب به ترانه (ب و پ)

و صلوات صلات فایض البرکات و سحاب زاهره اللمعات بانواع لوامع بسلطان بعدد اللغات والکلمات بآن افصح و عرب و عجم سرا دبستان دون والعلم المبعوث بجوامع الکلم سخن سرای وَ مَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوَای رهبای ما ضَلَّ صَاحِبُکُم وَ مَا غَوَی صلی الله علیه وسلم و آله و اصحابه و احبابه و عترته اجمعین -

اما بعد میگوید فقیر حقیر متر مقصیر معتکف زاویهٔ خمول و دردمندی الله داد فیضی بن اسدالعلماء علیشیر السرهندی که چون علم لغت تاج جمیع علوم است و صراح و مهذب تمام فنون و مورد الفضلا است و ادات البلغاء و علی الخصوص (ورق ۲) شرح ایام که فضلاء انام به اشعار اساتذهٔ کرام و کتب و تواریخ و انشا مثل تمام پیدا کرده اند و در حل لغات ابیات دقیقه و در تحقیق لسان الشعراء سعی و جد مبذول نمایند بنابران بخاطر فاتر این قاصر خطور کرده که کتابی درین فن که محتوی السنهٔ متنوعه باشد تالیف باید بنوعی که جامع جمیع کتب مشهوره و ناسخ[۲] تمام نسخ معروفه باشد - هر چند از نوادر حوادث ایام و تراکم نوادب شهور و اعوام آتش شوق منطفی و آب طبیعت جامد و منهی بود و دل غمدیده و خاطر محب کشنده بآن مساعدت نمی نمود ، امّا چون بعضی از اجلهٔ اصحاب و برخی از اعزه احباب که کمال ارتباط و اختلاط باین احقر الطلاب داشتند درین باب ساعی و در تالیف این کتاب داعی شدند ، ناگزیر راه گریز نماند بالضرورت در تتبع و تفحص جمیع کتب این فن گردید -

پس لغات تازی از صراح و مهذب الاسماء و تاجین و قنیة الفتیان و نصاب الصبیان و شروح آن رقم یافت و لغات پارسی و دری و پهلوی و ترکی آنچه از کتب متقدمین پیدا شده اند چنانچه زفان گویا که او را پنج بخشی نیز گویند و ادات الفضلا

۱ - پیر (الف) دبیر (ب و پ) ۲ - ناطق (حاشیه)

و تبخری و حل لغات الشعراء و شرفنامهٔ ابراهیمی و از کتب متاخرین تحفة السعادت اسکندری[1] و موید الفضلا که این هر دو کتاب خصوص موید الفضلا بسیار خوب واقع شده و در غایت جامعیت است ، چنانچه مؤلفش در تعریف آن کتاب گفته که این نسخه کافی و شافی است برای خواندن و سبق گفتن شاه نامهٔ فردوسی طوسی و خمسهٔ خواجه نظامی و سنهٔ سنائی و دواوین خاقانی و انوری و ظهیر و عبهری و حافظ و سلمان و سعدی و خسرو و جز آن ، و هر دو آن کتاب معموله اند از کتب معتمده و معتبره جامعه لغات تازی از صراح و تاجین و نصیب الولدان و دستور و خلاصهٔ پارسی از ضمیر و دستور و فرهنگ فخر قواس و علمی و علی بیک بی و شرح مخزن و قنیة الطالبین و موايد الفوايد و لسان الشعراء و طب حقايق الاشيا باوجود این همه جامعیت احتیاج بسیار بفرهنگهای دیگر می افتاد و فی الواقع مشکلات بشمار از جائیهای دیگر میگشاد و بس متوکل علی الله ادهم قلم را بامداد مداد در مضمار آن سواد جولان داد و چون بالفت بود جمع آن بخاطر سهل نمود ، خواست که تک در تک در حال بی توقف و ملال گوی از میدان ببرد ـ بعد از شروع در آن تحقیق الفاظ و اوزان آن و تصحیح اعراب و بیان آن سنگ راه می گردید و در تشخیص آن چندان محنت کشید و کوشید و چندان جان کندید که من دانم و جان من :

جان کنده ام که گشت میسر وصال دوست
بنداد را خیال که آسان بر آمده است

و چون مدار افاضل روزگار بر آن دید این کتاب را مدار الافاضل نامید و به ترتیب حروف تهجی بر بیست و هشت باب و در هربابی بترتیب همان حروف مرتب گردانید و اکثر الفاظ متناسبه را پهلوی

---

۱ ـ سکندری (ا)

یکدیگر رقم کرده تا زود سبب حصول مقصود گردد ـ و کلمات عربیه
را چون افضل اللغات است مقدم ساخت و او را بعلامت عین و بعد آن
فارسی را بفا و ترکی را بتا معلم گردانده و در ضمن بعضی کلمات که
محتاج مستشهدات بودند باشعار امانده موکد و موید نموده و در بعضی
جا اشعار باشعار خود بذکر لمولفه نیز کرده هر چند میدانست که
استشهاد از کلام غیری می باشد اما بواسطه اتباع بعضی ازین سلف
اختیار افتاده و بنا برین مقدمات مسلم است که نظر بجمعیت این همه
نسخ گویم که این مجموعهٔ من کافیست و وافی والاّ نظر بواقع ادعائیست
و لا فی بجهت آنکه جمع جمیع کتب لغات و ضبط تمام کلمات متعذر و
متعسر است ـ امّا بهر حال این مجموعهٔ من بمراتب زیاده بر ازانست و در
تهذیب و حسن ترتیب بهتر ازان ـ مامول از ارباب فضل و کمال و
مسؤل از اصحاب کرم و افضال آنکه چون نسیان بر انسان طاریست اگر
بر هفوات و زلات این فقیر حقیر مقر بتقصیر اطلاع یابند بدیده اغماض
بپوشند و حتی الامکان در اصلاح آن کوشند ـ وهوالهادی الی سبیل الرشاد
و السداد و منه المبدا و الیه المعاد ـ

باب الالف

آئندگان (ف) موجوداب -

آئین (ف) بمد ، رسم و نهاد و در حل لغا سب بمعنی آرایس و عادب -

آئین جمشید (ف) رسم جمشید و نوای و لحنی -

آئینه و آینه (ف) معروف ، عرب آنرا مراب و هند آنرا آرسی خوانند -

آئینهٔ چرخ (ف) آفتاب -

آئینهٔ یوسفان بینش (ف)[1] آفتاب -

آب (ف) معروف و مدت ماندن آفتاب در برج اسد و قیل در برج اسد و قیل در عقرب ، روستان یکماه شمرند و آنرا آب ماه و آبان خوانند و اهل هند بهادون و بمعنی آبروی و رونق و جاه و فیض و عطا و رواج و رحمت و تیزی و روح و شراب خالص و نیز بمعنی طریق و شکل -

آب آتش پرور (ف) تیغ آبدار و مصقول -

آب آتش رنگ (ف) مئی سرخ -

آب آتش شد (ف) در شور و غضب شد و یا آب گرم شد -

آب آتش نمای (ف) مئی سرخ -

آب آتشین و آب میگون (ف) اسک عاسقان و مئی سرخ و خون -

آب[2] آذرآسا (ف) مثله - ۳

آب آسیا (ف) آسای که بزور آب گردد -

آب آور و آب احمر و آب یاقوت دار (ف) مئی انگوری و مئی خرما و نیز مئی سرخ -

آباد (ف) معروف و آفرین -

[آبادان] رک - آبدان -

آبادانیدن (ف) ستوده و ستوده آمدن -

---

۱ - آئینهٔ یوسفان وش (سوید)   ۲ - آب اوژا سا (پ)   ۳ - رک : آب آتش نمای

آبار (ف) بمد، جنسی از سرب که آنرا سرب سوخته گویند، چنانکه درین بیت است :

کمر ز لعل و دمم دار و تاج از مرجان
قصب ز سوسهٔ پولاد خروف از آبار

آب ارغوانی و آب شنگرفی (ف) مئی سرخ -

آب از جگر بحشم (ف) بمعی غم دهم -

آب افسرده (ف) نباله بلور و طراوت و جاه او برد و او را خجل بیغ و امثال آن -

آبان (ف) مدت ماندن آفتاب در برج عقرب و آنرا آبان ماه نیز گویند و اهل هند پهاگن گویند و نیز یازدهم روز از ماه چنانکه در قطعهٔ مؤلف مذکور شد و قبل ماه کذا فی الاداب[1] -

آب اندام (ف) صافی او -

آب انگور (ف) می -

آب او برد (ف) یعنی رونق و آب کرد -

1 - آبان - ف - سه معنی دارد -
اول - فرشته ایست که بر آهن موکل است و تدبیر امور مصالحی که در ماه آبان و روز آبان واقع شود بدو متعلق بود -
دوم - ماه هشتم بود از سال شمسی و آن مدت ماندن نیر اعظم است در برج کژدم حکیم خاقانی فرماید شعر

گرچه در غربت ز بی آبی شکسته خاطرم
ز آتش خاطر بابان صرمران آورده ام

ناصر خسرو علوی . شعر

آن روز که هول آن برآید دور از مه و ز آفتاب رخسانی
و ز چرخ ستارگان فرو ریزد چون برگ از ان ز باد آبانی

سوم - نام روز دهم است از هر ماه شمسی و بموجب قاعده کلیه که نزد پارسیان مقرر است که چون نام روز با نام ماه موافق آید آن روز را عید گیرند - درین روز جاجت از امیران و سلاطین و بزرگان خواستن مبارک و نیک دانند و اهل هند آنرا ماه پهاگن نامند - (فرهنگ آنند راج)

آبان (از آب āp اوستا api پارسی باستان و آپ āp پهلوی بمعنی آب) ، در اوستا بارها ''آب'' بمعنی فرشتهٔ نگهبان آب استعمال شده و همه جا بصیغهٔ جمع آمده - نام هشتمین ماه سال و دهمین روز ماه نیز ''آبان'' بصیغهٔ جمع بجا مانده ، یعنی پاسبانی این ماه و این روز بایزد آبها سپرده شد - در پهلوی نیز چنانکه از بندهش برمیآید نام ماه و روز مزبور āpān است -

(فرهنگ ایران باستان ۶۵-۶۹ ، آثارالباقیه ۴۶ و ۲۰ و ۳۱ Nbyerg ii,
حاشیهٔ برهان از دکتر محمد معین)

آب او بریز (ف) یعنی رونق و جاه او بروسمه روی و شرمنده و بی نور کن -

آبای (ع) بمعنی پدران من ، پارسایان جزی را گویند که در ولایت در ساغری اسپ از جنس جامه مخمل و سقرلاط و جز آن اندازند ، لمؤلف :

بدر کرده رکاب و کهکشان همچون قطاس
ار شمی آبای و زین پوس گسته سرخ فام

آبای علوی (ع) کواکب سبعه -

آب باد رنگ (ف) خون و اشک عاشقان -

آب بدل میشود (ف) سردی که در دل می افتد -

آب بقم شد (ف) سرخ شد -

آب پیکران (ف) رونق سی و سس دیگر که منجهان وجوه خوانند -

آبت ریرکاه است (ف) یعنی رونق تو خس پوش است -

آبتین[1] (ف) بمد و بای مثلثه وزن آب چین ، نام پدر فریدون پادشاه ایران -

---

۱ - آتبین (برهان) گویند نام پدر فریدون فرخ بوده ، در فرهنگ جهانگیری بابای مکسور و بای فوقانی و یای معروف آورده ، رشیدی بسکون با و کسر تا نوشته و صاحب برهان بکسر ثالث و رابع بوزن عابدین دانسته و گفته بسکون ثالث و تقدیم رابع بر ثالث نیز دیده شده علی ای حال نسبش بجمشید جم می پیوندد اما پسر زاده جمشید نخواهد بود ، حمد الله مستوفی در تاریخ گزیده خود نوشته که میان فریدون و جمشید هفت پشت فاصله بوده است و نام هر یک ازانها برنکهای گاوان بوده ، و ابو ریحان احمد بیرونی خوارزمی صاحب آثارالباقیه که از معارف فضلاء بوده کتابش الآن در نزد فقیر حاضر است و در صحت قول گزیده برهان شده چه نام و رنگ آنها را هم نوشته مثل گاو زرد و گاو سیاه و گاو دیزه - بهر صورت بعضی گویند این در پارسی زند تمی پیدا شده است ، ازین قرار معنی پیدا شده از آب خواهد بود چنانکه گفته‌اند خراتین یعنی کرم پیدا شده از خره یعنی گل و لای و خراطین معرب آن و در فرهنگ دساتیر که ترجمهٔ فرزانگان پارسی‌ست و دانسته او را از هندوستان بایران آورده‌اند و اینک حاضر است نوشته آتبین بر وزن کابین نام پدر فریدون و بمعنی کامل‌النفس و نیکوکارست خاقانی شیروانی گفته : شعر

خاصهٔ سیمرغ کیست جز پدر رو ستم
قابل ضحاک کیست جز پسر آتبین

در اوستا āthvaya نام پدر فریدون است و بنابراین صحیح ''آتبین'' است که ناسخان در رسم‌الخط آنرا به ''آبتین'' تبدیل کرده‌اند ، اما در سانسکریت āptiyā با تقدیم باء فارسی بر تاء آمده ''بارتوله ۳۲۳'' و بنابراین آبتین نیز محملی پیدا کند طبری ''افریدون بن اثفیان'' ج ۱ ص ۹۹ ، بیرونی ''اثیان'' ، ''آثارالباقیه ۲۲۶'' - مجمل‌التواریخ و القصص ، ص ۲۶ ''اثفیال= اثفیان'' - شاهنامه '' آتبین '' - (دکتر محمد معین ، حاشیه برهان)

آب جامه (ف) پیاله و اوند شراب ، در ابراهیمی معنی جام و اوند نیز آمده ـ

آب جگر (ف) خون و گریهٔ غمناکان ـ

آب چرا (ف) بمد و جیم فارسی ، خوردنی انسان و بریان و وحوش و طیور و جزآن ـ

آب حرام (ف) شراب و نیز کنایت از عشق و محبت است ، لیکن آب حرام ازان گفته‌اند که زاهدان از و محروم اند کذا فی‌السوید و این معنی احیر هیچ لطفی ندارد و موافق معنی اول خواجه حافظ :

ترسم که صرفه نبرد روز باز خواست
نان حلال شیخ ز آب حرام ما

آب حیوان (ف) آب حیات و آب خضر نیز ، گویند پارسیان بسکون با استعمال کرده اند ـ

آب خاطر (ف) رونق و روشنی خاطر و نیز صفای فکر و فکر صائب ـ

آب خرابات (ف) بمد، شراب ـ

آب خزان (ف) بمعنی باران خزان ـ

آب خشک (ف) پیاله بلورین و آبگینه و آن مجرد بی خوردنی موید معنی اول است این بیت همایون :

چو در آتش لاله افتاد مشک
دم از آتش تر زن و آب خشک

آب خضر (ف) بکسر ضاد و سکون راء ، آب حیات و حیات ابدی و علم لدنی ، موید معنی اول اولست این بیت :

در کلک تو سرّ عیب مضمر
در لفظ تو آب خضر مدغم

آب خفته (ف) آب بسته و ژاله و برف ـ

آب خوار آتشین (ف) شراب خوار و خون خوار ـ

آبخور (ف) با بای مرقوف و واو معدوله . مقام آبخوردن که عرب آنرا منهل و مورد خوانند و همدنین گهاب و آبشخور نیز گویند ، چنانکه متضمن هر دو لفظ است این دو بیت کمال سماهانی :

اینک سپی بماند که در عدل دور تو
بزغاله از دهانهٔ شیر آبخور کند
هر کجا دار سر رایت تو سایه فگند
کبک و شاهین بهم آیند سوی آبشخور

آب خورشید (ف) بمعنی آب حیات و این معنی مجازی است و از قبیل ذکر سبب و اراده مسبب است زیرا که نزد حکما همین آفتاب موثر است برای حیات حیوانات وآفتاب تجلی روح است و ماه ظهور نفس ـ

آب خوست (ف) بفتح خا و واو، جزیره را گویند که درمیان دریاهای بزرگ باشد ، موئد این معنی بیت است ، عنصری :

تنی چست از موج دریا بجست
رسیدند نزدیک این آب خوست

آب خوش خوردن (ف) باضافت ، همان آب خوش و بموقوف آسودن و راحت یافتن -

آب خیز (ف) با یای موقوف ، موج آب که آنرا خیز آب و تره آب و کوهه آب نیز گویند [1] -

آبدار (ف) نام گیاهی است و مروارید ، اول جنس و نو و تیغ بران و مثل آن در ادا تست بمعنی تر و تازه و روشن -

آبدان (ف) بمد ، مختصر آبادان ، معروف و نیز نشیبی که درد آب قرار گیرد و عرب غدیر خوانند و آوند آب و نیز چیزی که آب دران نگاه دارند ، مشتمل بر معنی دوم است این بیت بوستان :

فتد تشنه در آبدان عمیق
که داند که سیراب میرد غریق

آبدان (ف) مختصر آبادانی

آب در جگر (ف) مستی و تونگری

آب در جگر ندارد (ف) یعنی بغایت مفلس است و بجای آب آهی نیز گویند -

آب در جوی (ف) دولت و عظمت و فیروزی و بیغمی در ذات و فرماندهی -

آب در جوی تست (ف) یعنی دولت و اقبال در دست تست -

آب دست (ف) بمد ، وضو و استنجا بآب و شیرین کار و پاکدست و زاهد پاک -

آبدستان (ف) آفتابه و ابریق -

آب دندان (ف) تیزی و تابش دندان و ضعف و مشقت و نیز میوه امرود و در ابراهیمی است بمعنی ضعیف و سفت آید و نیز بمعنی سحر و گناه و در حل لغاتست بمعنی زبون و مغلوب ، موید معنی اولست این بیت انوری :

نسیم او که صدف را بآب دندان کشت
زلال خضر ز دندان مار بکشاید

---

[1] - زمینی باشد که هر جای آنرا اندک بکنند آب برآید و در بعضی فرهنگها طغیان آب که آنرا خیزآب نیز گویند و در بعضی موج آب که بلند شود ، اوحدی گفته :

اندرین آب خیز نوح توئی و اندرین دامگه فتوح توئی
(فرهنگ آنند راج)

صفت نسیم است که صدف را به برافت دندان کشته است و باد نرم او آبحیات ار دندان مار بکشاید و بتائید معنی صفت نیز انوری :

آب دندان حریفی آوردی
رایگان از تو کی تواند جست

یعنی مفت حریفی آوردی و موید معنی ضعیفیست این بت سلمان :

دست زربخشت ازان کان دردهان انداخت خاک
بحر پر دل را حریفی آب دندان یافته

یعنی دست تو بحر را حریف ضعیف یافته است ۔

آب ده دست (ف) باضافت ، حضرت رسالت پناه و نیز آنکه آرایش صدر ازو باشد و آنکه جاه صدر ازو بیفزاید و نیز رونق ده سخاوت ۔

آب دیده جام (ف) می و جرعه وی ۔

آب راهه (ف) گذر آب هرجا که باسد یعنی سیل ۔

آب رجب (ف) رونق و رواج ماه رجب و زر ۔

آب رزان (ف) می انگوری ۔

آب رسانید (ف) بگریست ۔

آب رکناباد (ف) چشمه ایست در رکناباد و آن چشمه در شیراز واقع است چنانچه خواجه حافظ می فرماید ؎

بده ساقی مئی باقی که در جنت نخواهی یافت
کنار آب رکناباد و گلگشت مصلا را

آب رکنی (ف) همان آب رکناباد که نمازگاه شیراز در آنجاست ۔

آب رنگ (ف) نری و تازگی و بواو عطف رنگیست از سپیده و شنگرف که بر روی مالند آنرا گلگونه نیز گویند، موافق این معنی خواجه حافظ :

ز عشق ناتمام ما جمال یار مستغنی است
بآب و رنگ و خال و خط چه حاجت روی زیبا را

آبرود (ف) بمد و قصر ، در سکندریست بوزن افزود ، سنبل که هندش بالچهڑ گویند ۔

آب زده (ف) بمعنی گرد فرونشانده و تسکین داده ، مفلسی گوید :

در انتظار خیال تو مفلسی شب و روز
درون خانه دل را بدیده آب زده

آب زر (ف) مئی زعفرانی ۔

آب زن (ف) آرام ده و نیز حوض خرد ۔

آب زهره (ف) می و صبح و تابش او ۔

آبس[1] (ف) بمد و کسر بای ابجد ، نام شهریست ۔

---

۱ ۔ و در عربی ابس بالفتح جای درشت و شکستن و خوار و حقیر کردن ۔ (موید)

آب سبحه (ف) رونق تسبیح -

آبست (ف) بفتح یکم و کسر دوم و بمد نیز ، حامله و نهفت جا -

آب سبک (ف) هاضم و گوارا -

آبستن (ف) بمد و قصر و بکسر با ، نهفته و حامله ، خاقانی فرماید :

مریم آبستن است لعل تو از بوسه باس
تا بخدای شود عیسی‌ِ تو متهم

در موید است بشین معجمه ، نهفته و جای چیز نهفته هم ازین مرکب است آبستنگاه بمعنی جای نهفته و قدمی و خلوت خانه -

آبسته (ف) بمد و سین مهمله و قیل بشین معجمه کذا فی‌الاداب و در موید است بمعنی آسته و در قنیه بمعنی زهدان که بتاریش رحم خوانند آورده و در شرفنامه بمعنی جاسوسی کردار و چاپلوسی است و آنرا آبسته و بسته نیز گویند و در موید ایشه بوزن شیشه بدین معنی گفته است ، استاد :

در کوی تو چون ایشه همیکردم ای نگار
دزدیده تا به بیم مگرت ببام بر

آب سرد ، آب تلخ و اشک تلخ (ف) که از اندوه آید و نیز بمعنی ، شراب -

آب سفید (ف) علتی است که در چشم پیدا آید حکماء هند موتیابند گویند -

[آب سیاه] رک - آب سیه -

آب سیر (ف) بفتح سین مهمله ، خوشی رفتار از اسب و مانند آن -

آب سیر آتش نعل (ف) اسب تند و تیز -

آب سیه (ف) آب طوفان و نام رودیست از ساوه - ۱

آبشتنگاه (ف) بمد و کاف فارسی و شین معجمه ، قدمجا و خلوت خانه و قیل بمعنی جای نهفته کذافی‌الادات ، در تبختریست این لفظ مرکب از آبشستن و گاه است و در اصل آب نستن گاه بود و بواسطه کثرت استعمال سین مهمله حذف کردند چنانچه درین بیت است از استاد :

نه همی باز شناسند عبیر از سرگین
نه گلستان شناسند نه آبشتنگاه

آب شد (ف) یعنی شرمنده شه و بگداخت -

آب شقایق (ف) می و خون سرخ -

آب شناسان کار (ف) قانون‌گویان

---

۱ - بکسر ثالث ، مخفف آب سیاه است که شراب انگوری - و علت کوری وغیره باشد - (برهان)

و قواعد دانان و قیل حقیقت دانان و ماهران درکار آب -

آب شور (ف) معروف و اشک گرم که از غم آید -

آب صفت باش (ف) بمعنی کثیرالنفع و نیز بمعنی متواضع و لطیف باش -

آب طبرستان (ف) چشمه ایست روان بر کوهی اگر بانگ بر وی رنند بایستد چون فریاد زن پنهان سود باز روان سد اگر صد بار چنین کسد چنان سود -

آب طبریه (ف) چشمه ایست که هفت سال روان باسد و هفت سال خشک و سبب آن معلوم هیچکس را نیست -

آب طرب (ف) می -

آب عرق (ف) گلاب -

آب عشرت (ف) مثله [1] -

آب غمام (ف) باران و رونق و هوای ابر -

آب غوره (ف) شیره انگور خام -

آب فتنه تیره (ف) یعنی رونق و جاه فتنه تیره -

آب فتنه شد (ف) بمعنی فتنه فرو سد -

آبق (ع) بمد و کسر بای ابجد، گریز پای -

آب کار (ف) باضافت، رونق و رواج و آبروی و فرمان دهی و با بای موقوف یوزه‌گر و نیز سراب‌خوار -

آب کار بردن (ف) بی آب و بی وقر و بی حرمت کردن -

آب کامه (ف) آساميست ترش و نیز نام داروی [2] -

آب کبود (ف) نام دریای است بحدود مشرق در سهر چین و آنرا بحر عظیم و بحر اخضر و بحر محیط نیز خوانند، گویند هر سی عوراب ناهیده ازان آب بیرون آیند و در دامن کوه بازی کنند و چون آفتاب بر آید در آب روند -

آب کند (ف) بمد و بای موقوف، آن مغاک که از سیلاب در زمین افتد و در بعضی فرهنگ بمعنی آبگیر است -

آب گردنده (ف) آسمان -

آب گفتهٔ من (ف) طراوت و تازگی انشای من -

---

۱ - رک : آب خراباب - ۲ - نام داروی که بهندی کانجی گویند (موید)

آبگون (ف) نام آبیست که از خوارزم می آید و چون بقلزم نزدیک شود آبگون گویند -

(این) آب گون پل (ف) فلک -

آبگون صدف (ف) آفتاب و قیل آسمان -

آبگون طارم (ف) آسمان -

آبگون قفص (ف) آسمان .

آب گوشت (ف) شوربای گوشت -

آبگیر (ف) بمد و کسر کاف پارسی موقوف ، نشیبی که درو آب باران جمع شود و آنرا ازیرو آبدان و زی نیز گویند ، و در حل لغاتست آبدان از هر نوع که باشد عرب غدیر خوانند -

آبگینه (ف) بکاف پارسی ، الماس و نیز شیشه -

آبگینه حلبی (ف) شیشه ایست از حلب ، لطیف -

آبگینه خانه (ف) عرش و کرسی و افلاک و شیشه‌خانه و تابخانه -

آبگینه شامی (ف) شیشهٔ سپید در غایت صفا -

آبگینه طارم (ف) مثله[1] -

آب لعل (ف) می سرخ و اشک خونین -

آبله (ع) وزن آبره ممدود و بسکون با ، نادان -

آبله (ف) بمد ، نام علتی است که برتن خردان بر آید و آماس که در پایهای و غیر آن افتد و بقصر معروف -

آبله رخ فلک (ف) ستارگان -

آبله روز (ف) آفتاب -

آب مرغان (ف) تفرج گاهیست که در شیراز سعد و همایون را همانجا عشق سده چنانکه درین بت است از فاتح القلوب :

دیگر نروم بآب مرغان
دیگر نخورم کباب مرغان

آب مروارید (ف) رونق و روشنی او -

آب مریم (ف) شیره انگور و صلاح و چاه مریم -

آب منجمد (ف) تیغ و سنان و امثال آن و پیالهٔ آب ، آبگینه و بلور -

آب من و جلال من (ف) یعنی جاه من و جلال من -

آب منعقد (ف)[2] مثله و نیز بمعنی می -

آب میگون رک : آب آتشین -

---

۱ - رک : آبگون طارم -

۲ - رک : آب منجمد -

آب میم (ف) نام دریای -

آب نار (ف) معروف و شراب -

آب ناردان (ف) مثله[1] -

آب نافع (ف) می -

آب نبات (ف) شربت و قیل شراب و قیل رونق رستنی و تازگی آن و نیز شیرهٔ رستنی -

آبنوس (ع) در سکندریست بمد و غیر مد ، چوبیست سیاه معروف گران‌بها ، پارسی نیز بهمین لفظ گویند -

آبنوسی شاخ (ف) بمد ، نای و شه نای -

آب و آتش (ف) کنایت از حلم و غضب است و در اداتست بمعنی غضب و لطف مزاج -

آب و آتش زای (ف) آب چشم غمناکان و می سرخ -

[آبور] رک : آپور -

آب و سنگم (ف) جاه و وقر من -

آب و گل (ف) قالب ، بشر -

آب و گل را آبستن دهد (ف) یعنی زمین را حامله نامیه گرداند -

آبی (ف) بمد ، رنگ معصفر -

[آبی] رک : ابی -

آبیاری (ف) بفتح ، جامگی و نام جامه -

آب یخ (ف) شربت -

آبید (ف) بفتح یکم و سیوم ، سرنگ آتش -

آپور و آبور (ف) در سکندریست هر دو بمد و در اول بای پارسی ، خشت پخته ، گویند گچ آپور کرده یعنی بالای خشت گچ کرده و در موید است و ابراهیمی و جای دیگر از سکندریست آگور بکاف پارسی باین معنی است و در لسان‌الشعراء بر وزن ماسور مصحح است -

آت (ف) بمد و قصر ، اسپ اما بدین معنی مشهور -

آتش (ف) معروف و قوت قلمست و رونق و رواج و گرانی نرخها -

[آتش آذر بادگان] رک : آتش آذر بایکان -

آتش آذر بایگان و آذر بادگان (ف) هر دو باکاف پارسی ، نام ولایتی که اردشیر بابکان آنجا آتشکده بنا کرده بود

آتش ازو یافتند (ف) رونق و گرمی ازو -

---

۱ - رک : آب آتشین -

آتش افروزنه (ف) چیزی که بدان آتش افروزند و بحذف الف دوم نیز -

آتش بان (ف) دیوان -

آتش بجان (ف) غم و شور و شوق بجان -

آتش بنشاند (ف) اشتهای برد و نیز فتنه را فرو نشاند و غصه دور کرد -

آتش بهار (ف) رونق آن -

آتش بی باد (ف) رونق ظلم و گرمئی بازار او و نیز بمعنی مئی -

آتش بیداد (ف) رواج ظلم و نیز آتش ظلم و قیل از بیداد ظالم مراد است -

آتش بی دود (ف) می و آفتاب و زر و غضب -

آتش بی زبانه (ف) می انگوری و لعل آتشیں و عقیق و یاقوت سرخ -

آتش پای (ف) بیقرار و نیز در صفت اسپ تیزپای واقع میشود -

آتش پرآب (ف) می انگوری و اشک خونین و اشک گرم غمزدگان -

آتش تابنده (ف) آفتاب و طشت -

آتش تر (ف) لب لعل و مئی سرخ -

آتش توبه سوز (ف) کفایت از شراب است -

آتش جام زیبقی (ف) می سرخ که در پیاله بلور و جام نقره باشد -

آتش حجر (ف) آتشی که از سنگ بیرون آید ، چنانکه چقمق و و جواهر سرخ -

آتش خاطر (ف) روشنی آن و طبع نیز و سخنهای سوزناک و حرارت آمیز -

آتش خوار (ف) حرام خوار و رشوت خوار و خورنده آتش و نیز نام جانوری که او را کبک گویند و تذرو نیز خوانند-

آتش خواری (ف) حرام خواری و رشوت خواری و میخواری -

آتش خورشید (ف) نور آفتاب و گرمی و سوز او و در شرح مخزن به معنئی سوزدل و جرات آن است و نیز ظهور انوار الهی -

آتش داد و آتش زد (فـ) ترک کرد و در غضب آورد و بیقرار کرد و نیز سوخت و افروخت -

آتش دل (ف) سوز دل و محبت -

آتش دوزخ علف (ف) تیغ -

آتش ده آب پیکرانرا (ف) یعنی رونق سی و سشش پیکر جنوبی و شمالی و شرقی و غربی را محو کرده -

آتش دهقان (ف) آتشی که دهقانان در کاه زنند بجهت آنکه چون باران شود کاه نو بر آید ، خاقانی :

فلک چون آتش دهقان زبان‌کش کشد ترس
که بر ملک منجم هست مساحی و دهقانی

آتش روحانیان (ف) جرم ملایک -

آتش روز (ف) گرمی و روشنائی او -

آتش زر (ف) رونق و رواج او -

آتش زنه (ف) آلتی که ازان آتش بر آید او را چقمق نیز گویند -

آتش سرد (ف) مَی لعل و کنایت از لب معشوق -

آتش سودا (ف) گرمی طبع و تیزی فکر و محبت -

آتش سیال (ف) مثله ا -

آتش سیماب سان (ف) آفتاب -

آتش شجر (ف) مَی سرخ و شراب انگور و آتشی که بموسیٰ علیه‌السلام از دور نموده بود و گل انار و هر گل که سرخ باشد -

آتش صبح (ف) آفتاب و گرمی و روشنای آن -

آتش صلیب (ف) آفتاب -

آتش طبع (ف) تیزی طبع -

[**آتش فروزنه**] رک : آتش افروزنه -

آتش قند (ف) سرخی لب و شراب -

آتش قندیل (ف) رونق و رواج قندیل -

آتشک (ف) کرمست خرد سبز گون در شب چون اخگر نماید ، شب تاب نیز گویند و نیز زخمست که کودکانرا پیدا میشود - هندش لوب گویند -

آتش کار (ف) خشمگین و شتاب رو و مطبخ و بدکار -

آتش کاو (ف) بکاف تازی ، چوبی که نان در تنور و جز آن آتش بگردانند -

آتشکده (ف) آنجا که آتش افروزند بجهت پرستش

آتشکده بهرام (ف) برج حمل -

آتش گون (ف) نام گلست سرخ مانند آتش -

ا - رک : آب لعل -

آتش گه (ف) مثله[1] -

آتش لباس (ف) سرخ پوش -

آتش مجسم (ف) تیغ و جمیع اسلحه -

آتش موسیٰ و آتش موسوی (ف) آتش که موسیٰ علیه‌السلام را بر کوه طور نموده بودند و نیز کنایت از می -

آتش نثار (ف) اشک خونین و اشک غمزدگان -

آتش نعل (ف) مثله[2] -

آتش نیسان (ف) رونق بهار -

آتش و آب (ف) تیغ و امثال آن و نیز کنایت از شراب تیز و پیاله بلوری -

آتش و بادخوان (ف) بربط و آن ستاریست -

آتش وادی ایمن (ف) یعنی نور حق تعالی -

آتش هندی (ف) تیغ -

آتشین داغ (ف) داغ آتشین -

آتشین دواج (ف) شفق و می -

آتشین را (ف) یعنی شیطانرا یا جنانرا[3] -

آتشین زبان (ف) تیز زبان -

آتشین زمزم (ف) آفتاب -

آتشین سخن (ف) طاعن و طرار و غضب و عتاب کننده -

آتشین صدف (ف) مثله[4] بمعنی اول -

آتشین کاسه (ف) مثله[5] -

آتشین مار (ف) آه گرم و زبانهٔ آتش و نیز جنسی است از هوائی مانند ستاره ولیکن بجای ستاره مانند مار بچگان می کشایند ، کذا فی المؤید -

آتشین هفت اژدها (ف) سبع سیاره -

آتواث (ت) بمد ، گوشت و بغیر مد ، اسپ و در موید است - آت بمد

آتیشن (ف) نام کریمی که در اشعار سوزنی ذکرش بسیار است -[6]

آثال (ع) بمد و ثای مثلثه ، بزرگی و بضم ، نام کوه و نام مردی -

آجله (ع) بمد و کسر جیم ، آنجهان و موعود -

---

١ - رک : آتش‌کده -
٢ - رک : آب سیر آتش نعل -
٣ - جینانرا (پ) -
٤ - رک : آبگون صدف -
٥ - رک : آتش تابنده -
٦ - برای این کلمه شاهدی یافته نشد -

آچار (ف) بمد و کسر معروف[1] -

آخ (ف) بمد ، آواز خو انداختن از درون کام -

آخال (ف) بمد ، بچه افگنده ، عرب آنرا سقط خوانند -

آختن و آهیختن (ف) بمد ، بیرون کشیدن و بر آوردن -

آخته و آهیخته (ف) بفتح و مد ، بیرون کشیده و قمل بضم اول ، کشیده و بر آورده ، شیخ سعدی :

ای که سمسیر جفا بر سر ما آخته ای
صلح کردیم که ما را سر پیکار تو نیست

آخته قد و آهیخته قد (ف) مثله[2] -

[آخجه] رک : اخجه -

آخر و آخور (ف) جای بستن اسپان و جای آب و کاه خوردن ایسان عرب اصطبل خوانند ، موافق لفظ اول است :

صحن و دهلیز سرا پرده او اوج و حضیض
اشهب و ادهم کرد آخر او لیل و نهار

آخر دست (ف) داو آخر نرد و قمار و نیز صف نعال و عاقبت کار -

آخریان (ف) بمد و قصر ، کالا و رخت کاله نیز گویند و بکسر خاء ، ضد اولمان -

آخرین آیتی (ف) نیز بدین معنی[3]

آخرین حرف (ف) تقدیر و عاقبت -

آخشیج (ف) بمد و یای پارسی ، بوزن آبریز ، ناهمتا و ضد یک طبع از طبایع خلق که آنرا عرب عنصر خوانند - در موید الفضلا این لفظ در فصل جیم تازی آورده و فصل جیم پارسی جدا نوشته و در هیچ بخشی زفان گویا در بخش جیم پارسی آورده چنانچه در موید هم بآن اشارت رفته و دلیل قویست بر جیم تازی آید - در سکندر نامه در قافیه مزیج انداخته چنانکه مذکور میشود ، موید معنی اول است این بیت که از تبختریست ، استاد :

عالم از عدل ابواسحاق کشت است آن چنان
کز جهان برخواست رسم گفت و گوی آخشیج

و موافق معنی ثانیست این بیت سکندرنامه :

توی گوهر آمای چار آخشیج
مسلسل کنان گوهران در مزیج

---

۱ - زمین پست و بلند و آمیزش و آمیخته و آچاریدن و امر و فاعل از آن و ترشیها و مرباها را هم بواسطهٔ آنکه از چند چیز آمیخته شده‌اند آچار گویند -
(فرهنگ نوبهار)

۲ - رک : افراشته قد -

۳ - رک : اولین آیتی

آخور چرب (ف) آنجا که فراخی عیش و کثرت علف باشد -

آخور خشک (ف) آخور بی آب و علف -

آخور سنگین (ف) کنایت از مقام بی نفع است -

آداک (ف) بمد ، خشکی میان دریا که عرب جزیره خوانند ش -

[آدربویه] رک : آذربویه -

آدرخش (ف) آتشی که از آسمان افتد ، عرب صاعقه خوانند و سرما باشد که ازو بیم هلاک باشد -

آدم (ع) بمد ، معروف و در دستور است بمعنی سیاه رنگ و در تاج و صراح بمعنی گندم‌گون است و در حل لغاتست ، اشتر سفید و آهوی سفید که خطها دارد برنگ خاک -

آدینده (ف) با دال موقوف ، قوس قزح که آنرا کمان رستم گویند -

آذ آوازه (ف) بلند آوازه -

آذر (ف) بذال معجمه و مد ، آتش و نام رمضان و ایام جشن مغان که آن مدت ماندن آفتاب است در درج قوس ، هندیوشی خوانند و آنرا آذر ماه نیز گویند و موید معنی اول است این بیت سلمان :

آذر نبرد آب رخ آذر و کانون
و ار درد سردود امان داد جهانرا

آذر برزین (ف) نام مردی پهلوان و آتشکده و بمعنی آتس برزین یعنی در سواری گرم ، از بدمذهبان یعنی از طایفه افلاکیان که خیر و شر را از فلک دانندا -

آذر بویه (ف) بیخ زعفران و بعضی بدال مهمله خوانند -

۱ - نام آتشکده ششم است که در فارس برزین نام ، سخصی از خلفای ابراهم زردشت ساخته بود ، و بعضی گویند روزی کیخسرو سواره می رفت ناگاه صدای رعدی بهم رسید چنان مهیب که کیخسرو خود را از اسب انداخت ، در آن اثنا صاعقه افتاد و بر زین اسب او خورد و زین افروخته گردید دیگر نگذاشتند که آن آتش فرو نشیند و همانجا آتشکده می ساختند و آذر برزین نام کردند - (برهان)

آذر برزین همان آذر مهر برزین است که فرهنگ نویسان دوبار (آذر مهر — آذر برزین) یاد کرده اند -

آذر برزین مهر در پهلوی Atur - Burzin - Mitr (یعنی آتش مهر بالنده) نام یکی از سه آتشکده مهم ایران عهد ساسانی است که بتصریح تفسیر پهلوی یابش در ریوند ایالت خراسان جای داشته و بکشا ورزان اختصاص داشته است -

(مزدیسنا ، ۲۱۵ - ۱۹)

آذر بیجان و آذر باجان (ف) با ذال مضموم همان معنی[۱]، در تبخترسیت که این هر دو لفظ معرب آن دو الفاظ مذکورند -

آذر پرست (ف) بمد و بای پارسی، آتش پرست -

آذر فروز (ف) آتش فروزنده و یا امر به او و نیز نام مرغیست که عرب آنرا ققنس خوانند -

آذر گشسپ (ف) بمد و ضم کاف و سین معجمه و مهمله و بای پارسی، آتشکده بود در بلخ که سکندر آنرا خراب کرده و گنجهای که در آن بود برد، و نام واضع رسم آتش پرستی و در حل لغاتست بمعنی آتش پرست و آنرا آذر گشاسپ و آذرگشنسپ بجمع سین معجمه و مهمله نیز و موید لفظ اخیر است این بیت شاهنامه :

سواری نکردار آذر گشنسپ
ز کابل سوی سام شد بر سه اسپ

آذر گون (ف) نام گلیست سرخ و زرد و روم آنرا آذریون نیز گویند صاحب موید بمعنی سمندر نیز نقل کرده و گویند نوعی از بابونه است شگوفه برنگ زر ماند و درمیان شگوفه او چیزیست که برنگ مشک مشابه است و شگوفه او بجانب آفتاب گردد و در سب زبون گردد، چنانکه درین بیت است از تاج مآثر :

ز آب دیده خصم تو زعفران روید
کجا ز آذر تیغ تو روید آذر گون

آذر ماه (ف) همان که در آذر گذشت -

آذر می دخت (ف) نام دختر پرویز شاه که نشش ماه ملک راند -

آذرنگ (ف) بمد و قصر و کاف پارسی، دمار و هلاک و رنج در سرفنامهٔ انرا هیمیست بذال معجمه بمعنی روشن نیز آمده درین معنی، فردوسی:

فروغی پدید آمد از هر دو سنگ
دل سنگ گشت از فروغ آذرنگ

و مرافق معنی اول است این بیت :

بی آدرنگ باشد هر لنگ از عصا
فرعون لنگ را ز عصا آمد آدرنگ

در تبخترسیت وزن دادرنگ بدال مهمله و معجمه بمعنی اول و بزای معجمه و بمد، خبار سبز خام و در حل لغاتست آزرنگ بمد و زای اول معجمه و دوم مهمله، غمی سخت و محنتی صعب -

آذر همایون (ف) نام دخترک ساحره از نسل سام که در سپاهان خادمی آتشکده میکرد آخر پیش اسکندر اسلام آورد و بلیناس حکیم او را

---

۱ - رک : آذر بایگان -

بحباله خود آورده بلیناس جادو لقب شد -

آذری (ع) جامه است منسوب بآذربائیجان -

[آذر یون] رک : آذرگون -

آذیش (ف) بمد و یای پارسی [1] آتش ا چنانکه ، درین بیت است ، انوری :

گر کند حوب آستان تو حکم
شحنه چوبها سود آذیش

آذین (ف) بمد وزن آمین ، کذا فی التحفه و در تبختریست بمد و کسر ذال معجمه ، آرایش و قبهای که بدان شهر بیارایند کذافی الابراهمی :

بنوروز جهان بنگر نو آئین
ز لاله بسته جمله کوه آذین

آرا (ف) بمد امر ، آرایش و آرائنده و بمعنی اخیر در ترکیب مستعمل است ، چنانچه مجلس آرا و سخن آرا -

آرام خاک (ف) حلم بشر و قرار و ثبات زمین -

آرایش (ف) معروف و نام نوای و آنچه بجهت زینت رخساره و پیشانی عروس بمالند -

آرائش خورشید (ف) نام نوای و لحنی و نیز خطی که بر رخ خوبان پدید آید -

چو زد آرایش خورشید راهی
در آرائش بدی خورشید ماهی

آرت (ف) استخوانهای بلند در بندگاه بازو که آنرا ارنج گویند -

[آرتاله] رک : آردهاله -

آرد (ف) بمد و فتح و رای مهمله تواند و برای موقوف بوزن کارد معروف که عرب آنرا دقیق خوانند و بدین معنی بقصر نیز آمده ، کذا فی الشرفنامه -

آردابه (ف) آردی که باب در سوربا اندازند -

[آرداله] رک : آردهاله -

آردبیز (ف) با دال موقوف ، غربال که هندش چهلنی گویند -

[آرد روغن] رک : آردی روغن -

آردستان (ف) بمد و غیر مد ، نام ولایتی که انار آنجا معروف است و اورا اردسته نیز گویند [2] -

---

[1] - آذیش بکسر ثالث و سکون تحتانی و شین قرشت ، چوبی را گویند که بر آستانه در خانه استوار کنند - و بمعنی ریزهٔ چوب و خس و خاشاک هم آمده است - (برهان)

āzīsh, A door sill; chips, rubbish. (Steingass)

[2] - بالفتح با دال مکسور نام ولایتی ست از ولایتهای بالا دست و آنجا انارهای خوب میشوند ، کذافی العلمی - (مویدالفضلا)

آردن (ب) بوزن نارون ، و در ابراهیمی است بمد و قصر ، آلتی است که بجهت صفای روغن وغیره مانند کف گیر و آنرا پالان و بالون و پالونه کلهم بیای پارسی نیز گویند و هند پونه و در ادات بمعنی نیک ـ

آردهاله (ب) نام طعامی است که در ایام قحط از آرد سازند و او را آرتاله و آرداله نیز گویند ـ

آرده کنجد (ب) بمد و قصر ، مالیده ایست از کنجد که با رطب و دوشاب خورند ـ

آردی روغن (ب) حلوای تر و آنرا آرد روغن نیز گویند ـ

آرزوانه (ب) آنچه آرزو کنند ـ

آرزوم (ب) بمد ، نام شهریست ، حکیم فرماید :

بریز غم فرود مرا و آرزوم هست
کین غم بآرزوم و بار من در آورم

آرستن (ب) بمد و قصر ، توانستن ـ

آرش (ب) بمد ، نام سلاحدار طهماسپ شاه که تیر حکمت راست کرده بود ، بغیر مد بوزن فرش ، مسافت دور دست چون فراز کنند و بازو ، نام پسر کیقباد و برادر او و بغیر همزه نیز در تبختریست بفتحتین ساق دست از طرف ارنج تا بغل و خرمای سیاه ، موید معنی اول این بیت تاج مآثر :

یکی به تیر فگندن بسان ارش بنوک
یکی بعیب دریدن بسان رستم زر

و موافق معنی دوم است این بیت سکندر نامه :

سنانکس یکی نیزهٔ سی ارش
بآب جگر یافته پرورش

اما عجب که ارش و پرورش بفتحتین بکسر راء قافیه ساخته اما متقدمین در کلام خود امثال این بسیار دارند ـ

آرغده (ب) بمد وزن ناکرده و بغیر مد ، جنگ‌آور و خشم آلوده ـ

آرمده (ب) بمد و فتح رای مهمله و سکون هم ، آرمیده ـ

آرمیدن (ب) بمد ، معروف و نیز ساکنان و ناجمان سدن ـ

آرن (ب) بمد ، آرنج ـ

آرنگ (ب) بمد و رای مهمله ، بمعنی پنداری و کوته ـ

آروغ (ب) بمد ، معروف که هندش دکار خوانند و بمد و غیر واو نیز ، موید معنی اولست این بیت سکندر نامه :

همیشه لب مرد بسیار خوار
در آروغ بد باشد از ناگوار

موافق لفظ دوم است این بیت کمال سپاهانی :

گیرد چو صبح آرغ از قرص آفتاب
آنرا که تو بخوان کرم مهمان کنی

آرون (ف) بفتح و مد ، صفتهای خوب -

آریدن (ف) برای سهمله ، رنگ کردن و آراستن و بزای معجمه نیز -

آز (ف) بمد ، حرص و امل و طلب و خواهش سخت ، چنانچه موافق این معنی بیتی است کمال سپاهانی -

میان پنبه و آتش کسی چو جمع نکرد
چه میکنی سر خود پنبه زار و آتش آز

آزاد (ف) معروف و در دستور سرو و سوسن که بیک ساخ راست رسته باشد و بمعنی علاحده و جدا و نام درختی که هندش بکاین گویند چنانکه در آزاد درخت گذشت و در زفان گویا و موید است و درخت نیب نیز و هر که از تعلقات دنبوی وارسته باشد گویند آزاد مردانست و نیز بمعنی سخی ، در تبختریست جنسی از درخت سرو و نام گلی که ازان گلاب سازند و آنرا آزاد گل نامند -

آزاد درخت (ف) درختی معروف که عرب آنرا علقم و هند بکاین گویند و سرو نیز -

آزاد میوه (ف) نام حلوای است که از پسته و مغز بادام و نخود سازند و آنرا هفت رنگ نیز گویند -

آزاده (ف) پیر و ولی و صالح و حلال زاده ، همان آزاد -

آزادی (ف) بمد ، معروف و بمعنی شکر ، چنانکه فردوسی :

گر آزادی تو به یزدان کنم
وگر پیش یزدان پرستان کنم

آزار (ف) بمد معروف ، و مدت ماندن آفتاب در حوت ، هندش چیت گویند و آن اول ماه ربیع است -

آزاریدن (ف) همان آزردن و قیل بازای معجمه پارسی ، آمیختن و بتازی رنگ -

آزدن (ف) بمد و قصر ، رنگ کردن و خلانیدن سوزن -

آزده (ف) معروف و خلانیدن سوزن -

آزر (ف) بمد و زای معجمه ، نام پدر ابراهیم علیه‌السلام که تارخ نام داشت و آنرا آزر بت تراش گویند و نیز کج طبع -

آزردن (ف) بمد ، معروف ، در موید است بضم زای معجمه غلط است زیرا که مختصر آزاریدن است -

آزرده پشت (ف) بمد ، پیری که کوز پشت شده باشد -

آزرم (ف) در سکندریست بمد و فتح زای معجمه ، انصاف و عدل و جانب حق نگاهداشتن و اصلاح و سرم و آهستگی و خشم و گناه و جنگ و نرمی و در موید و در ابراهیمی بفتح یکم و ضم سیوم مذکور است و برین تحقق مسکل میشود که اگر از سیوم رای مهمله خوانند در هیچ وزنی ازین اشعار راست نمی آید و اگر زای معجمه خواسته باشند سیوم نیست مگر موافق عروضیان که ممدود را در حرف اعتبار کرده‌اند موافق تصحیح اول است این بیت سکندر نامه :

یکایک همه لشکر از شرم شاه
نگشتند یکذره ز آزرم ساه

موافق معنی عدل و داد است این بیت مخزن اسرار :

ای ملک آزرم تو کم دیده‌ام
و ز تو همه سال ستم دیده‌ام

و در موید است از دستور بمعنی نیکی و در بعضی فرهنگ بمعنی مهر و سفقت و در استعمال بمعنی ، امان نیز آمده ـ

آزرنگ (ف) بمد و زای اول معجمه و دوم مهمله ، غمی سخت و محنتی صعب ـ

آزغ و آزوغ (ف) بزای معجمه در سکندری و موید و پنج بخشی است آنچه از درخت خرما ببرند ، و در ادات در محل عین مهمله آورده است ـ

آزور (ف) بمد ، ننگ ، حریص و این لفظ مرکب آمده چنانچه رنجور و گنجور ، مستشهد این بیت است کمال سپاهانی :

دهان تیز چنان باز مانده از پی چیست
اگر نه شد بجگر گوسه عدوت آزور

آزیغ (ف) با یای فارسی ، سردی که از کسی در دل افتد از سخن ناشائسته و یا از دهنت و بغیر یای نیز و در بعضی فرهنگست نفرتی بود که از قول و فعل کسی در دل کسی افتد ۱ ـ

---

۱ ـ در پارسی باستان (کیتیبهٔ بیستون ، ستون ۴ بند ۱۲) araika از ریشهٔ righ بمعنی دشمن (Hubschmann) آریغ سردی باشد که از کسی در دل کسی افتد (لغت فرس) ـ آریغ بکسر ثالث و سکون تحتانی و غین نقطه دار ، کینه و عداوت باشد ـ (برهان) تصحیف آریغ است ـ (دکتر محمد معین در برهان)

آژیغ ممدود با زا و یای فارسی ، سردیکه از کسی در دل افتد ـ (موید)
آریغ بیاء معروف بروزن تاریخ ـ ف ـ اعداوت و نفرت ـ صحیح آزیغ بزاء معجمه است چنانچه خواهد آمد ـ خسروانی گفته :

کازیغ زمن بدل گرفته
(فرهنگ آنند راج)

آزیدن (ف) در تبخترست نزدیک نزدیک سوراخ کردن ا ـ

آژخ[2] (ف) بمد و زای پارسی ، گوشت پاره ، بلند و سیاه ، بحذف الف نیز ، آنکه او را عرب ثؤلول گویند و هند مسّا نامند ـ

آژده (ف) بمد و فتح زای پارسی ، رنگ کرده و نزدیک نزدیک سوراخ بغیر مد نیز در حل لغاتست بمد جامه طرب نکنده زده ، عرب مضربه بضم اول و تسدید بر رای خوانند ، موافق معنی ثانی است این بیت شاهنامه :

بلاعی جگر سان کی آژده
که بخشایش آرد پریشان دده

و بمعنی خلاندن سوزن نیز ، انوری :

بادام وار چشم حسود تو آرده
و از ناله بازمانده دهان همچو پسته باد

[آژکهان] رک : آژ کهن ـ

آژکهن (ف) بزای پارسی ، کاهل و بیکار :

بدل ربودن مردی و شاطری ای مه
ببوسه دادن جان پدر بس آژ کهن

آژند (ف) بمد و قصر و زای پارسی ، گل میانهٔ آب و گلی که درمیان دوخشت باشد ، عرب آنرا ملاط گویند ـ

آژندیدن (ف) بزای پارسی ، گل درمیان دو خشت آگندن ـ

آژیخ (ف) بزای پارسی ، چرک چشم ، آنرا کیغ چشم نیز گویند ـ

[آژیر (ف)] رک : اژیر ـ

آژیراک (ف) بمد و زای اول پارسی ، بانگ سواران ـ

آژیریدن (ف) بزای پارسی ، هشیار کردن و بانگ زدن ـ

آژینه (ف) بزای پارسی ، منقار آسیا که بدان دندانه سنگ آسیا نیز کنند آسیازنه نیز گویند ـ

آس (ع) بمد ، در نا جست نام درخت مورد آنرا بزرگتردرعالم نیست، در بهار آن شگوفه آرد و هر که بو کند بخسپد احتلام آرد و نیز مختصر آسیا و امر بآس کردن غله وامرود ، در ابراهیمی است ریحان خوشبوی و

---

۱ ـ بمعنی خلانیدن سوزن و امثال آن باشد و بمعنی رنگ کردن هم گفته اند و بمعنی آزردن و آزار دادن هم بنظر آمده است ـ (فرهنگ آنند راج)

۲ ـ آژخ و آزخ و اژخ و ازخ و ژخ و زخ و زوخ هم نکیست ، و آن علتی باشد که آدمی و اسپ را بهم میرسد که دانه‌های گوشتی سخت در اعضا بر میآید بقدر گندم یا نخود یا مابین آنها ، و درد نمیکند و امروزه زگیل گویند ـ
نوروزنامه (مجتبی مینوی ۹۹-۱۰۰)

بارک بدین معنی پارسی است -

آسا (ف) بمد ، برای سه معنی مده : یکی معنی مانند چنانکه گویند جم آسا و خور آسا و دوم بمعنی فاژه که اعجان او را خمازه خوانند و عربان ثؤباء و هندش جاهی[1] و سوم بمعنی آسایس چنانکه دلاسا و خاطر آسا و بعضی فرق کرده‌اند که بمد آسایش و مانند و بغیر مد فاژه -

آسان (ف) ، معروف و در موید است نیز تاههای رس ، کذافی الصراح بدین تحقیق می باید که این لفظ تازی باسد[2] -

آسای (ف) آساینده -

آستان (ف) معروف و او را آستانه و ستانی نیز گویند ، لمولف :

نکویس میرود فصی که بوسد آستان او
حوذردان نیم سب ار پاسبان آهسته آهسته

آستان عدم (ف) دنیا و مرگ -

آستان فنا (ف) کنایت از این جهان -

آستانه گردون (ف) آسمان ، دنیا -

آستن (ف) بمد ، مختصر از آستین ، چنانچه کمال ساهان فرماید :

سای حیرت ازین در بدان همیگردند
گرفته آستین دست فکر هر جای

آستن پوستین (ف) بمعنی عیب است -

آستی (ف) بمد ، مختصر آستین و بقصر و سکون سین ، بمعنی هستی و بمد و سین معجمه ، معروف -

آستیم (ف) بوزن و معنی آستین معروف -

آستین بر افشاند (ف) عطا کرد و خوش شد و رقص کرد و نیز بمعنی غضب شد -

آستین بر چیدن و بر زدن (ف) ساخته و مستعد شدن برکاری -

آستین بر زد و آستین مالید (ف) مستعد و ساخته شد و آستین مالید ، متضمن هر دو معنی است این بیت ظهیر :

چو سنبل تو سر از برگ یاسمن بر زد
عنب بریختی حوم آستین بر زد

۱ - جنبهای (پ)

۲ - آسان (ع) ج ، اسن ، رشته های رسن و دوال - (لغت نامه)
آسان - رشته و ریسمان و تاه (فرهنگنامهٔ پارسی) اسن ، بضمتین ، تاه رسن ، آسان ج - (صراح)

آستین رفیده [1] (ف) ترشی است
ذا فی زفانگویا -

آستین فشاندن (ف) ترک گفتن
انکار کردن و نیز بمعنی رقص
ردن -

آستین نهادن (ف) چیزی را ملک
ختن -

آستینه (ف) بیضهٔ مرغ و آنرا تخم
رغ نیز گویند -

آسغده (ف) بفتح همزه و غین
معجمه وزن آزرده ، هیزم نیم سوخته [2]
قیل بغیر مد ، چنانکه درین بیت
ستاد :

اسغده همچو درمیان تنور
ایستاده میان گرمابه

آسگون (ف) بمد ، نام ولایتی و
ل شهری [3] -

آسمان برین (ف) آسمان هفتم و
ل عرش -

آسمان دره (ف) آنکه بشب مانند
اه در آسمان پدید آید ، آنرا کاه کشان
یز گویند -

آسمان را زمین کردن (ف) یعنی
ی سپر و زیر کردن -

آسمان را زمین میکند (ف) یعنی
بی سپر میکند و یا از روی کثرت
غبار میگویند ، چنانکه در سکندرنامه :

زمین شش شد و آسمان گشت هشت

آسمان صفت (ف) یعنی قادر بر
همه چیز -

آسمانه (ف) سقف و آنرا اشکوب
نیز گویند چنانچه گذشت و همان آسمان ،
کمال فرماید :

ز تنگنای زمینم هزار آسیب است
برای عیش فراخ آسمانه میجویم

[آسه] رک : آسیه -

آسه (ف) وزن کاسه ، کشت راس
کرده بجهت زراعت -

آسیاب (ف) همان آب آسیا مذکور -

[آسیازنه] رک : آزینه -

آسیب (ف) بمد ، پرتو و دو تن
را که یکدیگر دوش بدوش و پهلوی
به پهلو زور رسد - عرب آنرا صدمه
خوانند و هند دهکه و سرگشته و
مدهوش در حل لغاتست بمعنی نکبت
نیز -

---

۱ - آستین رقیده - (ل)

۲ - آسغده *asugde* "half-burnt firewood" (Asadi, p. 26; Vullers, i, pp 36, 98). misspellings . آسفته ، اسفد ، اسفده ، اسفره betrays its Sogdian origin when compared with the genuine Persian word *sukhte*. (Henning)

۳ - نام دریای خزرست که نام دریای گیلان باشد و نام ولایتی هم هست -

آسیمه (ف) متحیر و شوریده سر و دیوانه مزاج :

آسیمه سر چوگاو حراشم که حشم بدا
نگذاردم که چشم بروغن در آورم

آسیمه سر (ف) آشفته و سرگشته ـ

آسیه (ف) نام زن فرعون ، آسه بحذف یای دوم نیز ، بعضی آن را در فصل عربی نبشته ـ

آش (ف) بمد ، آسام از هر جنس که باشد ـ

آش آلوجه (ف) آسی که از آلو سازند ـ

آشام (ف) بمد ، آسامنده طعام و آسامیدن در موید و ابراهمی بغیر مد نیز آمده ، کمال ساهان فرماید :

بیاد سوی دماغ هدی نرم ران قوم
که اهل خانه خود را اسام می‌دهند

آشام مزور (ف) آبی که بعد از فاقهای بسیار دهند ـ

آشامیدن (ف) بمد ، فرو بردن آب وغیره ـ

[آشپهه] رک : اسپهه ـ

آش تذویر (ف) آس اردینه که به بیمار دهند و آنرا مزور نیز گویند ـ

آشتینه (ف) بشین معجمه ، همان که بسین مهمله گذشت ـ

آش حکیمی (ف) مثله ۲ ـ

آش خلیل (ف) آش عدس که در روم روزه بنام ابراهیم علیه السلام نگاه میدارند و در آن روز می پزند ـ

آش خلیل الله (ف) آش عدس که در روضهٔ ایشان می پزند ـ

آش دقیق (ف) آشی که از آرد و برنج سازند ـ

آش دقیقی (ف) نوعی از آش آردینه ـ

آشرنگ (ف) بمد و قصر و کاف پارسی ، گیاهیست بصورت مردم ، گویند هر که او را بکند بمیرد و در اداتست که در ختن روید آنرا مردم گیا نیز خوانند و در طب است هند لکهمنا گویند ش ـ صاحب موید برین سخن دارد که این لکهمنا داروی دیگر است که برای پسر شدن کار می آید با شیر ماده گاو بخورند و آن خاصیت که مذکور باشد درو نیست ، صاحب سرفنامه گوید که من او را بسیار در ولایت بهار دیده‌ام چنین نیست ، بیخ او را چیزی مشابه بصورت آدمی هست و بمعنی هر جانور نیز ـ

آش زیره (ف) آشی که از زیره سازند ـ

---

۱ ـ نیل (ل) ـ ۲ ـ رک : آش دقیقی ـ

آشفتن (ف) در ابراهیمی است آشوفتن بواو پارسی نیز ، بمعنی شوریدن و جنبیدن ، آشوبیدن نیز ازین است ـ

آشفته رومیان (ف) انگشت افروخته ـ

آشفته مغز (ف) پریشان ـ

آش مویز (ف) آشی که از مویز سازند ـ

آشنا (ف) بدو معنی معروف است ، امّا در آشنای آب بترک الف اول نیز آمد و متحمل هر دو معنی است این بیت لمؤلف :

تاب دو دیده کنم روشنائی
که در آشنای بود روشنائی

آشناه (ف) بمعنی اشنا کردن در آب و آنرا اشنا و شنا و شناه نیز گویند ، چنانچه درین بیت است از شاهنامه :

بزرگان بدانش بیابند راه
ز دریا گذر نیست بی آشناه

آشوب (ف) شور و غوغا و قیل فتنه ـ

[آشوبیدن] رک : آشفتن ـ

آشوردن (ف) خمیر کردن ـ

[آشوفتن] رک : آشفتن ـ

آشوفته (ف) بواو پارسی ، همان آشفته معروف ـ

آشه (ف) بمد و شین معجمه ، صمغ استر خاره[1] ـ

آشیان (ف) و آنرا آشیانه و نشیم و نشیمن نیز گویند ـ

آصال (ع) بمد ، جمع اصیل و بمعنی نزدیک فرو شدن آفتاب و بمعنی مذکور ـ

آصف (ف) بمد ، نام وزیر سلیمان علیه السلام و او یکی از علماء بنی اسرائیل بود پسر برخیا نام ـ

آغار (ف) بمد و غیر مد ، زمین که در و نم و آب رفته باشد و نیک سررشته بود و بمعنی وغا و حرکت ، چنانکه گویند بد آغار بمعنی بد حرکت و در حل لغاتست بمعنی چیزی بهم پیوسته و نم گرفته از آب یا از خون برآمده ، استاد :

عقیق گاه شد آب زمین ز بس کز خون
بروی دشت بیابان فرو شدست آغار

آغار (ت) درخت ـ

[آغاردن] رک : آغاریدن ـ

---

۱ ـ برای این کلمه شاهدی یافته نشد ـ

آغاریدن و آغاردن (ف) هر دو بمد و قصر، فرو سدن نم بر زمین و نیک سرشتن و حرکت کردن -

آغالیدن (ف) بر سورانىدن کسی را -

آغاز (ف) بمد نخست، و بمعنی که در رای مهمله گذست -

آغاره (ف) بمد و قصر و غین و زای معجمتین، نوعی ار ساز کفشگر-

آغرده (ف) بوزن آورده، جامهٔ نازک و سگ و پ ره پاره -

آغشتن (ف) نر کردن و آلوده سدن -

آغشته (ف) بمد و کسر غین معجمه آمیخته و آلوده و بغیر مد و بفتح غین نبز -

[آغشته] رک: آگسته -

آغل (ف) بمد و ضم غین معجمه، سبانگاه گوسپندان -

آغلانیدن (ف) سخت برشورانىدن هر دو بمد و قصر -

[آغنده] رک: آگنده -

آغو (ت) بمد، دهن -

آغوش (ف) بمد و واو پارسی، کنار و معنی بنده و پرستار و کنیزک، چنانچه درین بیت است از شیخ سعدی:

مگر سنگ دست فراموش شد
که دستت در آغوش آغوش شد

آفاق (ع) بفتح و مد، جمع افق بضمتین، کرانه جهان و اسپ خوش آینده -

آفتاب (ف) بسه معنی آمده، یکی معروف، دوم بمعنی روز چنانچه گویند هر آفتاب یعنی هر روز، سیوم بمعنی آفت آب و در سرمامه است و نیز بمعنی سراب و موید این معنی است بیت انوری:

در حشر آسمان وش تو ریخته نماز
ساقی ماه روی تو در ساغر آفتاب

آفتاب اختر ینجم (ف) ستاره مریخ -

آفتاب پرست (ف) بای دوم پارسی، معروف و گل نیلوفر، و در شرفنامه است هر گل کبود و نام جانوریست که عرب حربا و هند گرگٹ خوانند و او را فارسیان بوقلمون نیز گویند و فیل نام درختی که هندش هلهل خوانند -

آفتاب پرستک (ف) مثله[۱]، و بمعنی سپرک -

۱ - رک آفتاب گردک -

آفتاب دولت (ف) بخت و اقبال با آنکه دولتی همجو آفتاب روشنست -

آفتاب زرد (ف) خورپزه و مئی زعفرانی -

آفتاب زرد رو (ف) خربزه -

آفتاب ساوه (ف) کنایت از سلطان مشهور است -

آفتاب سوار (ف) مردم صبح خیز -

آفتاب سواران (ف) مردان سب خیز -

آفتاب بر کوه رفت (ف) وقت مرگ یا زوال دولت رسید ، در تبختریست آفتاب بر دیوار رفت مثله -

آفتاب گردک (ف) بکاف اول پارسی مفتوح بفتح باء ، و آنرا آفتاب پرست و بوقلمون نیزگویند و هندش گرگت -

آفتاب گیر (ف) بکسر کاف پارسی ، سپر بادسته که بادشاهانرا بد و سایه کنند -

آفتاب وار (ف) سخی و اهل کرم و بی ریا که با هر کس برابر باشد -

آفرین (ف) بدو معنی معروف اما بمعنی آفریننده بی ترکیب استعمال نیافته ، چنانکه گویند جهان آفرین و نیز بمعنی دعای نیک :

مژده عالم را ر عالم آفرین آوردهاند
زانکه شه را او خلیفه آفرین آوردهاند

آفق (ع) بمد و کسر دوم ، مردی که در بزرگی نهایت رسیده باسد -

[آفگانه] رک : افگانه -

آفل (ع) بمد و کسر فا ، فروشونده -

آفند (ف) بوزن آگند ، خصومت و جنگ و در قنیته بفتحتین است و نیز نام شهری و موید معنی اول است این بیت استاد :

آورده پیامی که نباید چو خوری می
مستک شوی و عربده آغازی و آفند

[آقچه] رک : اخچه -

آقسنقر (ف) بمد و ضم سین مهمله و قاف دوم ، سپید و آفتاب و روز در شرفنامه بمعنی شکره سپید آورده و داخل الفاظ ترکی کرده و نیز سنقر سپید و سنقر سیاه گویند و بدین معنی قراسنقر ترکیب آرند و آن جانوریست و گویند شکره ایست و آن بر دو نوع است سیاه و سپید و ترکان غلامان را بدین معنی خوانند -

آک (ع) روزی سخت گرم، کذا فی‌التاج و در صراحست سختی گرما، در سوید است بمد، بمعنی آفت و در تبختریست مقصور، آکفـا مذکور، شیخ سعدی:

عدوی تو که چو هیزم شکسته بود مدام
تنور حادثه می سوزدش ز آتش آک

آکج (ف) بحذف نون بوزن آرد، کارد آهنین سر کر که بر سر چوب بندند و ازان پارهای یخ از یخدان بکسند، از اداب معلوم شد که همان یک لفظ[2] است اما فرق کرده‌اند دادن که اگر کاف تازی است بمعنی اخیر است و بکاف پارسی بمعنی اول -

آکل (ع) بمد، خورنده و نیز بمعنی سلطان و در حل لغاتست بمعنی رعیت نیز -

آگشته (ف) بکسر کاف فارسی بمد و قصر، در محکم بسته و بدین معنی آغشته نیز گویند، استاد:

بوالحسن روز جوش خو در من دید
در آگشته را ربود کاشد

آگفت (ف) بمد و غیر مد و بکسر کاف و فتح آن، بلا و رنج و سدت و ناگهان - عنصری گوید:

ساها ادب کی فلک بدخو را
که آگفت رسانید رخ نیکو را
گر کوی غلط کرد بچوگان درنس
ور اسب خطا کرد بمی بخس او را

۱ - آک - ف - بکاف تازی دو معنی دارد اول عیب و عار بود لهذا اهل ایران صحاک را ده آک خوانده‌اند و ده عیب برو اثبات کرده‌اند - حکیم سوزنی گوید:

بدین صفت که منم هر کجا هم حرم
که آک ناید خود آک را من آرم آک

دوم آسیب و آفت - سوزنی گوید.

آکی نه رسد بر تو از من صد بار مرا ز تو رسد آک

و نیز آک برای نسبت و نشمه بمعنی آید چون مغاک منسوب بمغ که بمعنی عمیق است و مغاک بمعنی آبله مشابه بمغ که بمعنی تب است - چون لفظ آک در آخر صیغهٔ امر آید معنی حاصل بالمصدر دهد چون خوراک و سوزاک بمعنی خورش و سوزش - (فرهنگ آنند راج)

آگفت - بفتح کاف فارسی و سکون فا و تای قرشت، آزار و رنج و محنت و آفت را گویند و بکسر کاف فارسی نیز همین معنی دارد - (برهان)

بنالم از غم این روزگار و این آگفت
که هرچه بر سبب شادی و نشاط برفت

سید ابو طالب از تاریخ بیهقی - (لغت نامه)

۲ - رک : آکنج -

آگنج (ف) با کاف فارسی ، بوزن آگند ، روده که پر از گوشتابه باشد ، عرب آنرا عصیب خوانند و در پنج بخشی است که به برنج و جگر پر کرده در تنور بریان کنند و در سکندریست آنرا جگر آگند نیز گویند ـ

آگندن (ف) بمد و کاف پارسی ، بمعنی انباستن ـ

آگنده و آعنده (ف) بکاف پارسی، پر کرده و آخور اسپان ، موافق معنی اول است این بیت شاهنامه :

زده در برو بر سر سیر ترگ
دل آعنده و تن نهاده بمرگ

آگنده گوش (ف) آنکه کرشده باشد ، بسبب بری یا پر کردن بچیزی[۱]

آگنهه (ف) بکاف پارسی وزن پاسنه، پنبه و پشم که درمیان قبا و نالان باشد ـ

[آگور] (ف) رک : آپور ـ

آگوش (ف) بکاف پارسی ، همان آغوش بمعنی اول ـ

آگین (ف) بمد و کاف فارسی ، پر و مالا مال ـ

آل (ع) بمد ، شخص ، چیزی و اولاد و شراب است که بامداد و شبانگاه خورند و بغیر مد و کسر الف نام ولایت و در نصاب الصبیان است بمعنی پیمان و در شرح اوست بکسر و تشدید لام ، خدای تعالی و خداوند و زینهار و همسایگی و بیم و سوگند و خویشی و پیمان یعنی سوگند و مستعمل پارسایان بمعنی ماهی درم دار که آنرا آل پشم نیز گویند و آفت و رنگ سرخ و معصفر که آنرا آل رنگ گویند و چوبهای خیمه و آنکه در تابش آفتاب نیمروز بطلب آب کشته باشد و از دور آب نماید و نباشد و آنرا سراب و کور آب نیز گویند و اسب بور دبستان ـ

آلاف (ع) جمع آن[۲] و در صورت دوم الوف نیز آید ـ

آلای (ع) بفتح و مد ، نعمتها ، فارسیان بمعنی آلوده گویند ـ

آلایش (ف) بمد ، معروف و عیب و خیانت ـ

آلت (ع) دست افزار و کنایت از از عضوی معروف ـ

آلت شناس (ف) سلاح دان ـ

---

۱ ـ بمعنی آلوده دامن است که کنایه از گناهکار و عاصی باشد ـ (برهان)
۲ ـ رک : الف ـ

آلو (ف) بمد و قصر ، میوه خوش ترش ، در موید است بتشدید لام نیز -

آلوچه (ف) بفتح و تشدید لام و جیم پارسی ، همان آلو که گذشت -

آلودگان دهر (ف) دنیاداران بخیل و طالبان و محبان او بمعنی گناهگاران نیز -

آلوده دامن (ف) ملوث و گناهگار ، چنانکه خواجه حافظ فرماید :

گر من آلوده دامنم چه زیان
همه عالم گواه عصمت اوست

آلو سیه (ف) درختی که بارش سیاه و ترش بوده ، هند آنرا جامن گویند -

آلی بالی (ف) نام میوه است که او را آلو بالو نیز گویند -

آماجگاه (ف) دنیا و نیز جای نشانه تیر -

آماج (ف) بمد و جیم پارسی ، نشانهٔ تیر و آن تودهٔ خاک که بر آن نشانه بماند و نیز آلت برزگران و مزارعان و مشتمل هر دو معنی این است این بیت سوزنی :

بر کند روی زمین تیر تو در آماج گاه
برزگر را کنده پنداری بآماچ و کلند

[آمادن] رک : آمودن -

آماده (ف) ساخته برای کاری ، انوری :

چون دود سر از مطبخ دودی تو بر آورد[1]
آماده تر از ابر بود رادن نم را

آمارگیر و آماره‌گیر (ف) هر دو بمد و کاف پارسی و بغیر مد ، محاسب و نویسنده و او را امرگیر و روزگیر و اوارگیر نیز گویند -

[آماره] رک : اماره -

آماق (ف) بمد ، ملکها -

آمان (ع) بمد و قصر در موید است بمد زینهاری و بی بیمی اما بغیر مد مستعمل است ، چنانچه درین بیت میر شاهی :

این دم که در رکاب سوام خون من بریز
ترسم که مرگ امان ندهد تا دم دگر

آمانیدن (ف) مسله[2] -

آمای (ف) پر کننده -

آمخته (ف) مختصر آموخته -

آمده‌گیر (ف) یعنی آمده دان و یا آمدن قبول کن و از دلپذیر دعای تفاؤل -

آمرد (ف) بمد ، میوه اراک که هنوز پخته نباشد و در صراح بدین معنی امرد بفتح آمده است -

---

۱ - دودیکه سر از مطبخ جود تو بر آرد (ل) - ۲ - رک : آمودن -

آمرغ (ف) بمد و فتح میم و ضم آن نیز ، قدر و قیمت و محل اوج نیز بهمین معنی آمده چنانکه گذشت و موید این معنی این بیت :

ندانند دل آمرغ پیوند دوست
ازانکه که بادوست کارش نکوست

و اندک چیزی -

آمر نون والقلم (ف) بمد ، حق‌تعالی و اگر در نعت افتد آن سرور علیه‌الصلواة والسلام مراد دارند -

آمل (ف) بمد و ضم میم ، نام شهری که حالا سریف آملی در ملازمت اکبر شاه از آنجا ست و کتاب ظهور ترشح در قالب حقایق ازو مترشح میشود -

آمله (ف) میوه که هندش اوله گویند -

آمنه (ع) بکسر میم ، نام والده آن سرور و او را ایمنه باماله نیز گویند و بفتح میم ، پشتواره هیزم و بغیر مد نیز ، سلمان :

در وضع حمل ایمنه از بهر امن خلق
وصعی نهاده خوش که به از وضع مریمست

هزار آمنه هیزم زکوه خشک همه
نهاده‌اند بانبار من چو انبارم

آمو (ف) همان آمون که گذشت و قیل زمینی است میانه جیحون و فرات -

آموختگان ازل (ف) انبیاء و اولیاء و قیل شعراء -

آموده (ف) آراسته و تمام -

آمودن و آمادن (ف) پر کردن و آراستن و ساختن و آمیختن و زرینه مرصع -

آمون (ف) نام آبیست معروف بر کنار خوارزم و همان که میان خراسان و ماوراءالنهر واقع است آمو و آموی نیز گویند -

آموی (ف) پر کرد -

[آموی] رک : آمون -

آمه (ف) سیاهی دان ، فارسیان دوات و نیز عرب محبره خوانند -

آمیزه (ف) مردم دوموی سیاه و سفید آمیخته ، در فخری بمعنی در موی است و بازای پارسی ، موزون کذا فی القنیه -

آمیزه مو (ف) دوموا ، عرب آنرا کهل خوانند -

آمیغ (ف) بمد و یای پارسی ، آمیخته و آمیزش -

آمین (ع) بمد و قصر ، معروف ، صاحب موید نقل کرده که معرب همین است یعنی همین میخواهم یا

---

۱ - موی ریش کسیکه سفید و سیاه باشد - (فرهنگ آنندراج)

همین می باید -

آن (ع) بمعنی زمان -

آن (ف) بمد، حرفست برای اشارت بعید و مستعمل در اشارات معهود شده چنانکه عقل و نمک، موید این معنی خواجه حافظ :

شاهد آن نیست که موئی و میانی دارد
بنده طلعت آن باش که آنی دارد

آنان (ف) بمد، جمع آن بمعنی آنکسان -

آن با و تا شکن (ف) کنایت از بت شکن است که آن ابراهیم خلیل الله علیه‌السلام است -

آنت (ف) بمد و کسر نون، سوگند، در سکندرینست بفتح و کسر نون، ترکان گوسپند را گویند و عرب شات گویند -

آنسته (ف) وزن دانسته بفتح و کسر نون، بیخ گیاه خوشبو آنرا مشکک نیز گویند و عرب سعد و هند موتها خوانند -

آنفاً (ع) بفتح و کسر دوم، بمعنی اکنون -

آنک (ع) بمد و ضم نون، در نصابست سرب که هندش سیسه نامند، در زفان گویاست بمعنی مس و روی گداخته و قیل بمعنی آبله که بر اندام برآید، کذافی‌الشرفنامه والتبختری، و در تاج بدین معنی -

آو (ف) بمد، شیرازیان آب را گویند و فتح واو اول نام شهری -

آوا (ف) بمد مختصر آواز - خاقانی :

ازین سراچه و اورنگ بی وفا بگسل
دارغوان دو رنگ و بارغنون آوا

آواره (ف) بمد و قصر، دیوان حساب و دور و سرگشته شدن از جای و در بعضی فرهنگ بمعنی دیو است در حل لغاتست بمعنی خورده آهن که در وقت سوراخ کردن از نعل بیفتد و نیز دیوان خانه که آنجا ملوک نشینند بدین معنی استاد :

همی فرونی جوید آواره در افلاک
که تو بطالع میمون درون نهادی پای

در بختریست بمد، پریشان و تباه و بغیر مد نیز بمعنی اول مذکور -

آوخ (ف) بمد و واو هر دو بفتح، بمعنی دریغا که عرب وا حسرتا گویند -

آور (ف) بمد و بفتح، یقین و نیاز و آرنده و صاحب و بدین معنی ترکیب استعمال یافته، چنانکه دلاور و جنگ آور بغیر مد بمعنی حساب و آواره -

آوردگاه (ف) بکاف پارسی ، جای جنگ ، عرب آنرا معرکه گویند و بعضی بضم واو خوانند -

آورده (ف) بمد و بفتح و ضم واو، معروف و کارزار حمله و کوشش و قبل جنگ بمبازرت و کوشش تمام در بنج بخشی آرند ، بهمین معنی است در ابراهیمی و او را پکار و فرخاش و رزم و ناورد و نبرد نیز گویند -

آوردیدن (ف) بمد ، حمله کردن -

آوره (ف) بمد و قصر ، همان ابره معروف -

آوند (ف) بمد و قیل بفتحتین ، معروف و تخت و شطرنج و بمعنی نخست و بکسر واو مشهور است در حل لغاتست بمعنی آونگ که مذکور خواهد شد -

آونگ (ف) بمد وکاف پارسی، رسنی که یکسراو بجای سرودم او بجای دیگر بندند تا خوشه های انگور و امثال آن برو اندازند و عرب آنرا معلاق و هند نلکنی گویند ، چنانچه درین بیت ظهیر فاریابی :

توئی که خوشهٔ پروین بران رواق بلند
ز بهر نعل جلال تو بستهٔ اند آونگ

از منصور شیرازی :

برای توشهٔ شب خوشهٔ ثریا را
قمر زگوشهٔ کوهان ثور کرد آونگ

در سکندریست بمعنی آویزان و آویخته -

آونگان (ف) بمد و کسر واو بکاف پارسی ، آویزان و آویخته -

آوه (ف) بمد نام شهری -

آویشن (ف) وزن کادیزن ، نام گیاهیست که بزلف خوبان ماند ، عرب آنرا سعتر خوانند -

آه آتشین (ف) آه گرم و دردناک

[آهخته] رک : آخته -

آهرمن (ف) بمد و قصر ، نام دیویست معروف و گویند دیویست که بالای فلک رود و شهاب او را بسوزد و نیز دیو مطلق وطایفه ثنویه، گویند که آهرمن خالق شر و ظلم است و یزدان خالق خیر و نور موافق این قول است ، از تاج مآثر :

گر آن دو عارض رخشان ز فعل یزدانست
ز فعل اهرمنست این دو زلف چوگان زن
بدین دلیل همین معنی درست کنند[1]
که خیر هست ز یزدان و شرز آهرمن

آهسته رای (ف) دانا و بی شتاب -

[1] - بدین دلیل همی و آن بوی درست کنند (ل) -

آه عنبرین (ف) آه سوزناک -

آهک (ف) بوزن آفک ، چونهٔ صدف[1] و جز آن کذا فی السکندری و در تبختر یست بمد و موید این بیت شیخ سعدی :

بدست آهک تفته کردن خمیر
به از دست بر سینه پیش امیر

موافق همین تحقیق است این بیت تاج مآثر :

زمین از ملاقات طوفان تیغش
همان خاصیت یافت کز آب آهک

آهنج (ف) بوزن آهنگ ، انداختن چنانکه گویند باهنج یعنی بانداز نیز بمعنی اندازه و در لسان‌الشعرا بمعنی اول است، صاحب موید از قنیة بمعنی پوسیده نقل کرده است و در قنیة آهنجیدن بمعنی کشیدن گفته و این مشتق ازوست ، می باید بمعنی کشیدن باشد و موید این معنی بیت شاهنامه :

که آن مرگ در جنگ نر اژدهاست
دم آهنج در کینه ابر بلاست

آهن جفت (ف) آنکه زمین را بدان کشت‌کار کنند ، هندش بهاله گویند -

آهنجه (ف) بمد و جیم پارسی و تازی ، پهناکش جامه که جولاهه دارد ، هندش ترگویند[2]

آهنجیدن (ف) انداختن -

آهن ربا (ف) سنگی که آهن را بخود کشد - عرب آنرا مقناطیس و هند چومک گویند و در سرفنامه است گویند لعاب روزه دار و خون میش خاصیتش را دور کند -

آهن سنجر بخورد و زخم سکه سنجر نخورد (ف) به سیاست نه پیوست و زخمه سلاسل بکشمد -

آهن کرسی (ف) سندان -

آهنگ (ف) قصد و آواز نرم و سرود و موافق این معنی ظهیر فاریابی :

چو زهره وقت صبوح از افق بسازد چنگ
زمانه تیز کند نالهٔ مرا آهنگ

آهن گلو (ف) آلت آهنی قلبه رانان هندش پهاله گویند -

آهنین آشیان (ف) منقل که مذکور خواهد شد -

---

۱ - وجه تسمیه آنکه چون آب بران پاشند بخاری مانند آه ازان برخیزد سوزنی :

کس چو ز دنیا نبرد سیم و زر
پس چه زر و سیم چه سنگ و آهک (فرهنگ آنند راج)

۲ - و آن چوبی است که طول آن موافق عرض جامه ایست که می بافند ، و آنرا در وقت بافندگی بر دو کنار جامه بند کنند - و بعضی گویند ریسمانی باشد که جولاهگان در آخر کار بندند و در سقف‌خانه بند کنند - (برهان)

آهنین جان (ف) جان سخت و سختی کش و مرد دلاور ۔

آهنین جگر (ف) مبارز سخت دل

آهو (ف) بمد، معروف و نیز بمعنی عیب و در حل لغاتست بمعنی فریاد و نیز موید دوم است بیت شاهنامه ۔

چه فرمایدم چیست نیروی من
تو دانی هنرهای و آهوی من

آهو اوشد (ف) یعنی صد او و مطیع اوشد ۔

آهوان بزم (ف) ساقیان و شاهدان و ستارگان ۔

آهو بره (ف) معروف و آفتاب و معشوقه ۔

آهو پا[1] (ف) بپای پارسی ، نوعی از عمارات که آنرا مقرنس نیز گویند ۔

آهو پرست (ف) طالب آهو و شکاری آن ۔

آهوی تر (ف) کنایت از ابری که سپید و سیاه بهم آمیخته باشد ۔

آهوی حرم (ف) آن آهوی که گرد مکه معظمه است و صید آن حرام است ۔

آهوی خاور (ف) آفتاب ۔

آهوی ختن (ف) ماه و قیل آفتاب ۔

آهوی ختن گرد (ف) آفتاب ۔

آهوی زرین (ف) آفتاب ۔

آهوی سیمین (ف) ساق سپید پوست ۔

آهوی شیرافگن (ف) چشم شاهد و ساق ۔

آهوی کاسک توام (ف بمعنی اسیر و گرفتار پیاله توام و مثله ۔

آهوی فلک (ف) آفتاب و برج حمل ۔

آهوگان (ف) بفتح واو و کاف پارسی ، آهو برکان در موید از شرح مخزن نقل کرده بکاف تازی و ترکیب اضافی کان آهو و مراد ازان باغ داشته و نیز گفته که این تکلیف است ۔

آهون (ف) وزن هامون ، سوراخی که در دیوار دزدان در زنند :

بن باره سر تا سر آهون زدند
نکو باره بر روی هامون زدند

و در سکندریست بمعنی نقب زن و دزد نیز آورده ۔

---

۱ ۔ آهوپای ۔ باپای فارسی بالف کشیده و بتحتانی زده ۔ خانهٔ شش پهلو را گویند و خانهٔ مقرنس و گچ بری را نیز گفته‌اند ۔ (برهان)

ای مبارک بنای آهو پای
آهوی در تو نافریده خدای
(ابوالفرج رونی)

آهه (ع) ناله، پارسیان، بحذف های اخیره بدین معنی استعمال کرده‌اند -

آهیانه (ف) وزن ماهانه ، کاسه سر و قیل کام که هند آنرا تالو خوانند ، در موید است آنجای که از سر کودک می جنبد و قیل بمعنی موی است -

آهیخت (ف) بمد ، بمعنی انداخت و کشید -

[آهیختن] رک : آختن -

[آهیخته] رک : آخته -

آی (ع) جمع آیت بمعنی نشانی و حرفهای قرآنی ، در سکندریست بمعنی آه و ماه -

آیا (ع) کلمه نداست فارسان در محل تنبیه استعمال کنند و بمد در محل امید و بمعنی شاید چنانچه مضمون این بیت شاهد است ، خواجه حافظ :

آنانکه خاک را بنظر کیمیا کنند
آیا بود که گوشهٔ چشمی بما کنند

آیات (ع) بمد ، جمع آیت معروف و نشانی -

آیان (ف) بمد ، شب دراز -

آیاق (ت) بمد ، همان اباغ مذکور خواجو کرمانی :

جون لب آیاق برلب می نهد همچون قدح
چان بلب می آمدم از حسرت آیای او

آیت‌الایام (ع) کنایت از مهر و ماه است و معنی صنعی او نشانی روزها -

آیت مقصود (ف) کنایت از اطعوالله الخ -

[آینه] رک : آئینه -

آینه آسمان (ف) مشله [1] -

آینه بند آسمان (ف) یعنی آسمان آفتاب آرد -

آینهٔ پیل (ف) بمعنی جرس او و نیز آینه که در برگستوان پیل بجهت مهابت او وصل می کنند ، موید معنی اول است این بیت سکندر نامه :

سفیهای آئینهٔ پیل مست
همی شانه برپشت پیلان شکست[2]

آینهٔ خاکیان (ف) ذات آدم علیه السلام و نیز دل آدمیان و قیل ذات حق تعالی -

آینه خاوری (ف) آفتاب -

آینه‌زانو (ف) استخوان مدور که بر سرزانو جنبان باشد -

آینه سحر (ف) آفتاب -

---

۱ - رک : آینه گردان - ۲ - گسست - (فرهنگ آنند راج)

آینه سکندری (ف) نام آینه ایست که چون اسکندر فیلقوس اسکندریه در سرحد فرنگ بنا کرد که برای دفع شر فرنگیان مناره بنا کرد و آینه حکمت و طلسم ساخت دیده بانان استعداد آمدن آن جاعت میدیدند چون دو مرتبه مقهور شدند و دید بانان غافل شدند فرنگیان آمده او را در آب انداختند و آن شهر را خراب ساختند ، چون سکندر باز آمد ارسطو باز حکمتی انگیخته که آینه غریق از دریا جهنده و برسر مناره نشست ، دیگر غالب نیامدند و تلمیح همین قصه است که از آفتاب مراد داشته این بیت خاقانی :

چشمه خضر سازلب از لب جام گوهری
کز طلب بحر چیست آئینهٔ سکندری

و نیز نام کتابی خسرو دهلوی که در جواب سکندر نامه است ـ

آینه شش جهت (ف) دل حضرت رسالت پناه یا اصحاب کهف و نیز مشاهده ـ

آینه طلعت درویشان (ف) دل ایشان و قیل روی ایشان و قیل اضافه بیانیه است ـ

آینه گردان (ف) آفتاب ـ

آیه (ع) معروف و نشان ـ

آییژ (ف) بمد و زای پارسی ، سرکشی آتش و نام گیاهی که آنرا بومادران گویند ، قیل سرشک و شرار آتش ـ

ائتلاف (ع) سازوار و فراهم آمدن ـ

ائمه (ع) بفتح یکم بکسر دوم و به تشدید ، جمع امام در عرف علماء و مشایخ و قضات و امثال آنرا گویند ـ

ائتناس (ع) آلفت گرفتن ـ

ائنی (ت) پس فردا ـ

ائیل (ف) درسکندریست نام خداست و بیت‌المقدس و معنی اول بزبان عربی است یا سریانی و در تبختریست بوزن همان ابل که گذشت مصحح بمعنی دوم ایلیاست که مذکور شد ـ

اب (ع) بفتح ، پدر ـ

ابا [1] (ع) بکسر ، سر برزدن و بفارسی نانخورش چنانچه درین بیت

---

[1] - اباء ، سرباز زدن اندرکاری (تاج‌المصادر بیهقی) ، فروگذاشتن طاعت (مصادر زوزنی) در بیت ذیل بهر دو معنی اخیر آمده :

ز حکم تو آنکس که آرد ابا
جوین نانش بادا همان بی ابا

ابراهیم فاروقی (لغت نامه)

است ، کمال سپاهانی :

روزی که از برای عدای روان عقل
از خوان خاطر تو رهرگون ادا پرند

و بفتح ، بمعنی با که نمازی مع گویند چنانچه درین بیت فردوسی است :

ابا شهر یاران لشکر سکن
چهاباحت این روزگاری کهن

اباییل (ع) جمع ابول ، گله مرغان بعد ازان غالب آمده بر پرندگان که اصحاب فیل را هلاک ساختند و در حل لغاسب بمعنی گروه گروه -

اباحت (ع) مباح گردانیدن چیزی

اباشه (ع) بضم ، جماعتی آمیخته از هر جنس پارسان بزیاده و او و ترک‌ها نیز بدین معنی استعمال کرده -

اباض (ع) جمع آن[1] -

اباغلس (ع) درختی است که شگوفه او آنچه لاحوردی باشد بیرون آمدن مقعد را فایده دهد و آنچه برنگ سرخ بود مضر است بیرون آمدن مقعد را زیادت کند و در موید است و آنرا **اباکیرا** نیز گویند -

اباغورس (ع) نام حکیمی -

اباغورش (ف) گذر دشتی -

ابافت (ف) جامهٔ بت و سخت و نرم و باریک و قبل سطبر ، بمد نیز ،

اباق (ع) گریختن -

اباگاو برو اباگاوگیر (ف) تنعم دنیا و سادی که بر فوت دسمن کنند و بمعنی ناخورس گاو برنده و گلوگیر

ابالب (ف) بفتح ، اقطاع یافتن ، در ابراهیمی ترکی گفته است -

ابا محمد (ع) کنیت آدم علیه السلام در بهست بود -

ابتدء باسمک الاعلا (ع) آغاز میکنم بنام تو که بلند است -

ابتداع (ع) بکسر ، سر نو پیدا آوردن -

ابتر (ت) زین -

ابتغا (ع) طلب کردن -

ابتلا (ع) بری و بدهضمی -

ابتلاع (ع) بلام بمعنی فرو بردن[2] -

ابتلال (ع) بکسر ، تر شدن -

ابتهاج و ابهاج (ع) بکسر ، شادمان شدن -

---

۱ - رک : ابض - Swallowing (Johnson) - ۲

ابتهال (ع) بکسر، بزاری، دعا کردن و گرد آمدن، در موید است زاری کردن و در حل لغانست بمعنی لعنت کردن یکدیگر را -

ابجاز (ف) وزن افکار با جیم ابجد، وعده راست کردن و نام ولایتی از ترکستان، در سکندریست بکسر و سکون باء نام شهری از ترسایان فرنگ و در موید است و آنرا انجاز بنون و جیم نیز گویند[1] -

ابجال (ع) (رک: اجبال) بسنده کردن -

ابجد تجرید نبشتم (ف) یعنی از خودی و مزاحمت نفس بیرون آمدم و مجرد گشتم -

ابجل (ف) نام بادشاه جابلسا، در سکندری این لفظ را داخل الفاظ ترکی آورده -

ابچی (ت) بفتح، زن -

ابحاث (ع) بفتح جمع بحث، بمعنی کافتن -

ابخال (ع) (رک: اجبال) بخیل یافتن

ابخر (ع) بفتح، گنده دهن -

ابداع (ع) نو پیدا کردن -

ابدال (ع) آن هفت تن که ایشان را بدلها خوانند و قیل چهل تن و بکسر بدل کردن چیزی را بچیزی -

ابدان[2] (ف) خیلخانه و آنرا خاندان و دودمان نیز گویند و بمعنی سزاوار و مستحق -

ابد شهر (ف) نام رودی و شهری[3] -

ابدع (ع) نیز بدین معنی[4] -

ابدی و ازلی (ع) بمعنی همیشه اما در اصطلاح ابد آنکه نهایت ندارد و ازل آنرا گویند که ابتدا ندارد -

ابر (ف) بفتح معروف و مرد ضد زن و موید این معنی است سکندر نامه:

ازان ابر عاصی چنان ریزم آب
که نارد دگر دست بر آفتاب

---

۱ - *anjāz*, Fulfilling a promise. *anjār*, Name of a country. (Steingass)

۲ - ابذان (آ) هر دو صورت بتائید شواهد محتاج است - (لغت نامه)

۳ - در مویدالفضلا گوید نام رودی و نام شهری است و ظاهراً تصحیف ابرشهر باشد - نام باستانی نیشاپور و معدن فیروزه بدانجاست - (لغت نامه)

۴ - رک: اسرع -

یعنی ازان مرد گنه‌گار چنان آبرویش ریزم که دیگر دست برآفتاب نیارد ـ

ابر آزادی (ف) ابر بهار را گویند چنانکه خواجه حافظ :

ابر آزادی برآمد باد نوروزی وزید
وجه می میخواهم و مطرب که میگوید رسید

ابر آرار (ف) ابر بهاری و متشهد این در ضمن ابر آزادی مذکور میشود[1] ـ

ابراج (ع) یعنی جمع درج بضم ، یکی از دوازده بخش فلک و مشهور بروج است ـ

ابرار (ع) جمع بر بکسر ، نیکو کاران ـ

ابراز (ع) بکسر ، ظاهر کردن ـ

ابراق (ع) سرزنش کردن و آسمان با برق شدن ـ

ابرام (ع) سخت یافتن و ستوه کردن بمعنی عیب نیز ـ

ابراهیم (ع) پیغامبری معروف و نام پسر آن سرور و نام کوهیست در کرمان و نام زرتشت مصنف کتاب ژند و در ابراهیمیست که او از بلخ بود ـ

ابرسکاهنی (ف) در سکندریست بکسر سین سهمله و کاف پارسی ، ابر سیاه ، در اداب همچنین یافته و در موید **ابر رکابی** ، غالباً تحریف خواهد بود و معنی سکاهن[2] در باب سین مذکور خواهد شد ـ

ابر سنبل‌گون (ف) ابر سیاه ـ

ابرش (ف) اسب پرخال بهر رنگ و در اسعار بر مطلق اسب استعمال یافته :

بگفتا در ره من طرفه سنگ است
که در وی ابرش تدبیر لنگ است

ابرش حورشید (ف) آسمان ـ

ابرص (ع) پیس ـ

ابرض (ع) کرفش[3]

ابر طوروش (ف) معنی ترکیبی ابری که همچو کوه طور است و مصطلح اسب بزرگ هیکل و غضب ـ

---

۱ - *abrı āzur*, November clouds (Steingass)

۲ - سکاهن ـ بکسر ، سیاهی که چرم گران از آهن و قند سازند همدش کات گویند ـ (مدارالافاضل)

۳ - بر وزن مفرش چلپاسه و وزغه را گویند و آن در خانها بسیارست ـ گویند زدن و کشتن آن جانور آن مقدار ثواب دارد که کسی هفت من گندم بمستحق بدهد ـ (برهان)

ابرقوه (ف) بفتح ، نام شهری که در آنجا چنار بزرگ میشود و در موید بفتحتین ـ

[**ابرکهن**] رک : ابرمرده ـ

ابرمرده (ف) نام داروی است که اگر او را در آب اندازند آب را بخورد و او را ابر کهن نیز گویند و عرب اسفنج چنانکه گذشت ـ

ابرنیسان (ف) باران که در سرما بارد و نیز مرکب ابربهاری ـ

ابرو (ف) معروف و برو بضمتین ازو ـ

ابروزد (ف) رضاداد ـ

ابروزند (ف) رضا دهد و اشارت بابرو کند :

چشم تو به بخشیدن صد گنج گهر
ابرو زند و گره بر ابرو نزند

ابروفراخ (ف) خوش و خندان روی ـ

ابروی زال زر (ف) ماه نو ـ

ابره (ع) بکسرتین ، سوزن و تیزی و نیش کژدم ـ

[**ابره**] رک : ابرهه ـ

ابره (ف) بوزن مسکه ، همان اورهٔ قبا ـ

ابرهه (ف) بفتح یکم و سیوم ، نام مردی که کلاه کلیسیا بر آورده کذافی الشرفنامه و قصه‌اش در مشارق و شرح آن مذکور است ، و در سکندریست ابرهه و ابره وزن اشهره ، نام سر لشکر اصحاب فیل که قیل محمود نام داشت و نیز اوره قبا ، موید لفظ ابره است این بیت ، ظهیر فرماید :

روزی که باز قهر تو پرواز میکند
در جنگ او عقاب فلک همچو ابره است

و در موید ابره وزن شهره آنچه مذکور شد و ابرهه بفتح یکم و سیوم نام مردی که قصه‌اش مشهور و مذکور است ـ

ابریر (ف) بوزن برگیر ، زر خالص در موید درباب زای معجمه نیز بهمین معنی آورده ـ

ابریز (ع) زرخالص ـ

ابریسم (ع) بفتح و کسر با و بسین مهمله و ضم آن ، معروف و آن معرب ابریشم است ـ

ابریشم (ف) به شین معجمه ، همان ابریسم مذکور و او را بریشم بحذف همزه و افریشم نیز گویند ، کذا فی الموید ـ

ابریق (ع) بکسر، آندستان و شمشیری که تابنده بود -

ابسال (ع) ببای ابجد، خود را بهلاکی سپردن و رسوا داشتن وگرو کردن و حرام کردن -

است (ف) وزن آلف[1]، رستنی است -

ابض (ع) بضم و سکون با، روزگار -

ابطح (ع) رود فراخ که درو سنگریزه بود، اباطح جمع آن -

ابعاد ثلثه (ع) طول و عرض و عمق جهان -

ابعاض (ع) بعین مهمله جمع بعض -

ابغث (ع) بفتح و غین معجمه، گرد رنگ و نام مرغیست[2] -

ابغض (ع) غضب کرده سده تر -

ابقع (ع) زاغ سیاه -

ابکار (ع) جمع بکر، و بکر معروف و بکسر همزه، بامداد کردن -

ابکم (ع) گنگ -

ابل (ع) بکسرتین، شتر -

ابلاغ (ع) بکسر، رسانیدن -

ابلغ (ت) زن حامله -

ابلج (ع) نیکو روی و کشاده ابرو -

ابلخ (ع) منکبر -

ابلق (ع) دو رنگ یکی سپید و دیگر هر رنگ که باشد -

ابلق‌الله (ب) بفتح همزه و هر دو لام نیز، پس قفا -

ابلق ایام (ف) زمانه -

ابلق چرخ روزگار (ف) یعنی شب و روز -

ابلق غم منی (ف) در اداتست بمعنی برخورو برخوردارمنی و ایام خرمی و در سکندری بجای غم عمر آورده بمعنی روزگار عمر خوش و فرح بحس و خرم و در فرهنگی ابلق عمر منی بدین معنی یافته -

ابلوچ (ف) وزن محمود بجیم پارسی، شربت است از قند سفید و قبل بواو پارسی و آن حلوائیست مانند قرص

---

۱ - بفتح اول و کسر ثانی و سکون سین بی نقطه و فوقانی - (برهان قاطع)

۲ - Dusty, inclining to be brown or dusky colour, a sort of bird. (Johnson)

آفتاب بغایت نرم، فارسیان قند از ابلوچ کرده اند و آنرا با خود هم تشبیه کرده اند -

ابلیس (ع) بمعنی نومید و معروف -

ابن آوا (ع) جانوریست کوچک مانند روباه کذا فی الصراح و در موید است بمعنی شغال -

ابنای دهر و ابنای عصر (ع) همزادان و هم عهد و اهل روزگار و آنرا ابنای روزگار نیز گویند -

ابن الله (ع) عیسی علیه السلام و قیل عزیر -

ابن السحاب (ع) باران -

[ابنانج] رک : بنانج

ابن سلام (ع) نام شوهر لیلی، کذا فی الموید، مخفی نماند که از لیلی و مجنون ملا عبدالله هانفی معلوم میشود که ابن سلام پسری داشت که باو نکاح لیلی بسته بودند -

ابن سیرین (ع) نام معبری چنان که در بیت است از انوری :

خواب شیرین بداندیش تو خوش خندانست
کابن سیرین قضا دم زند اندر تاویل

ابن الصبح (ع) آفتاب و روز و روشنای صبح و حرامزاده -

ابن عرس (ع) بکسر عین مهمله، راسو که هندش نیولا گویند -

ابن العنب (ع) مئی انگوری -

ابن غمام (ع) سرما کذا فی شرح النصاب -

ابن الماء (ع) مرغ آبی -

ابن المزنت (ع) ماه نو -

ابن المقله (ع) نام واضع این[1] خط، میگویند بسبب جرمی که ازو واقع آمده حاکم وقت دستش ببرید، در خواب بعرض آن سرور صلی الله علیه وسلم رسانید فرموده‌اند بشامت آنکه خط کوفه را تغیر دادی، کمال فرماید :

مردم چشم ابن مقلهٔ وقت
بده آن خط چو عنبر شد

و شیخ سعدی فرماید :

کاش ابن مقله بودی در حیات
تا بمالیدی خطش بر مقلتین

صاحب موید گوید که مرا از یکی ساعت که در کناره دریای علامت پایهای جانور پدید آمده بود ازان خط استخراج کرده‌اند -

۱ - نام واضع خط ثلث وغیره (موید و فرهنگ آنند راج) از شمس اللغات و کشف و صاحب غیاث آورده که ابن مقله نام مردی خطاط که بتاریخ سه صد و ده هجری از معقلی و کوفی و غیر آن شش خط اختراع نموده برای هر حرف طرز خاص قرار داده و اسامی آن شش خط این است : ثلث و توقیع و محقق و نسخ و ریحان و رقاع - بعد ازان بمرور ایام استادان دو خط دیگر یکی تعلیق از رقاع و توقیع دوم نستعلیق از نسخ و تعلیق استنباط نموده اند - (فرهنگ آنند راج)

ابن ملجم (ع) کنایت از عبدالرحمن بن ملجم قاتل حضرت علی کرم الله وجهه -

ابن وایل (ع) سحبان بن وایل که بغایت فصیح بود ، گویند تا یکسال یک حکایت گفتی و عبارت مکرر بیاوردی متضمن آن اسم است این بیت سلمان :

تا قلزم عطایت چون آل آل برمک
در معرض ملامت ای وای ابن وایل

ابنی (ب) ضداو[۲] -

ابن یامین و ابن یمین (ع) برادر عینی یوسف علیه السلام و نیز ابن یمین شاعریست معروف -

[ابن یمین] رک : ابن یامین -

ابوالبشر (ع) کنیت آدم علیه السلام -

ابوبکر (ع) معروف و نام ممدوح شیخ سعدی :

که سعدی که گوی بلاغت بود
در ایام بوبکر بن سعد بود

ابوالبنات (ع) پدر دختران و نام پشمینهٔ نرم چنانکه نوعی از سقرلاط را گویند -

ابو تراب (ع) کنیت شاه مردان علی -

ابو تمام و ابو تم (ع) نام صحابه انصاری که قرار او مشهور بود -

ابو جاد (ع) ابجد -

ابو جعاد (ع) کنیت گرگ -

ابو جیان (ع) نام زاهد توریت خوان و عالم ایشان و نیز کنایت از مرد عزول -

ابوالحرکه (ع) وطی و جماع زن -

ابوالحیا (ع) کنایت از امیر المومنین عثمان است -

ابوالحیل (ع) بکسر حای مهمله، سوسمار -

ابوالخصب (ع) گوشت و قیل آب -

ابوالخضر (ع) تره -

ابو خلسا[۲] (ع) تره ایست که خر و جز آن بخورد و خواب افزاید -

ابودراس[۳] (ع) نام کنیز و کنیت فرج زن -

---

۱ - رک : اجبی - ۲ - ابوجلسا - (پ)
۳ - ابودراس (آد) شرم زن (المزهر) - (لغت نامه)

وقار عظیم

داستان امیر حمزہ

(فورٹ ولیم اور لکھنؤ کے نسخے)

ہماری مختصر داستانوں میں جس طرح باغ و بہار (قصہ
ہار درویش) کا نام زبان زد ہے اسی طرح طویل داستانوں میں
ستان امیر حمزہ کے نام سے عوام اور خواص سب واقف ہیں۔
الانکہ اس واقفیت اور مقبولیت کی بنا دونوں کتابوں کے معاملے
ں مختلف ہے۔ باغ و بہار کی شہرت اور مقبولیت کا سب سے بڑا
بب اس کا اسلوب نگارش اور انداز بیان ہے، جس میں بعض ایسے
ناصر موجود ہیں جو اس معروف قصے کو ہر زمانے میں مقبول بنا
کتے ہیں۔ اس کے بر خلاف امیر حمزہ کی پسندیدگی کا سبب انداز بیان
ے کہیں زیادہ اس کے وہ کردار ہیں جنہوں نے اپنے کارناموں کی
ولت سننے اور پڑھنے والوں کے دل میں مستقل جگہ بنائی ہے۔

باغ و بہار اور داستان امیر حمزہ کی ایک اور قدر مشترک
ہ ہے کہ قصے کے بنیادی عناصر اور ان کا ڈھانچا فارسی سے لیا گیا
ہے۔ یہ بات البتہ ہے کہ اردو والوں نے ان قصوں میں اپنی پسند،
زاج اور ماحول کے مطابق، پڑھنے والوں کی دلچسپی کو مد نظر
کھ کر ان میں بہت سی تبدیلیاں بھی کی ہیں اور اضافے بھی۔
س نقطۂ نظر سے داستان امیر حمزہ کو اردو کے سب قصوں پر
نفوق حاصل ہے اس لئے کہ اردو کے اس سب سے طویل قصے
یا داستان) میں مترجمین اور مولفین نے بعض اوقات اتنی چیزیں
ڑھائی ہیں کہ فارسی کے قصوں کے ترجمے ہونے کے بجائے انہوں
نے مستقل تصانیف کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔

داستان امیر حمزہ کی تصنیف، تالیف اور ترجمے کے سلسلے میں
اتنی باتیں لکھی اور کہی گئی ہیں کہ اس سلسلے میں اکثر لوگوں

کے ذہن میں بہت سی الجھنیں ہیں - گویہ مضمون ان الجھنوں کو دور کرنے کی غرض سے نہیں بلکہ داستان امیر حمزہ کے ایک خاص ایڈیشن کی بعض نمایاں خصوصیات کے اظہار اور وضاحت کی غرض سے لکھ رہا ہوں لیکن اصل موضوع تک پہنچنے سے پہلے اختصار کے ساتھ ان الجھنوں کی طرف اشارہ ضروری معلوم ہوتا ہے -

اس ضمن میں سب سے پہلے ذہن میں رکھنے کی بات یہ ہے کہ اردو میں داستان امیر حمزہ کی تالیف و تصنیف کی دو الگ الگ کڑیاں ہیں - ایک کڑی تو وہ ہے جس کا تعلق فورٹ ولیم کالج میں لکھے جانے والے قصوں سے ہے - یعنی فورٹ ولیم کالج میں خلیل علی خاں اشک نے داستان امیر حمزہ کو چار حصوں میں ترجمہ کرکے اسے ایک جلد کی شکل میں ترتیب دیا - اس کا سنہ ترجمہ و تالیف ۱۸۰۱ء (مطابق ۱۲۱۵ ہجری) ہے - اسی کتاب پر محمد عبداللہ بلگرامی نے ۱۸۷۱ء میں نولکشور والوں کے لئے نظر ثانی کی اور پھر اس نظر ثانی کے بعد ۱۸۸۷ء میں نولکشور پریس کی ایما پر شیخ تصدق حسین نے اس پر مزید نظر ثانی کی - آج کل بازار میں داستان امیر حمزہ کے نام سے جو کتاب (۲۰×۳۰ سائز پر) عام طور سے ملتی ہے وہ یہی نولکشور پریس والی شیخ تصدق حسین کی نظرثانی کی ہوئی کتاب ہے -

داستان امیر حمزہ کے حصوں کی دوسری کڑی وہ ۴۶ جلدیں ہیں جو نولکشور پریس کے زیر اہتمام مرتب ہوئیں - ان ۴۶ جلدوں میں سے بعض کی حیثیت ترجمے اور تالیف کی ہے اور بعض خالصتاً تصانیف ہیں - اور ان کی تالیف، ترجمے اور تصنیف میں کئی مشہور داستان گو شریک ہیں - ان ۴۶ جلدوں کی جو تفصیل ڈاکٹر گیان چند صاحب کی قابل قدر تصنیف 'اردو کی نثری داستانیں' میں درج ہے وہ یہ ہے :

نوشیروان نامہ	دو جلد	ترجمہ تصدق حسین
ہرمزنامہ	ایک جلد	ترجمہ تصدق حسین
ہومان نامہ	ایک جلد	تالیف احمد حسین قمر
کوچک باختر	ایک جلد	ترجمہ تصدق حسین

بالا باختر	ایک جلد	ترجمہ تصدق حسین
ایرج نامہ	دو جلد	ترجمہ تصدق حسین
طلسم ہوش ربا	چار جلد (ابتدائی)	ترجمہ محمد حسن جاہ
طلسم ہوش ربا	چار جلد (آخری)	ترجمہ احمد حسین قمر
صندلی نامہ	ایک جلد	ترجمہ سید اسمعیل اثر
لورج نامہ	دو جلد	ترجمہ پیارے مرزا تصدق حسین اور اسمعیل اثر
لعل نامہ	دو جلد	ترجمہ تصدق حسین
آفتاب سجاعت	۶ جلد	تصنیف تصدق حسین
گلستان باختر	۳ جلد	تصنیف تصدق حسین
بقیہ طلسم ہوس ربا	۲ جلد	تصنیف احمد حسین قمر
طلسم نور افشاں	۳ جلد	تصنیف احمد حسین قمر
طلسم ہفت پیکر	۳ جلد	تصنیف احمد حسین قمر
طلسم خیال سکندری	۳ جلد	تصنیف احمد حسین قمر
طلسم نوخیز جمشیدی	۳ جلد	تصنیف احمد حسین قمر
طلسم زعفران زار سلیمانی	۲ جلد	تصنیف احمد حسین قمر تصدق حسین

ان ۴۶ جلدوں میں سے ۲۰ ترجمہ ہیں ایک میں ترجمہ اور تالیف شامل ہے اور باقی ۲۵ جلدیں تصدق حسین اور احمد حسین قمر کی تصانیف ہیں ۔ ان ضخیم جلدوں کے متعلق ڈاکٹر گیان چند نے حساب پھیلا کر یہ لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص اوسطاً دو سو صفحے روز پڑھے تو ان جلدوں کو آٹھ مہینے میں ختم کر سکے گا ۔

ان ۴۶ جلدوں کے ترجمے ، تالیف اور تصنیف کی جو تفصیلات اوپر درج کی گئیں انہیں دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ کام کئی مختلف آدمیوں کا ہے اور ترجمے اور تالیف سے زیادہ تصنیف ہے ۔ اس لئے ان کتابوں پر کسی طرح کی تنقیدی بحث کرنے اور ان کے ادبی محاسن کا اندازہ لگانے کے لئے ضرورت ہے کہ ترجموں اور تصنیفوں کو الگ الگ کیا جائے ۔ جو ترجمے ہیں انہیں اصل سے

ملایا جائے اور دیکھا جائے کہ اصل حصے کی تصنیف اور اس کا ماخذ کیا ہے - پھر اس چیز پر نظر رکھی جائے کہ مترجمین اور مولفین نے ترجمہ کرتے وقت اُن میں کیا کیا تصرفات کئے ہیں ، اور پھر یہ کہ جن دفتروں کی حیثیت تصانیف کی ہے اُن کا مرتبہ مجموعی اعتبار سے اُن دفتروں کے مقابلے میں کیا ہے جو ترجمے کی ضمن میں آتے ہیں - غرض ان حیرت انگیز ترجموں اور تصنیفوں کا مکمل جائزہ لینا اور اُن کے سب پہلوؤں کی وضاحت کرنا ایک ایسا کام ہے کہ آدمی اپنی عمر اسی کے لئے وقف کردے تو ممکن ہے کہ اس کا حق ادا کرسکے -

اُردو میں ان ۴۶ جلدوں کے ترجمے اور تالیف کا سلسلہ ۱۸۹۳ میں شروع ہوا اور ۱۹۰۸ میں ختم ہوا - چھپنے کا سلسلہ البتہ ۱۹۱۷ تک جاری رہا -

جن دفتروں کا ترجمہ اُردو میں کیا گیا ہے اُن کے ماخذ کی تحقیق کرتے ہوئے ڈاکٹر گیان چند نے جو نتیجے نکالے ہیں اُن سے پڑھنے والوں کی بہت سی اُلجھنیں دور ہوتی ہیں - یہ نتائج مختصر طور پر یہ ہیں :

(۱) قصہ٘ امیر حمزہ کسی ایک شخص نے نہیں بلکہ مختلف زمانوں میں مختلف آدمیوں نے لکھا -

(۲) یہ بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی کہ اصل قصہ (فارسی) ایران میں لکھا گیا یا ہندوستان میں -

(۳) داستان امیر حمزہ کے سب دفتروں میں قدیم ترین نوشیروان نامہ ہے اور محمود غزنوی اور ہمایوں کے عہدوں کے درمیان تصنیف ہوا -

(۴) رموز حمزہ کے نام سے یہ نسخہ ۱۶۰۰ع کے قریب لکھا جا چکا تھا -

(۵) داستان امیر حمزہ کے اصل میں آٹھ دفتر ہیں اور یہ اٹھارویں صدی کے نصف اول تک مرتب ہو چکے تھے -

(۶) اُردو میں ترجمہ کرتے وقت ہمارے داستان گویوں نے ان میں بہت سے اضافے کئے ہیں ۔ یہاں تک کہ اُردو ترجموں اور فارسی اصل کا مقابلہ کیا جائے تو ترمیموں کی ضخامت اصل سے دوگنی ہوگی ۔

ضخامت کا یہ اضافہ عموماً اس لئے ہوا ہے کہ ہمارے داستان گویوں نے ترجمے کرتے وقت انہیں اپنے ماحول کی رنگ آمیزی سے ایک خاص طرح کے قاری کے لئے دلچسپ اور دلکش بنانے کی کوشش کی ہے ۔

اس ساری تمہید کا مقصد یہ ہے کہ اُردو میں داستان امیر حمزہ کے نام سے جو کتابیں موسوم و معروف ہیں اُن کے دو الگ الگ سلسلے ہیں ۔ ایک سلسلہ نو چار حصوں کی وہ کتاب ہے جسے اشک نے ترتیب دیا تھا اور اُس پر لکھنؤ میں نظر ثانی ہوئی تھی اور دوسرا طویل اور ضخیم سلسلہ اُن ۴۶ جلدوں کا ہے جن کا ذکر میں نے ابھی کیا ۔ اشک والی داستان امیر حمزہ کا ماخذ نوسیروان نامہ کا قدیم دفتر ہے ۔ میری بحث اور تجزیہ کا موضوع یہی نسخہ ہے ۔ بحث اور تجزیے کے وقت میں نے اُس فرق کو اپنا موضوع بنایا ہے جو اشک کے اصل نسخے اور لکھنوی نسخے میں ہے ۔

ان دونوں نسخوں میں پہلی ہی نظر میں دیکھنے والے کو جو فرق دکھائی دیتے ہیں ، یہ ہیں :

اشک کے نسخے اور لکھنوی نسخے کی ضخامت میں خاصا فرق ہے ۔ لکھنوی نسخہ ضخامت میں اشک کے نسخے کے مقابلے میں تقریباً ڈیڑھ گنا ہے ۔

نسخوں کا آغاز اور انجام ایک دوسرے سے نہیں ملتا ۔

دونوں نسخوں میں داستانوں کے عنوان ایک دوسرے سے مختلف ہیں ۔

ایک نسخے میں (یعنی اشک والے نسخے میں) ہر جلد میں واقعات کو داستانوں میں تقسیم کیا گیا ہے ۔ اور چاروں جلدوں میں

ملا کر ۸۸ داستانیں ھیں - لکھنو والے نسخے میں قصے کی تقسیم جلدوں میں تو کی گئی ہے لیکن داستانوں کے نمبر درج نہیں ھیں - اسے ایک مسلسل قصے کی طرح بیان کیا گیا ہے -

یہ ظاھری فرق بظاھر کوئی اھمیت نہیں رکھتے - لیکن جب پڑھنے والا ان چھوٹے چھوٹے اختلافات کو ذرا گہری نظر سے دیکھتا ہے تو اسے یہ اندازہ کرنے میں دشواری نہیں ھوتی کہ ان چھوٹی باتوں کے پردے میں بعض بڑی اور اھم باتیں پوشیدہ ھیں -

آئیے اب ایک ایک کر کے ان ظاھری باتوں پر نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ ان سے کیا منطقی نتیجے اخذ کئے جا سکتے ھیں -

اشک کے نسخے کی تمہید یہ ہے :

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلواۃ والسلام علی رسولہ محمد و آلہ اصحاب اجمعین - بنیاد اس قصۂ دلچسپ کی سلطان محمود بادشاہ کے وقت سے ہے - اس زمانے میں جہاں تک راویان شیریں کلام تھے ، انہوں نے آپس میں مل کر امیر حمزہ کے قصے کی چودہ جلدیں کہیں ، واسطے بادشاہ کے سنانے کے - اس کے سننے سے آئین ھر طرح کی خلقت کا معلوم ھوتا ہے ، دوسرے منصوبے لڑائیوں کے اور قلعہ گیری اور ملک گیری کے یاد آتے ھیں - اس خاطر ھر روز بادشاہ کو سناتے تھے کہ کسی امر میں غیر کی مصاحبت کا در ماندہ نہ رہے اور اب اس عصر میں شاہ عالم بادشاہ کے ، مطابق سن بارہ سے پندرہ اور اٹھارہ سو ایک کے ، خلیل علی خاں نے جو متخلص بہ اشک ہے بموجب خواھش مسٹر گلکرسٹ صاحب عالی شان والا مناقب کے ، واسطے نو آموزوں زبان ھندی کے ، اس قصے کو زبان میں اردوے معلا کی لکھا تا کہ صاحبان مبتدیوں کے پڑھنے کو آسان ھووے"

اشک نے اس تمہید میں داستان امیر حمزہ کو سلطان محمود کے عہد کی تصنیف بتایا ہے - اس قصے کے جتنے اھم قلمی نسخے دنیا کے بعض بڑے بڑے کتب خانوں میں موجود ھیں ان کے بیانات میں بڑے اختلاف ھیں اور ان اختلافات کا خلاصہ یہ ہے کہ قصۂ حمزہ

کا مصنف عباس (برادر حمزہ) امیر خسرو، فیضی، ملا جلال بلخی (معاصر سلطان محمود) ابوالمعالی اور شاہ ناصر الدین محمد کو بتایا گیا ہے۔ یہ موضوع کہ یہ قصہ اصل میں کس نے لکھا اور کس زمانے میں لکھا ہمارے دائرۂ بحث سے باہر ہے[1]۔ البتہ ایک بات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں کہ فارسی کے جتنے مختلف الاصل نسخے جا بجا دور افتادہ کتب خانوں میں محفوظ ہیں ان میں بنیادی قصہ وہی نوشیرواں اور حمزہ کا قصہ ہے جس کی بنیاد پر اشک کی کتاب تالیف کی گئی ہے۔

اشک کی تمہید کا دوسرا اہم حصہ اس کا آخری ٹکڑا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ یہ قصہ مسٹر گلکرسٹ کے کہنے سے آسان اردو میں لکھا گیا تاکہ صاحبان اسے آسانی سے پڑھ سکیں۔

اس تمہید کے بعد اشک نے قصہ شروع کیا اور قصے کا پہلا عنوان ہے۔

"ابتدائے دفتر نوشیرواں"

لکھنؤ والے نسخے میں نہ اشک والی تمہید شامل ہے اور نہ "ابتدائے دفتر نوشیرواں" کا عنوان۔ بلکہ آغاز داستان کے بعد "بسم اللہ" کرکے داستان شروع کر دی گئی ہے۔ تمہید کی طرح دونوں کتابوں کے خاتمے بھی ایک دوسرے سے نہیں ملتے۔

اشک والے نسخے میں جہاں کہانی ختم ہوتی ہے وہاں مسلمانوں کے لئے دعائے خیر کرکے اشک نے "آمین یا رب العالمین" کہا ہے اور واللہ اعلم بالصواب کہہ کر خاموش ہوگئے ہیں۔ اس کے برخلاف لکھنو نسخے میں قصہ ختم ہو جانے کے بعد بھی خاصی طویل عبارت میں یہ بتایا گیا ہے کہ اشک والے نسخے میں ترمیم و تصرف کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ لکھنوی نسخے کے آخر میں یہ عبارت درج ہے:

---

۱ - اس کی بڑی اچھی بحث ڈاکٹر گیان چند کی کتاب "شمالی ہند کی نثری داستانیں" میں کی گئی ہے۔ ملاحظہ ہوں صفحات ۱۸۴ تا ۱۹۴ کتاب مذکور پہلا ایڈیشن شائع کردہ انجمن ترقی اردو، کراچی ۱۹۵۴ء)

قدرت صانع بےہمال قابل سپاس لا کلام ہے۔ اور سب سے زیادہ مقام بے منتہا کا یہ مقام ہے کہ فصحا اور بلغا کو قوت تصنیف عطا کر کے طریقۂ تالیف سیرو تاریخ بتا دیا۔ داستان گوی و ایجاد قصص کا ملکہ دیا۔ اگر نظر غور سے دیکھا جائے تو افکار اور پریشانی مٹانے کا کوئی طریقہ ملاحظہ تاریخ و معائنہ قصص سے بہتر پیدا نہیں، حالت رنج و غم میں کوئی مونس اور رفیق ایسا نہیں۔ اگرچہ ہر داستان کو یہی مرتبہ حاصل ہے مگر خاصۃً داستان نادر بیان امیر حمزہ کا رتبہ سب داستانوں میں اعلیٰ و کامل ہے۔ اس کے مولف نے عجب سحر کاری فرمائی ہے کہ ہر شخص اس کا دل و جان سے خریدار ہے۔ جو بصرف توجہ و زر کثیر جناب معلیٰ القاب مجسم فیض و نوال مظہر جود و افضال، عالی ہمت، والا مرتبت جناب منشی نولکشور صاحب سی۔ آئی۔ ای مرحوم بمعاوضۂ عطیہ گراں بہا سر دفتر فصحائے عصر مولوی حافظ سید عبداللہ صاحب بلگرامی رحمتہ اللہ علیہ نے آراستہ فرما کر اور تعقید عبارت رفع کر کے اس قصہ کی عبارت کو اردوئے معلیٰ بنا دیا . . بعدہٗ بار چہارم صاحب فہم و ذکا، ماہر زبان روز مرہ اردوئے معلیٰ مولوی سید تصدق حسین مصحح مطبع نے یہ تعمق نظر نظرثانی فرما کر طرز مناسب پر عبارت قصہ کو آراستہ کیا''

اسی عبارت کے بعد تمت ہے اور پھر مطبع کی طرف سے یہ اعلان:

''تہذیب و ترتیب اس کی عبارات و محاورات کی بصرف زر خطیر مطبع ہوئی اور جناب مولوی حافظ سید محمد عبداللہ صاحب بلگرامی نے یہ دماغ سوزی بہ ایمائے جناب منشی نولکشور صاحب سی۔ آئی۔ ای مرحوم مالک مطبع گوارا فرمائی ہے اور بعد ازاں ماہر زبان مولوی سید تصدق حسین صاحب رضوی مصحح مطبع نے کمال سعی و عرق ریزی کے ساتھ آخریں نظر سے اس کو زیادہ آراستہ کیا ہے''۔

اشک کی تمہیدی عبارت اور لکھنوی نسخے کے خاتمے کی عبارت میں دو باتیں قابل توجہ ھیں ۔ اشک نے داستان امیر حمزہ اُن انگریزوں کے لئے لکھی ھے جو اردوئے معلیٰ کے مبتدی طالب علم تھے ۔ اسی مقصد کے ماتحت اُن کے قصے کی زبان آسان ھے ۔ اس کے برخلاف لکھنوی نسخے میں اشک کے نسخے کی ''تعقید عبارت'' رفع کرنے اور ''عبارت قصه کو آراسته کرنے'' پر زور دیا گیا ھے ۔ چنانچه اشک کی داستان اور نظرثانی کے بعد لکھنؤ میں چھپی ھوئی داستان کے درمیان یہی امتیازی فرق ھیں ۔ اشک کے یہاں سادگی اور تعقید ھے اور سید محمد عبداللہ اور سید تصدق حسین والے نسخے میں آراستگی اور تکلف ۔ ھمارا تجزیه آگے چل کر اسی اجمال کی وضاحت کرے گا ۔ اس فرق کے علاوہ بھی دونوں نسخوں کے کے مطالعے کے بعد جو امتیاز نظر کے سامنے آتے ھیں اُن کی طرف اشاره کرنا بھی اس مطالعے اور تجزیے کا مقصود ھے ۔

یه فرق کیا کیا ھیں اور کس کس طرح نمایاں ھوئے ھیں اس کا اندازہ کرنے کے لئے دونوں داستانوں کے اُن ابتدائی حصوں کا مطالعه کیجئے جن کا عنوان اشک والے نسخه میں ھے ''ابتدائے دفتر نوشیرواں'' اور لکھنوی نسخے میں آغاز داستان ۔

پہلے اشک کی عبارت پڑھئے :

''نامه آغاز داستان امیر حمزہ نامدار کشورستاں عم رسول آخر الزماں اس طرح ھے که بیچ سر زمین ایران کے ملک مدائن میں ایک بادشاہ قباد کامران نامی اس قدر شجاع و عادل ، رعیت پرور تھا که اُس کے عمل میں ھر چند غریب و فقیر اپنے اپنے گھر میں غنی تھا ۔ ظلم اور جور کا اس کے شہر میں کہیں نام اور نشان نه تھا ، مگر عدل اور انصاف که اُس کے دور میں تمام خلقت آسودۂ و بے خطر تھی ۔ کسی کو کسی بات کا غم نه تھا ۔ اُس کے عدل میں باگ بکری ایک گھاٹ پانی پیتے تھے ۔ اس بادشاہ کے پاس چالیس وزیر تھے که جن کی شمیم عقل اس گلشن سلطنت کو ھمیشه خوشبو رکھتی تھی ۔ ان وزیروں کے سوا سات سے حکیم اور رمال اور سات ھی سے ندیم صاحب کمال ۔ چار سے پہلوان کرسی نشین ، تین سے بادشاہ

تاجدار دس لاکھ سوار ، چالیس هزار غلام زریں کمر و زریں کلاہ مغرق بجواھر اس بادشاہ کی خدمت مس روز و شب حاضر رھتے تھے ۔ سردار سب وزیروں میں ملک القش نامی شخص تھا کہ اس سے بیشتر بادشاہ کو امور سلطنت میں مشورہ ملتا تھا ۔ اسی شہر میں ایک حکیم مرد مسلمان اولاد میں حضرت دانیال پیغمبر کے ، بخت جمال نامی رھتا تھا ۔ اس کو علم رمل مس اس قدر معلومات تھی کہ القش وزیر بھی اکثر اس کے زائچے کے علم کو سیکھنے لگا ۔ کئی ایک دن میں باھم یہ دوستی بہم پہنچائی کہ ایک روز بن دیکھے چین نہ ھوتا ۔ بعد کتنے دنوں کے ایک روز القس بطور همیشہ خواجہ بخت جمال کے پاس آیا اور کہا کہ آج میں نے آپ کی خاطر قرعہ ڈالا تھا ۔ اس میں صورت خوف و خطر کی نظر آئی کہ وہ خوف چالیس دن تک رہے گا ۔ پس لازم ہے آپ اسے دن گھر سے پاؤں باھر نہ رکھئے کہ خطرہ جان کا ہے اور اعتبار کسی کا نہ کیجئے ۔ بندہ بھی ان روزوں کے بعد آن کر قدم بوس ھوگا ۔ یہ کہہ کر اپنے گھر کی راہ لی ۔ یہاں بخت جمال گھر کے دروازے کو بند کرکے ایک کونے میں بیٹھ کر لگا گننے تا کہ انتالیس دن بخیر و خوبی گزر گئے ۔ چالیسویں دن صبح کو اٹھ کر غسل کیا اور اجلے کپڑے پہن کر عصا کو هاتھ میں لیا کہ آج آپ چل کر القش وزیر سے ملاقات کیجئے کہ اپنے تئیں اس شہر میں سوا اس کے اور کسی سے واسطہ نہیں ہے ۔ یہ کہہ کر گھر سے نکلا اور وزیر کے گھر کی طرف چلا ۔ آدھی راہ طے کی تھی ۔ باعث سے دھوپ کی گرمی کے ایک درخت کے تلے آن کر کھڑا رھا ۔ دیکھا تو وھاں ھوا کا مکان ہے ۔ کہیں کسی آدمی کا اپنے سوا نام نہیں ۔ از بسکہ وھاں کسی وقت میں عمارت تھی ۔ ٹوٹی ٹوٹی حویلیوں کے کچھ کچھ نسان باقی رہ گئے تھے ۔ اس میدان کی ٹھنڈی ٹھنڈی ھوا جو اس کو خوش آئی ایک درخت کے نیچے ٹہلنے لگا اور جی میں کہا کہ یہ مکان کئی برس سے ویران پڑا ہے اور اب تابع ملک القش وزیر کے ہے ۔ اس نے بھی آباد نہ کیا ۔ اگر یہ بسے تو اس سے بہتر مکان اور لب دریانہ نکلے ۔ یہ تصور کرکے ایک بارہ دری کا ٹوٹا دروازہ تھا اس میں جاکر اندر ایک دالان کے دیکھا تو داھنی طرف ایک کوٹھری ہے ، لیکن دروازہ

اینٹوں سے چنا ہے ۔ بخت جمال نے عصا کی نوک سے اینٹوں کو گرا کر جی میں کہا اس کے اندر جا کر دیکھئے کہ کیا ہے ۔ اس کوٹھری کے اندر جا کر دیکھا تو ایک کونے میں چھوٹی سی کھڑکی ہے اور اس میں قفل لگا ہوا ہے پر زنگ نے اسے ایسا کھایا ہے کہ لوہے میں کچھ باقی نہیں ہے ۔ ہاتھ سے زور کرکے اس قفل کو توڑ ڈالا اور دروازہ کھول کر دیکھا تو کچھ سیڑیاں سی نظر آئیں ۔ نیچے ایک نہ خانہ تھا ۔ ان سیڑھیوں سے اتر کر اس کے اندر گیا اور اس میں دیکھا کہ سات گنج مال کے ہیں ۔ شداد نے کسی وقت میں یہاں دفن کئے تھے ....''

اس کے بعد قصہ اس طرح آگے چلتا ہے کہ بخت جمال یہ خزانہ دیکھ کر اس کی خبر القس کو کرتا ہے اور اسے نہ خانے میں لا کر اس گنج پنہاں کا نظارہ کراتا ہے ۔ خزانہ دیکھ کر القش کی نیت خراب ہوجاتی ہے اور وہ افشائے راز کے خوف سے بخت جمال کو قتل کر دینے کا فیصلہ کرتا ہے ۔ اس کی منت سماجت کی ذرا پروا نہیں کرتا ۔ بخت جمال کو یقین ہو جاتا ہے کہ القش کا فیصلہ اٹل ہے تو وہ راضی برضا ہوکر القس کو کچھ وصیتیں کرتا ہے ۔ القس بخت جمال کو قتل کرکے نہ خانے میں دفن کر دیتا ہے ۔ حویلیوں کی ازسر نو تعمیر کا انتظام کرتا ہے اور بخت جمال کی وصیت کے مطابق اس کے گھر جاتا ہے ۔ داستان کا یہ ٹکڑا اشک نے اس طرح ختم کیا ہے :

''القش بموجب وصیت خواجہ ایک دو سے روپے لے کر بخت جمال کے گھر گیا اور جو جو وصیت تھی سب کہی ۔ اور کہا یہ روپے اپنے خرچ میں لاؤ اور اس کی طرف کا کچھ غم نہ کھاؤ ۔ میں نے اس کو تجارت کی خاطر چین بھیجا ہے ۔ یہ کہہ کر اپنے گھر گیا ۔ بعد کئی دن کے جب وہ باغ تیار ہوا القش نے اس کا نام باغ بیدار رکھا ۔ واللہ اعلم بالصواب''

اب دیکھئے کہ لکھنوی نسخے میں داستان کا یہ ٹکڑا کس طرح بیان کیا گیا ہے :

بسم اللہ الرحمن الرحیم

''واقعہ نگاران رنگین تحریر امور خان سہریں تقریر ، نو کنندگان افسانۂ کہن ، یاد دھندگان دیرینہ سخن یوں بیان کرتے ہیں کہ سر زمین ایران ، جنت نشان میں ملک مدائن کا ایک شہنشاہ تھا ، قباد کامران نام ۔ رعیت پروری میں لا جواب اور عدالت گستری میں نظیر اُس کا نایاب ۔ اور اُس بادشاہ جم جاہ کے چالیس وزیر باعقل و دانش صاحب تدبیر اور سات سو حکیم کہ افلاطون و ارسطو اُن کے سامنے طفل دبستاں تھے ۔ سب کے سب عقل و کیاست و فہم و فراست میں یکتائے جہاں تھے ۔ ہر ایک علوم حکمت و ہندسہ و رمل و جفر و نجوم میں جالینوس و اقلیدس و فیثا غورث کو خطاب کے لائق نہ جانتا اور سو ندیم کہ علم ادب و علم مجلس میں ہر متنفس اُستادستاد قدر داناں اور چار ہزار پہلوانان کہ اگر سام و نریمان و رستم و زال اُن کے روبرو آتے تو سپر عجز کی میدان پہلوانی میں پھینک کر حلقۂ ساگردی گلے میں لٹکاتے ۔ اور تین سو بادشاہ تاجدار کہ ہر ایک بجائے خود کوس لمن الملک بجاتا تھا اُس کے باج گزار تھے ، سر اطاعت خم کئے ہوئے تابعدار تھے اور دس لاکھ سپاہی کینہ خواہ اور چالیس دستۂ غلامان زریں کمر مرصع مفرق بہ جواہر ، اس بادشاہ کی مجلس ارم فردوس تزئین میں حاضر رہا کرتے ۔ خدمت گزاری میں چست و چالاک جاں نثاری کا دم بھرا کرتے ۔ اور اسی شہر میں ایک حکیم خواجہ بخت جمال نامی، اولاد میں حضرت دانیال پیغمبر علیٰ نبینا و علیہ الصلواۃ والسلام کے مقیم تھا ، علم و حکمت و رمل و نجوم و جفر میں یادگار حکمائے سلف بے مثل و ندیم ۔ ملک القش نامی وزیر شاہ نے اکثر اس کے احکام کو آزمایا اور بہ تمنائے تمام زانوئے شاگردی اُس کے رو برو نہ کیا اور ایسا معتقد و گرویدہ ہوا کہ ایک دم جدائی اُس کی گوارا نہ کرتا ۔ چند روز کے عرصے میں البقش نے

علم رمل میں ایسی مہارت پیدا کی اور وہ دستگاہ بہم
پہنچائی کہ خواجہ کا شاگرد رشید مشہور ہوا اور شہرہ
اُس کا دور دور ہوا ۔ ایک دن اُس نے خواجہ سے کہا شب
کو بے شغلی سے دل جو گھبرایا میں نے تمہارے واسطے
قرعہ پھینکا ۔ شکلوں کے ملانے سے معلوم ہوا کہ اختر
تمہارا خانۂ نحوست میں ہے ، چندے گردش تمہاری
قسمت میں ہے ۔ چالیس روز تک اُسی خانہ میں رہے گا ۔
پس اتنے دن گھر سے قدم باہر نہ رکھئے گا اور کسی کا
اعتبار نہ کیجئے گا ، حتیٰ کہ میں بھی اتنے دنوں تک
سنگ صبر اپنی چھاتی پر دھروں گا ، ملاقات آپ سے نہ
کروں گا ۔ خواجہ القش کے فرمانے کے بموجب اپنے گھر کا
دروازہ بند کر کے عزلت گزیں ہوا ۔ دوست آشنا سے
ترک ملاقات کر کے گوشہ نشین ہوا ۔ جب اُنتالیس دن
خیریت سے گزر گئے ، ایام نحوست و دلدر سر سے اُتر گئے
چالیسویں دن خواجہ سے نہ رہا گیا ۔ بیٹھے بیٹھے گھبرا گیا ۔
عصا ہاتھ میں لے کر گھر سے باہر نکلا کہ القش وزیر سے
مل کر ملاقات کیجئے ، اپنی صحت و عافیت سے اُس کو مژدہ
دیجئے کہ سوائے اُس کے اس شہر میں کوئی اپنا یار
وفادار نہیں ہے ، دل جو محبت شعار نہیں ہے ۔ اتفاقاً
شاہراہ کو چھوڑ کر ویرانہ کی طرف جا نکلا ۔ چونکہ
گرمی کا موسم تھا تمازت آفتاب سے بےتاب ہو کر ایک
درخت سایہ دار کے نیچے بیٹھ گیا ۔ ناگاہ ایک عمارت عالی شان
سامنے سے نظر آئی مگر چار دیواری اُس کی گر گئی تھی ۔ کچھ
جی میں جو آیا ٹہلتے ٹہلتے اُس طرف بڑھا ۔ دیکھا کہ
اکثر مکانات مسمار ہو گئے ہیں ۔ دالان ٹوٹے پڑے ہیں ۔
لیکن ایک دالان قائم ہے ، مثل دل عاشقاں پریشان سنسان ،
اور اُس دالان میں ایک کوٹھری کا دروازہ اینٹوں سے
تیغا کیا ، صحیح و سالم ہے ۔ خواجہ نے اینٹوں کو جو
ہٹایا دست راست کی طرف ایک چھوٹا سا دروازہ نظر آیا مگر
مقفل ۔ خواجہ نے چاہا کہ کسی اینٹ پتھر سے کھولوں ،

تھوڑی زور آزمائی کروں ۔ اس ارادہ سے اُس میں ہاتھ لگایا ۔
ہاتھ لگاتے ہی کھل کر گر پڑا ۔ خواجہ نے بڑھ کر اُس کے
اندر قدم رکھا ۔ ایک نہ خانہ دیکھا ۔ اُس میں سات گنج
زر و جواہر بیش بہا کے شداد کے جمع کئے ہوئے دفن تھے ۔

اس کے بعد کی تفصیلات لکھنوی نسخے میں بھی وہی ہیں جو
اشک والے نسخے میں ۔ یعنی خواجہ یہ خبر سنانے کو فوراً القش کے
پاس گیا اور اُسے خزانے کی خبر سنائی ۔ یہ خبر سن کر القش خواجہ
کے ساتھ خزانہ تک آیا اور اُسے دیکھ کر دنگ رہ گیا اور اخفائے راز
کے خوف سے خواجہ کو قتل کردیا ۔ خواجہ کی وصیت کے مطابق
اُس کے گھر جا کر اُس کے گھر والوں کو سمجھا بجھا دیا ۔ اس نسخہ
میں قصے کا یہ ابتدائی حصہ ان الفاظ پر ختم ہوتا ہے :

"حکم کی دیر تھی ۔ فی الفور داروغہ نے معمار مزدور
سنگ تراش شہر سے بلا کر مدد جاری کی ۔ چند روز کے
عرصے میں چار دیواری مع باغ بنگلہ تیار ہوئی ۔ القش
دیکھ کر مسرور ہوا ۔ نام اُس کا باغ بیداد رکھا اور
خواجہ بخت جمال کے گھر میں جاکر وصیت خواجہ کی
بیان کی اور بہت تسلی اور تشفی دی ۔ اور بہت روپیہ
دے کر کہا کہ تم اس کو اپنے خرچ میں لاؤ ، پھر جب
ضرورت ہوگی امداد کی جائے گی ، تکلیف نہ ہونے پائے گی ۔
خواجہ کو میں نے تجارت کے واسطے چین کی طرف بھیجا
ہے ۔ بہت جلد وہاں سے منفعت اٹھا کر پھر آتا ہے ۔
یہ کہہ کر گھر کی راہ لی ۔ اصل حقیقت دل میں رکھی"

داستان امیر حمزہ کے ان دونوں نسخوں کے ابتدائی حصوں
مطالعہ کے بعد پڑھنے والا جو بدیہی اور سیدھے سادے نتیجے نکالتا
ہے وہ یہ ہیں :

(۱) قصے کے اصل مولف اور اُس پر نظر ثانی کرنے والوں میں
اس حد تک اتفاق اور اتحاد ہے کہ قصہ کو آراستہ
و پیراستہ کرتے وقت بھی لکھنؤ والوں نے واقعات کے

اهم اجزا میں کوئی تبدیلی نہیں کی بلکہ اُس کے ضروری عناصر کو جوں کا توں قائم رکھا ہے اور اسی لئے قصے کے ناموں اور ان ناموں سے تعلق رکھنے والے خصائص کو بھی حتی الامکان بر قرار رکھنا ضروری سمجھا ہے۔

(۲) لیکن قصے کے اہم اور بنیادی اجزا میں اپنے مذاق کے مطابق کمی بیشی قدم قدم پر کی ہے اور اس لئے پڑھنے والے کے سامنے کرداروں اور ماحول کی جو تفصیلات آتی ہیں اُن کی جزئیات میں ایسے جا بجا فرق نظر آتا ہے۔

(۳) اشک کے قصے میں بیان کی سادگی اُس کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے۔ اسی سادگی نے اُس میں وہ چیز پیدا کر دی ہے جسے لکھنوی داستان سراؤں نے تعقید کہا ہے اور جسے دور کرنے کی طرف پوری توجہ صرف کی ہے۔ لیکن اس سلسلے میں دو باتیں پڑھنے والے کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ پہلی تو یہ ہے کہ اشک کی عبارت میں جو تعقید نظر آتی ہے وہ اُس دور کی نثر کی خصوصیت ہے اور حیدری اور میر امن کی عبارتیں بھی اس سے خالی نہیں اور دوسری یہ کہ اشک کی عبارت میں یہ تعقید حیدری اور میر امن سے کہیں زیادہ ہے۔ اور سچ پوچھئے تو اپنے آپ کو ایک خاص عہد کے اسلوب کی ان کمزوریوں سے بہت حد تک محفوظ کر لینا ہی میر امن کا وہ امتیاز ہے جس نے اُنہیں اپنے سب ہم عصروں میں برتری کا شرف دلوایا ہے۔

(۴) لکھنؤ والوں نے اس تعقید کو دور کر کے نثر کی سادگی کا کوئی ایسا معیار قائم کرنے کے بجائے جسے سہل ممتنع کہا جا سکتا تکلف اور تصنع کی راہ اختیار کی ہے۔ اُن کے بیان میں رنگینی، ادبیت و شعریت، اظہار علمیت اور روایتی تشبیہات، استعارات اور علامات

کی اتنی کثرت ہے کہ اُس سے قصے کا فطری انداز متاثر و مجروح ہوا ہے ۔ جن ٹکڑوں میں یہ فرق نمایاں ہوگئے ہیں اُن کا اعادہ شاید بے محل نہ ہو :

اشک والے نسخے کی عبارت

(۱) نامہ آغاز داستان امیر حمزہ نامدار کشورستاں عم رسول آخر الزماں اس طرح ہے کہ بیچ سر زمین ایران کے ملک مدائن میں ایک بادشاہ قباد کامران نامی اس قدر شجاع ، عادل ، رعیت پرور تھا کہ اس کے عمل میں ہر غریب و فقیر اپنے گھر میں غنی تھا ۔ ظلم اور جور کا اس شہر میں کہیں نام اور نشان نہ تھا ، مگر عدل اور انصاف کہ اُس کے دور میں تمام خلقت آسودہ و بے خطر تھی ۔ کسی کو کسی بات کا غم نہ تھا ۔ اُس کے عدل میں باگ بکری ایک گھاٹ پانی پیتے تھے ۔

(۲) اس بادشاہ کے پاس چالیس وزیر تھے جن کی شمیم عقل گلشن سلطنت کو ہمیشہ خوشبو رکھتی تھی ۔ ان وزیروں کے سوا سات سے حکیم اور رمال اور سات ہی سے ندیم صاحب کمال ،

لکھنوی نسخے کی عبارت

(۱) واقعہ نگاران رنگین تحریر و مورخان شیریں تقریر نوکنندگان افسانۂ کہن و یاد کنندگان دیرینہ سخن یوں بیان کرتے ہیں کہ سر زمین ایران جنت نشان میں ملک مدائن کا ایک شہنشاہ تھا ، قبادکامران نام ۔ رعیت پروری میں لا جواب اور عدالت کسری میں نظیر اُس کا نایاب ۔

(۲) اس بادشاہ جم جاہ کے چالیس وزیر با عقل و دانش صاحب تدبیر تھے اور سات سو حکیم کہ افلاطون و ارسطو اُن کے سامنے طفل دبستاں تھے ، سب کے سب عقل و کیاست و فہم و فراست میں یکتائے

چار سے پہلوان کرسی نشین، تین سے بادشاہ تاج دار دس لاکھ سوار، چالیس هزار غلام زریں کمر و زریں کلاہ مغرق بجواهر اس بادشاہ کی خدمت میں روز و شب حاضر رهتے تھے۔

جہاں تھے۔ هر ایک علوم حکمت و هندسه و رمل و جفر و نجوم میں جالینوس و اقلیدس و فیثاغورث کو خطاب کے لائق نه جانتا اور سات سو ندیم که علم ادب اور علم مجلس میں اُستاد اور چار هزار پہلوانان که اگر سام و نریمان و رستم و زال اُن کے روبرو آتے تو سپر عجز کی میدان پہلوانی میں پھینک کر حلقهٔ ساگردی گلے میں لٹکاتے۔ اور تین سو بادشاہ تاجدار که هر ایک بجائے خود کوس لمن الملک بجاتا تھا اُس کے باج گزار تھے، سر اطاعت خم کئے ہوئے تابعدار تھے۔ اور چالیس لاکھ سپاهی کینه خواہ اور چالیس دسته غلامان زریں کمر مرصع، مغرق بجواهر اُس بادشاہ کی مجلس رشک ارم، فردوس تزئین میں حاضر رها کرتے، خدمت گزاری میں چست و چالاک جاں نثاری کا دم بھرا کرتے۔

۳) دیکھا تو وهاں ایک (۳) ناگاہ ایک عمارت عالیشان
هو کا مکان ہے۔ کہیں سامنے سے نظر آئی مگر چار

اشک والے نسخے کی عبارت

کسی آدم کا اپنے سوا نام
نہیں ۔ از بسکہ وہاں کسی
وقت مبں عمارت تھی ۔
ٹوٹی پھوٹی حویلیوں کے
کچھ نشان باقی رہ گئے تھے۔
اُس میدان کی ٹھنڈی ٹھنڈی
ہوا جو اُس کو خوش آئی،
ایک درخت کے نیچے ٹہلنے
لگا اور جی میں کہا کہ
یہ مکان کئی برس سے ویران
پڑا ہے اور اب تابع ملک
القش وزیر کے ہے ۔ اُس
نے بھی آباد نہ کیا ۔ اگر
یہ بسے تو اس سے بہتر
مکان اور لب دریا نہ نکلے ۔
یہ تصور کرکے ایک بارہ
دری کا ٹوٹا دروازہ نھا
اُس میں جاکر اندر ایک
دالان کے دیکھا تو داھنی
طرف ایک کوٹھری ہے
لیکن دروازہ اینٹوں سے
چنا ہے ۔

لکھنوی نسخے کی عبارت

دیواری اُس کی گر گئی تھی ۔
کچھ جی میں جو آیا تو
ٹہلتے ٹہلتے اُس طرف بڑھا ۔
دیکھا کہ اکثر مکانات
مسمار ہوگئے ہیں ۔ دالان
ٹوٹے پڑے ہیں ، لیکن ایک
دالان قائم ہے ، مثل دل
عاشقاں پریشان سنسان اور
اُس دالان میں ایک کوٹھری
کا دروازہ اینٹوں سے تیغا
کیا صحیح و سالم ہے ۔

تکلف ، تصنع ، آورد اور خصوصاً مبالغہ کا رنگ لکھنوی نسخہ کے طرز کی ایسی خصوصیت ہے جو پڑھنے والے کو اپنی طرف متوجہ کئے بغیر نہیں رہتی ۔

(۵) اشک کی عبارت میں عموماً طوالت کو دخل ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اشک نے واقعات کے بیان اور کرداروں کی گفتگو میں کسی قسم کے تکلف سے کام

لینے کے بجائے بے تکلفی کی فضا قائم رکھنے کی کوشش کی ہے اور یہ بات خواہ مخواہ طوالت کا باعث بن گئی ہے ۔ لکھنوی نسخے میں بے جا طوالت کو ترک کرکے اُس میں موزونیت اور توازن پیدا کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی ہے ۔ موزونیت اور توازن پیدا کرنے کی اس ارادی کوشش نے عبارات میں ایجاز و اختصار پیدا کر دیا ہے ۔ لیکن چونکہ لکھنوی مولفین کا اصل مقصود عبارت کی موزونیت ، توازن اور آہنگ ہے اس لئے کہیں کہیں ایسا بھی ہوا ہے کہ اشک کے نسخے میں جہاں کہیں واقعات کو اختصار کے ساتھ روا روی میں بیان کیا گیا ہے وہاں لکھنوی نسخے میں طوالت اختیار کی گئی ہے کہ ایک مخصوص محل کا تقاضا یہی ہے ۔ یہ بات اُن موقعوں پر خصوصاً زیادہ نمایاں ہے جہاں رزم و بزم کے مرقعے پیش کئے گئے ہیں ۔ آگے انے والی مثالوں سے یہ بات واضح ہوگی کہ لکھنوی مولفین نے واقعہ نگاری اور مرقع کشی میں پورا زور قلم صرف کیا اور ان مرقعوں کو ادبی اور شاعرانہ خصوصیات کا حامل بنایا ہے ۔

(٦) اشک کے نسخے اور لکھنوی نسخے میں ایک نمایاں فرق یہ بھی ہے کہ اشک نے اپنی سادگیٔ بیان اور فطرت پسندی کے میلان کی بنا پر عموماً بات کہنے کا ایسا انداز اختیار کیا ہے جس میں پڑھنے والے کو عبارت میں جا بجا ربط و آہنگ کی کمی محسوس ہوتی ہے ۔ واقعات کے مرقعے دیکھ کر اور کرداروں کی گفتگو سن کر بہت سے موقعوں پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان میں کسی نہ کسی چیز کی کمی رہ گئی ہے ۔ فقروں ، جملوں اور عبارتوں میں جا بجا ایک ڈھیلا پن اور اُس کساؤ اور تناؤ کی کمی ہے جس کے بغیر عبارت میں ترنم اور نغمگی پیدا ہونی ناممکن ہے ۔ فن کار کی آخری نظر تصویروں کے رنگ کو پختگی کی جو دولت

لازوال بخشتی ھے اُس سے یہ عبارتیں اکثر خالی نظر
آتی ھیں ۔ لکھنؤ کے مولفین نے اس کمی کے پورا کرنے کی
طرف پوری توجہ صرف کی ھے اور واقعات کے مختلف اجزا
میں باھمی ربط پیدا کرنے کے علاوہ جملوں اور فقروں
میں الفاظ کے دروبست کو ھر جگہ درست کیا ھے ۔
اور یوں عبارت سڈول بھی ھوئی ھے اور سامعہ پر بھی
اُس کا خوشگوار اثر پڑتا ھے ۔ یہ مقصد کہیں محض
ایک دو لفظوں کے اضافے اور تغیر سے حاصل ھوگیا ھے
اور کہیں پوری عبارت کو نئے سرے سے ایک نئے
سانچے میں ڈھالنے کی ضرورت پیس آئی ھے، اور اس کا
نتیجہ یہ ھوا ھے کہ واقعات کے سیاق و سباق میں
بھی تبدیلی پیدا ھوگئی ھے ۔ آگے کی باتیں پیچھے اور
پیچھے کی باتیں آگے ھو گئی ھیں کہ کہانی پڑھنے
والے کے لئے قصے میں دلچسپی پیدا کرنے اور اس کی
افسانوی کشش اور تاثر بر قرار رکھنے کا یہی طریقہ تھا ۔

دونوں داستانوں کے اس فرق کی وضاحت کے لئے داستان کے
ابتدائی باب کے آخری حصے پر ایک نظر ڈالئے ۔ داستان کا یہ
ٹکڑا اُس واقعہ سے تعلق رکھتا ھے کہ خواجہ کو قتل کرکے
القش عمارت اور باغ کی تعمیر کی طرف متوجہ ھوا ۔ یہ ٹکڑا
اشک کی داستان میں اس طرح ھے :

.... خنجر سے اور ھاتھ سے لہو دھو کے اپنے گھوڑے پر
سوار ھو کے اُس طرف آیا اور کہا ”اس مکان میں ھمارے
واسطے ایک باغ تیار ھو اور جہاں وہ مال تھا اُس کے گرد
ایک چار دیواری سنگ مرمر کی بنے اور اُس کو پاٹ کر
ایک بنگلہ واسطے نشست کے مونگے کا بنے“۔ غرض ساتھ
اس حکم کے معمار جہاں تلک حاضر ھوئے اور راج، پیش
مزدور، سنگ تراش، بڑھئی، بیل دار، تبردار بلائے اور
مدد لگائی کہ جلد وہ باغ تیار ھو.........بعد کئی دن کے
جب وہ باغ تیار ھوا القش نے اُس کا نام باغ بیداد رکھا

لکھنؤ والے نسخے میں اس کی بے ربطی کو یوں دور کیا گیا ہے :

"........خنجر اور ہاتھ کا لہو دھویا ۔ دولت دو روزہ کے واسطے ایمان اپنا کھویا[1] ۔ پھر سوار ہو کر اپنے گھر گیا ۔ دل میں بہت خوش اور محظوظ ہوا ۔ دوسرے دن مع تزک سوار ہو کر پھر اس مکان میں پہنچا اور اُسے دیکھ بھال کر داروغہ کو حکم دیا کہ یہاں ہمارے واسطے ایک باغ تیار ہووے اور باغ کے گردا گرد چار دیواری سنگ مرمر کی بنے اور اُس دالان کو پاٹ کر ایک بنگلہ فیروزے کا ہماری نشست کے واسطے بنایا جائے ۔ اسباب گراں بہا نادر روزگار بہم پہنچا کے اس عمارت گردوں منزلت میں بھجوایا جائے ۔ حکم کی دیر تھی فی الفور داروغہ نے معمار ، مزدور ، سنگ تراش شہر سے بلا کر مدد جاری کی ۔ چند روز کے عرصہ مس چار دیواری مع باغ بنگلہ تیار ہوئی ۔ القس دیکھ کر مسرور ہوا نام اُس کا باغ بیداد رکھا.........."

لکھنوی نسخے کی عبارت میں بھی باتیں وہی کہی گئی ہیں جو اشک والے نسخے میں ہیں لیکن خط کشیدہ ٹکڑوں کے اضافے نے اس عبارت کو زیادہ مربوط، قرین قیاس اور قابل قبول بنا دیا ہے ۔ لیکن ان اضافوں کے ساتھ ساتھ لکھنوی نسخے کی عبارت میں بعض چیزیں کم بھی کر دی گئی ہیں ۔ مثلاً مکان کی مدد جاری کرنے کے لئے یہاں صرف معمار ، مزدور اور سنگ تراش بلائے گئے ہیں ۔ اشک نے اس کے مقابلے میں زیادہ اہتمام سے کام لیا ہے اور معمار ، مزدور اور سنگ تراش کے علاوہ راج ، بڑھئی ، بیلدار اور تبردار بھی مہیا کئے ہیں ۔ بظاہر اشک اس اہتمام میں حق بجانب معلوم ہوتے ہیں ۔ لکھنوی مولفین کے حق میں البتہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اُنھوں نے غیر ضروری تفصیلات سے احتراز ضروری جانا ہے ۔

(ہ) لکھنوی نسخے کی ایک اور خصوصیت جو اُسے اشک کے نسخے کے مقابلے میں نمایاں کرتی ہے یہ ہے کہ اس

کے مولفین نے تہذیبی اور مجلسی لوازم کی طرف خاص
توجہ کی ہے ۔ یہ بات کتاب کے دوسرے حصوں کو
پڑھ کر زیادہ وضاحت کے ساتھ سامنے آتی ہے لیکن اس
ابتدائی ٹکڑے میں بھی جسے ہم نے دونوں تالیفات کے
فرق کی صراحت کی بنیاد بنایا ہے اشارتاً موجود ہے ۔
مثلاً قباد کامران کے ندیموں کے لئے انہوں
نے ''علم ادب و علم مجلس'' کی صفات سے مزین ہونے
کی شرط لگائی ہے ۔ چنانچہ لکھنوی نسخے کے مطالعے
سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قصے کے کردار جب آپس میں
گفتگو کرتے ہیں تو برابر ان تہذیبی اور مجلسی
آداب اور حفظ مراتب کو ملحوظ رکھتے ہیں ۔

داستان کے تمہیدی حصوں کو پیش نظر رکھ کر اشک اور
لکھنوی مولفین کے اسلوب فکر اور انداز بیان کا فرق نمایاں کرنے میں
میں نے کسی قدر طول کو اس لئے دخل دیا ہے کہ داستان کے
باقی حصوں کا مطالعہ کرتے وقت یہ چیزیں خود بخود ابھرتی اور
نمایاں ہوتی رہیں اور پڑھنے والے اگر دونوں نسخوں کو تقابلی
نظر سے پڑھیں تو انہیں یہ اندازہ کرنے میں سہولت ہو کہ دونوں
داستانوں کے تقریباً سب حصے اسالیب کے اس فرق کے حامل ہیں اور
دونوں نسخے مصنفوں کے مخصوص ماحول اور ان کے مزاج کے علاوہ
ان مقاصد کی وضاحت اور ترجمانی کرتے ہیں جنہیں پیش نظر رکھ کر
ان کی ترتیب و تالیف ہوئی ہے ۔

میں نے تھوڑی دیر پہلے اشارتاً یہ بات کہی تھی کہ لکھنوی
مولفین کی کوشش ہر جگہ یہ رہی ہے کہ وہ واقعات بیان کرتے
وقت پڑھنے والوں کو ان کے اخلاقی پہلوؤں کی طرف ضرور
متوجہ کریں لیکن اس موقع پر اس خیال کی وضاحت کے لئے جو
مثال دی تھی اسے دیکھ کر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ القش کے
متعلق یہ کہنا کہ اس نے دولت دو روزہ کے لئے اپنا ایمان کھویا ایک
روا روی کی بات ہو سکتی ہے ۔ لیکن کتاب کے آئندہ حصے اس احتمال
کی تردید کرتے ہیں اس لئے کہ مولفین کے اس رجحان کا عکس ان

میں زیادہ یقین کے ساتھ موجود نظر آتا ہے ۔ میں اس جگہ صرف ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں ۔ یہ مثال قصے کے اُس تمہیدی حصے کے چند صفحوں بعد کی ہے جسے میں نے اب تک تجزیہ کے لئے منتخب کیا تھا ۔ قصہ اس تمہیدی حصے کے بعد یوں آگے چلتا ہے کہ خواجہ بخت جمال کے مرنے کے بعد جب اُن کے یہاں لڑکا پیدا ہوتا ہے تو خواجہ کی وصیت کے مطابق اُس کا نام بزر جمہر رکھا جاتا ہے ۔ بزرجمہر بڑا ہو کر اپنے باپ کے علم میں مہارت حاصل کرتا اور یہ بات دریافت کر لیتا ہے کہ القس نے اُسے قتل کیا ہے ۔ اس دوران میں القش بادشاہ قباد کو اپنے باغ میں دعوت دیتا ہے اور بڑے اہتمام سے محفل جشن ترتیب دیتا ہے ۔ پھر رفتہ رفتہ اُس کے مزاج میں زیادہ دخیل ہوتا جاتا ہے ۔ القس بزر جمہر کو اپنی راہ کا کانٹا سمجھ کر اُسے گرفتار کرتا اور اس کے قتل کا حکم دیتا ہے ۔ لیکن مشیت اُسے محفوظ رکھتی ہے ۔ اسی زمانے میں بادشاہ ایک خواب دیکھتا ہے اور سب نجومی اور رمال اُس کی تعبیر بتانے میں عاجز رہتے ہیں ۔ اس موقعے پر القش کو بزر جمہر کا خیال آتا ہے اور وہ اُسے تلاش کر کے بادشاہ سے اُس کا ذکر کرتا ہے ۔ چنانچہ بادشاہ بزر جمہر کو اپنے دربار میں طلب کرتا ہے ۔ قصے کے اس حصے کو اشک نے 'داستان پہلی' قرار دیا ہے اور اُس کا یہ عنوان قائم کیا ہے :

''بزرچمہر کے القش پر سوار ہو کر بادشاہ کے پاس جانے اور اپنے باپ کا عوض خون لینے میں''

اس عنوان سے پہلے اشک نے صرف ایک عنوان قائم کیا ہے اور اُس کے الفاظ یہ ہیں :

''بیان تولد ہونا بزر چمہر کا اور جاماس نامی سے احوال دریافت کرنا اپنے باپ کے مارے جانے کا''

القش اور بزر چمہر کے حالات اسی عنوان کے تحت دو ضمنی سرخیوں کے بعد بیان کردئے گئے ہیں ۔ اس کے برخلاف لکھنوی مولفین نے اُس حصے تک پہنچنے سے پہلے ، جس کا ذکر میں اب کرنے والا ہوں واقعات کو تین حصوں میں الگ الگ عنوان قائم کرکے بیان

کیا ہے اور یوں قصے میں ربط و تسلسل قائم رکھنے کے میلان کی وضاحت کی ہے ۔ یہ تینوں عنوان لکھنوی نسخے میں ترتیب وار یوں ہیں :

(۱) داستان بزر جمہر کے پیدا ہونے کی اور مضمون کتاب ہویدا ہونے کی ۔

(۲) داستان مدعو ہونا بادشاہ کا القنس کے باغ بیداد ہیں اور جشن ہونا اُس بوستان مینو سواد میں ۔

(۳) گرفتار کرنا ملک القس وزیر کا بزر جمہر بے تقصیر کو اور رہا ہونا اُس کا پنجه القنس سے اور جمع کرنا بادشاہ کا وزرائے باندبیر کو اور پوچھنا تعبیر کا اور دینا تعزیز کا ۔

ان تینوں عنوانوں میں قصے کے واقعاتی پہلو کو جو اہمیت دی گئی ہے اُس سے قطع نظر عنوانوں کی ادبی معنویت اور خصوصاً قافیہ کا التزام خاص طور سے قابل توجہ ہے ، اس لئے کہ ان چیزوں کو دیکھ کر اس باب کا اندازہ ہوتا ہے کہ لکھنوی مولفین نے چھوٹی سے چھوٹی چیز کو اپنی پوری توجہ کا مرکز بنایا ہے اور نظر ثانی میں پوری کاوش سے کام لیا ہے ۔ یہی بات اُس عنوان اور اُس عنوان کے تحت آنے والی ابتدائی عبارت سے بھی نمایاں ہوگی جس طرف میں ابھی اشارہ کر چکا ہوں ۔

اس طویل گریز کے بعد اگر پھر اُس ٹکڑے کی طرف رجوع کریں جس کا عنوان اشک کے نسخے میں ''داستان پہلی'' ہے تو سب سے پہلے لکھنوی نسخے کے عنوان پر نظر پڑتی ہے اور اشک کے اور اس نسخے کے عنوان میں بڑا فرق نظر آتا ہے ۔ لکھنوی نسخے میں داستان کے اس ٹکڑے کا عنوان ان الفاظ کو بنایا گیا ہے :

''بیان کرنا بزر جمہر کا بادشاہ کے خواب کو وقت خاص میں اور قتل ہونا القس وزیر کا اُس کے باپ کے قصاص میں''

اس عنوان میں بھی وہی اہتمام اور ادبی لطف موجود ہے جو اُس سے پہلے کے عنوانوں میں ہماری نظر سے گزر چکا ہے ۔ لیکن

ہمارا مقصود اصل میں وہ عبارت ہے جو اس عنوان کے نیچے آتی ہے ، اس لئے کہ اُسی کو پڑھ کر وہ نکتہ سامنے آئے گا جس کی وضاحت کے لئے میں نے داستان کے اس ٹکڑے کا انتخاب کیا تھا ۔

آئیے ، اب اشک اور لکھنوی نسخے کی ان عبارتوں کو ایک دوسرے کے مقابل رکھ کر دونوں کی امتیازی خصوصیات کا موازنہ کریں ۔ پہلے اشک کی عبارت دیکھئے :

" جوہریان بازار سخن اس داستان کے کہنے کا یوں بیان کرتے ہیں کہ جس وقت القنس حضور میں فجر کو بادشاہ کی گیا ، عرض کی کہ غلام کا ایک شاگرد ہے وہ اس خواب کو کہا چاہتا ہے ۔ اور غلام نے کبھی کا کہہ دیا ہوتا ، پر مجھ کو ان سب حکیموں کا امتحان لینا تھا ۔ بادشاہ نہایت خوش ہوا اور فرمایا لوگ جاویں اور اُس کو لے آویں"

اس سیدھی سادی بات پر لکھنوی مولفین نے کئی رنگ چڑھائے ہیں :

"دنیا دار مکافات ہے ۔ بدلہ اکثر تو اسی عالم میں ہو جاتا ہے ۔ اور اگر اتفاقات وقت سے یہاں پایۂ توقف میں رہا تو حشر پر معاملہ اُس کا ہے ۔ انسان کو لازم ہے کہ مآل کار پر نظر کرے اور دنیاوی دولت دو روزہ کی محبت میں دنیا کی رسوائی اور عقبیٰ کی عقوبت سر پر نہ لے ۔ مصداق اس مقال کا اور مقتضی اس حال کا قصہ القنس بد کردار ، ظالم نا ہنجار کا ہے کہ اپنے پاداش عمل کو پہنچا ۔ محسن کشی کا ثمرہ ملا ۔ واقفان قصص باستانی و دانندگان واقعات زمانی خواب شب مداد کو زبان خامہ پر لاتے ہیں ، صبح قرطاس میں تعبیر اس کی اس طرح فرماتے ہیں کہ دوسرے دن جو القنس بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا آموختہ بزر چمہر کا زبان پر لایا ۔ حکم ہوا کہ اُس کو حاضر کریں ، جلد بارگاہ سلطانی میں لائیں"

جو بات اشک نے ذرا پھیلا کر چار پانچ سطروں میں کہی ہے اُسے لکھنوی نسخے میں سمیٹ کر صرف دو سطروں میں بیان کر دیا گیا ہے۔ البتہ اس بات سے پہلے جو کئی سطر کی تمہید ہے وہ کئی حیثیتوں سے قابل توجہ ہے۔ ان میں سے بعض باتیں تو ایسی ہیں جن کا ذکر کسی نہ کسی ضمن میں اس سے پہلے بھی آ چکا ہے، یعنی یہ کہ لکھنوی مولفین سیدھی سادی باتوں کے بیان میں بھی ادبی اور شاعرانہ انداز اختیار کرتے ہیں اور اس ادبی اور شاعرانہ انداز میں قافیے اور سجع کے التزام کے علاوہ الفاظ کے موزوں انتخاب کا خاصا اہتمام کرتے ہیں۔ اس انتخاب میں اُن کی توجہ عبارت کے واقعاتی سیاق و سباق کے ساتھ ایک مخصوص محل کے معنوی مطالبات کی طرف بھی ہوتی ہے اور ظاہری مناسبت اور معنوی مطابقت میں ہم آہنگی پیدا کرنے کو ادبی بیان کی لازمی شرط سمجھ کر اختیار کرتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر الفاظ کے انتخاب اور حسن ترتیب میں عموماً وہ اس بات کا بھی لحاظ کرتے کہ اس ادبی عبارت آرائی میں کوئی نہ کوئی اشارہ ایسا موجود ہو جو آنے والے واقعات کی طرف رہنمائی کرے۔ اس طرح کا اشارہ عموماً پڑھنے والے کے لئے ذہنی انبساط کا سبب بنتا ہے۔ مثلاً اوپر والی عبارت میں یہ جملے کہ ''واقفان قصص پاستانی و دانندگان واقعات زمانی خواب شب مداد کو زبان خامہ پر لاتے ہیں، صبح قرطاس میں تعبیر اس کی اس طرح فرماتے ہیں'' میں خواب اور تعبیر کے الفاظ اس آنے والے واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اس باب میں بزرچمہر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر اُسے اُس کے خواب کی تعبیر بتاتا ہے۔

ان ضمنی باتوں سے قطع نظر ان ابتدائی جملوں کو لکھنوی مولفین کے اس میلان کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے کہ وہ ہر واقعہ میں کوئی نہ کوئی اخلاقی پہلو تلاش کرتے ہیں تو اشک کے نسخے کے مقابلے میں لکھنوی نسخے کا امتیاز واضح طور پر سامنے آ جاتا ہے۔

اشک نے داستان کا آغاز صرف یہ کہہ کر کر دیا ہے کہ ''جوہریان بازار سخن اس داستان کے کہنے کا یوں بیان کرتے ہیں''۔ اس کے برخلاف لکھنوی نسخے کی تمہید ایک مختصر سا وعظ ہے۔ ''دنیا دار مکافات ہے'' سے شروع ہوکر ''عقبیٰ کی عقوبت

سر پر نہ لے،، تک پڑھنے والوں پر نہ صرف ایک اخلاقی نکتے کی صراحت کی گئی ہے بلکہ اُنھیں براہ راست مخاطب کرکے اُنھیں اس بات کی تلقین کی گئی ہے کہ انسان دنیا کی دولت دو روزہ کے عوض دنیا کی رسوائی اور عقبیٰ کی عقوبت مول نہ لے۔ لکھنوی مولفین کا یہ اخلاقی میلان برابر قصے کے متن میں بھی ظاہر ہوتا رہتا ہے، خصوصاً ہر نئے عنوان کی تمہید میں یہ زیادہ واضح اور نمایاں ہوتا ہے۔ کتاب کے چند عنوانات اور اُن کی تمہیدوں پر اسی خاص مقصد سے نظر ڈالئے:

(۱) فلک شعبدہ باز انسان کو کس کس گردش میں لاتا ہے۔ زمانۂ نیرنگ ساز آدمی کو طرح طرح کی نیرنگیاں دکھاتا ہے۔ کبھی گدا کو بادشاہ بنا دیا، کبھی سلطنت کی سلطنت کو ایک دم میں مٹا دیا۔ جن کو نان خشک میسر نہ آتی تھی وہ لنگر بانٹتے ہیں، خزانے لٹاتے ہیں، جو ایک ایک کوڑی کو محتاج تھے وہ صاحب گنج و مال ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ.......[۱]

عشق ہے تازہ کار تازہ خیال ہر جگہ اس کی اک نئی ہے چال
کہیں آنسو کی یہ سرایت ہے کہیں یہ خوں چکاں حکایت ہے
گہ نمک اس کو داغ کا پایا گہ پتنگا چراغ کا پایا
کہیں طالب ہوا کہیں مطلوب اس کی باتیں غرض ہیں دونوں خوب[۲]

(۳) اُسے فضل کرتے نہیں لگتی بار نہ ہو اُس سے مایوس اُمیدوار
جامع المتفرقین کی قدرت کا تماشا دیکھنا کہ جنگل میں نیا گل کھلا[۳]۔

(۴) زمانے کی دو رنگی مشہور ہے شعبدہ باز کی نیرنگی ظاہر ظہور ہے۔ کہیں عین شادی میں سامان غم مہیا ہوتا ہے، کہیں کمال یاس میں چہرۂ امید جلوہ نما ہوتا ہے۔ چنانچہ بمصداق اس کے یہ داستان ہے[۴]۔

---

۱ - آغاز داستان صفحہ ۲۰ ۲ - آغاز داستان صفحہ ۹۹ -
۳ - آغاز داستان صفحہ ۱۵۵ ۴ - آغاز داستان صفحہ ۱۶۹

یہ تمہیدیں پڑھنے والے کے ذہن کو کسی نہ کسی اخلاقی نکتہ کی طرف متوجہ کرکے اُسے خیر کا راستہ دکھاتی ہیں۔ یوں اشک کی داستان میں بھی کہیں داستان کے درمیان میں اس طرح کی اخلاقی باتیں کہی گئی ہیں لیکن اول تو وہ بہت کم ہیں دوسرے اُن کا انداز عموماً بڑا سرسری ہے۔ لکھنوی نسخے کی عبارتوں کو پڑھ کر صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مولفین نے اخلاقی نکات کی وضاحت میں ہر جگہ خاصا اہتمام برتا ہے اور اس اہتمام کا ایک نمایاں وصف یہ ہے کہ کہنے والوں نے جو بات کہی ہے اُس میں اپنے ادبی اور شاعرانہ اُسلوب اور لفظی و معنوی مناسبتوں اور رعایتوں کو ترک نہیں کیا۔ اپنے خیال کے اظہار کے لئے، ذہن پر زور ڈال کر موزوں سے موزوں لفظ فراہم کئے ہیں اور اُنہیں اپنے مقصد کا پیامی بنایا ہے۔ کہیں کہیں نثر کی جگہ اشعار کو بھی اظہار خیال کا وسیلہ بنانے کا میلان بھی اسی اہتمام اور انہماک کی نشانی ہے۔

ادبی اور شاعرانہ لطف اور حسن بیان پیدا کرنے میں لکھنوی مولفین نے عموماً جس اہتمام اور انہماک کو دخل دیا ہے وہ اُن کی داستان گوئی کی امتیازی خصوصیت ہے۔ اور یہی امتیازی خصوصیت باغ و بہار اور فسانۂ عجائب اور بوستان خیال اور داستان امیر حمزہ[1] کو ایک دوسرے سے الگ کرتی اور اُن پر ایک مخصوص مزاج اور ماحول کا نقش ثبت کرتی ہے۔ اشک کی داستان امیر حمزہ اور اُس کے لکھنوی نسخے کا مقابلہ کرتے وقت بھی پڑھنے والے کو ماحول اور مزاج کے اس فرق کا اندازہ ہوتا ہے اور وہ دونوں نسخوں کے ایک سرسری مطالعے کے بعد بھی یہ بات پوری طرح محسوس کر لیتا ہے کہ سادگی اور بے تکلفی ایک کا اور رنگینی اور تکلف دوسرے کا رنگ خاص ہے اور یہ رنگ خاص اتفاقی نہیں بلکہ دو مختلف ماحولوں کے ادبی اور معاشرتی مزاج کا عکس اور پرتو ہے۔ چنانچہ اب تک جو مثالیں دونوں نسخوں کے مختلف اجزا کی پڑھنے والوں کے سامنے آئیں اُن پر مزاج

---

۱ - اس جگہ داستان امیر حمزہ سے میری مراد ۴۶ جلدوں کے اُس سلسلہ سے ہے جس کا سرسری ذکر اس مضمون کے شروع میں آ چکا ہے۔

کا یہ امتیازی نقش ثبت دکھائی دیتا ھے اور پڑھنے والا ان امتیاری نقوش کو ذھن اور دل کے گوشوں مبں پوری طرح جا گزیں کرنے سے پہلے لکھنوی مولفین کی کم از کم اس بات کا قائل ضرور ھو جاتا ھے کہ اُنھوں نے نظر ثانی کرتے وقت بھی اُسلوب کی اُن روایتوں کو برتنے مس کسی طرح کی کوتاھی سے کام نہس لیا جو اُن کے ماحول اور مزاج کا جزو بن گئی ھیں - فنی نقطۂ نظر سے یہ چیز بے حد قابل قدر ھے کہ مصنف، مولف (یا فن کار) اپنے فن کے معاملے مس اس حد تک مخلص ھو کہ اس کی خصوصیات کو برقرار رکھنے میں پوری ذھنی کاوش، قوت، توجہ اور انہماک سے کام لے - فکر، تخیل اور بیان کے نقطۂ نظر سے لکھنوی مولفین نے اس فنی امتحان کا مقابلہ کس طرح کیا ھے اس کے لئے میں قصے کے دو تین ٹکڑے پیش کرتا ھوں -

اشک والا نسخہ[1]	لکھنوی نسخہ[2]
(۱) اُس دن سے تمام عورتوں کا اعتبار بادساہ کے نزدیک سے اُٹھ گیا تھا - بلکہ اُن کی صورت دیکھنی موقوف کی اور کہا کہ اب اُن کا منہ کبھی نہ دیکھوں گا - لیکن ایک عورت تھی دل آرام نامی، چنگ کے بجانے میں کمال رکھنی تھی اور فصاحت بادشاہ کو اس کی بہت بھاتی تھی[3]	(۱) مورخان نے تحقیق سے لکھا ھے کہ ساھزادی فاجرہ مقتولہ کی اس حرکت کے سبب سے کل عورات کا اعتبار جاتا رھا تھا، سوائے دل آرام کے کہ قطع نظر حسن و عصمت و عفت کے چنگ نوازی میں کمال مشاق تھی، فن موسیقی میں نہایت طاق تھی، بادشاہ کے رو برو اور کوئی عورت نہ آنے پاتی تھی[4]
(۲) ناگہاں بعد کئی دن کے بادشاہ واسطے شکار کے	(۲) تفریحاً بادشاہ ایک روز بتقریب شکار سوار ھوا -

---

۱ - مطبوعہ میور پریس دھلی ۱۸۸۲ء

۲ - مطبوعہ نولکشور پریس، لکھنؤ دسمبر ۱۹۳۹ء

۳ - صفحہ ۱۵ ۴ - صفحہ ۲۰

اشک والا نسخہ

طرف ایک صحرا کے گئے۔ دل آرام اور خواجہ بزرجمہر اور بھی کئی سردار ہمراہ تھے[1]۔

(۳) پہاڑ کی ترائی میں ایک میدان تھا۔ سبز گھاس سے کوسوں تک ایک تختہ زمرد کا معلوم ہوتا تھا۔ وہ رنگ اس پہاڑ کا اور اس کے اوپر سے چادریں پانی کی چھوٹتی ہوئیں ایک لطف دیتی تھیں اور وہ جو پہاڑ کے دامن سے دریا نکلا تھا اس کے کنارے کنارے دونوں طرف ہرے ہرے دھانوں کے کھیت کا عالم جس طرح الماس پر تحریر زمرد کی ہوتی ہے۔ اس دریا کے کنارے دونوں طرف پختہ گھاٹ سنگ مرمر کے بہت دور تک بنے ہوئے تھے۔ وہاں بجرے اور کشتیاں بادشاہ کی سواری کے

لکھنوی نسخہ

باز، جرے، بہری، لگڑ، جگڑ، بٹیرا، گوھی، باہ، شکرہ، داسا، ترمتی، خج، دھونی، سینہ باز، شکاری کتے، چیتے، سیاہ گوش، قرول وغیرہ کا غول کا غول رکاب ساھی میں چلا[2]

(۳) دارالسطنت کے قریب ایک پہاڑ تھا۔ نہایت بلند، آسمان سے پیوند، کمال دل کشا، عجب فرح افزا باغبان قدرت نے گل ہائے بو قلموں موقع موقع پر لگائے۔ کدیور کاملہ نے اشجار گوناگوں بانواع مختلفہ اس کوہ میں اگائے۔ کسی طرف دراز قامت سر بفلک اٹھائے تھے۔ کسی جانب درخت بیل دار خاکساری سے زمین پر بچھے جاتے تھے۔ اس کے دامن میں ایک صید گاہ تھی مفرح، از بس پر فضا، بوٹا پتا گھاس کا رشک افزا، لالہ و گل جدول آب رواں، چشمہ ہر ایک چشمہ حیواں،

---

۱ - صفحہ ۱۵

۲ - صفحہ ۲۰

واسطے رہتے تھے۔ رنگ برنگ کی کشتیاں اور بجرے اور نواڑی ، فیل جڑھی، گھڑ چڑھی ، سنگ چڑھی ، مور پنکھیاں ، لچکے ، پھولئے ، جل کر، پنواڑیں، پانی میں سب پر عجیب طرح کا عالم تھا[1] ۔

صبا گلزار درختوں کی خوشبو سے رشک نافۂ تاتاری تھی ۔ نکہت خوش آیند غنچہ ہائے شگفتہ غیرت دہ شمیم باد بہاری تھی ۔ درختوں پر فیض ترشح اور موافقت ہوا سے جوبن تھا ۔ گلہائے خود رو سے وہ مقام نمونۂ گلشن تھا ۔ شکار کی وہ افراط کہ شمار میں نہ آ سکے ۔ جانور دیکھ کر گھبرا جائیں نظروں میں نہ سما سکے ۔ قاز ، کلنگ ، سرخاب ، مرغابی ، سارس ، آسن ہری، فرفرے ، قراقر ، لوھار ، سارنگ ، تیگن ، ڈھینک ، لک لک سون، شیرازی ، کاواک ، بانوا وغیرہ بے شمار ۔ علاوہ اس کے ایک طرف میدان میں ہرن ، چیتل ، پاڑھے ، بارہ سنگے ، نستیں، گھوڑا اور نیل گاؤ ، چکارے قطار در قطار ۔ چرند و پرند کی کثرت تھی ۔ اور کوسوں تک گیاہ سبز سے فرش زمردیں کی صورت تھی اور پانی کی چادروں کی نہریں جاری تھیں ۔

---

۱ - صفحات ۱۵ و ۱۶

لکھنوی نسخه

کہیں چشمے ، کہیں بہتی
ہوئی ندیاں ، چھوٹی چھوٹی
پیاری پیاری تھیں ۔ ایک
طرف ایک دریا موجزن
تھا ، کوسوں کا پاٹ ۔
پانی صاف شفاف ، مثل دل
پاکاں روشن تھا ۔ کناروں
پر آس کے هرے هرے
دھانوں کے کھیت لہلہا رہے
تھے ۔ بعض بعض مقام پر
گل نیلوفر مزہ دکھا
رہے تھے[1]۔

اوپر کی عبارتوں میں سے داھنی طرف کی تینوں عبارتیں اشک کی هیں اور بائیں طرف والی لکھنوی نسخے کی ۔ دونوں نسخوں کی یہ تینوں عبارتیں قصے کے ایک هی موقع اور محل سے اخذ کی گئی هیں اور ایک دوسرے کے مقابل والی عبارتوں میں یہ بات مشترک ہے کہ اُن کا موضوع ایک هی ہے ۔ یعنی ایک میں دل آرام کی چنگ نوازی کا ، دوسری میں بادشاہ کے شکار کو جانے کا اور تیسری میں شکار گاہ کا ذکر اور بیان هوا ہے ۔ لیکن موضوع کے اس اشتراک کے باوجود اشک کی تینوں عبارتیں اُسلوب اور انداز کے اعتبار سے لکھنوی مولفین کی عبارتوں سے بالکل مختلف هیں ۔ یہ بات البتہ ہے کہ اشک کی تینوں عبارتیں اُنہیں خصوصیات کی حامل هیں جو هم اس سے پہلے اُن کی دوسری عبارتوں میں دیکھ چکے هیں ۔ یعنی اشک نے هر بات سادگی اور بے تکلفی سے بیان کی ہے اور یہ سادگی اور بے تکلفی کبھی کبھی عبارت میں تعقید اور بے ربطی اور بے ڈھنگے پن کا سبب بن گئی ہے ، یہاں تک کہ عبارتوں کے وہ حصے بھی جن میں اشک نے اپنے بیان میں ادبیت اور شعریت پیدا کرنے کی کوشش کی

---

۱ ۔ صفحات ۲۰ و ۲۱

ہے تعقید اور بے ربطی کے عیوب سے خالی نہیں ۔ اشک کی نظر صرف قصے پر ہے ۔ اس کے علاوہ وہ ہر چیز سے بے نیاز ہیں ۔ انہوں نے جزئیات و تفصیلات کے بیان میں بھی کسی خاص اہتمام کی ضرورت نہیں سمجھی ۔ بس جو چیز سامنے آئی یا جس کی طرف بغیر زیادہ کاوش کے ذہن منتقل ہوا اُسے عبارت میں شامل کرلیا ۔ اس چیز کی پروا نہیں کی کہ وہ اپنے واقعات کو ضروری مناسبات و متعلقات کے اعتبار سے مکمل کریں ۔

اس کے مقابلے میں لکھنوی نسخے میں جہاں ایک طرف عبارت کی چستی اور عبارت آرائی کے ساتھ ساتھ قافیہ پیمائی اور سجع کا التزام ہے دوسری طرف اُس میں لفظی اور معنوی متعلقات و مناسبات کے معاملے میں بھی پورا اہتمام برتا گیا ہے ۔ اور ان مشترک خصوصیتوں کے علاوہ عبارتوں میں کچھ ایسی چیزیں بھی نمایاں ہیں جو اُن عبارتوں میں بہت کم تھیں جو اب تک مختلف باتوں کی وضاحت کے لئے پیش کی گئیں ۔

پہلی عبارت میں دل آرام کی چنگ نوازی کے کمال کے علاوہ فن موسیقی میں اُس کے کمال کا تذکرہ اور اس کے ساتھ اُس کے حسن، عصمت و عفت کے محاسن کی تخصیص نے دل آرام کی کشش کے لئے جو جواز پیدا کیا ہے ، وہ ذہنی کاوش اور غور و فکر کے بغیر ممکن نہیں تھا ۔

دوسری عبارت میں ''ناگہاں،، کے بجائے ''تفریحاً،، کی ترمیم اور شکاری جانوروں کی تفصیل بھی اُسی توجہ اور انہماک ، دقت نظر اور فنی خلوص کا نتیجہ ہے جس کا اظہار لکھنوی نسخے میں قدم قدم پر ہوتا ہے ۔

تیسری عبارت میں بہ یک وقت کئی باتیں ہیں ۔ اشک نے جس منظر کی تصویر کشی میں تھوڑی سی بے ربط شاعری سے کام لیا ہے لکھنوی نسخے میں اُس کی طرف بے حد توجہ صرف کی گئی ہے ۔ جو منظر اشک کی عبارت کا موضوع ہے اُسے لکھنوی نسخے میں محض ضمنی اور ثانوی حیثیت دی گئی ہے ۔ اُس سے پہلے ایک طویل تمہید ہے ۔

اس طویل تمہید کو مضامین کے اعتبار سے کئی الگ الگ حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے - پہلا ٹکڑا اُس پہاڑ سے متعلق ہے جس کے ذکر سے اشک نے منظر نگاری کی ابتدا کی ہے - اشک نے یہ کہنے پر اکتفا کی ہے کہ ''پہاڑ کی ترائی میں ایک میدان تھا'' - لکھنوی نسخے میں ''دارالسلطنت کے قریب ایک پہاڑ تھا'' کا ٹکڑا شامل کرکے منظر کو حقیقی رنگ دینے کی کوشش کی گئی ہے اور پڑھنے والے کے سامنے منظر اور محل کا ایک واضح تصور پیش کیا گیا ہے - اس تمہید کے بعد لکھنوی نسخے کے عام اُسلوب کے مطابق پہاڑ کی کچھ صفات بیان کی گئی ہیں اور ان صفات کے بیان میں تصور آفرینی کے علاوہ عبارت آرائی کا پورا زور اور رنگینی ہے - قافیے اور سجع کے التزام میں بھی کوئی کمی نہیں - پہاڑ کی صفت میں جو ٹکڑا داخل عبارت کیا گیا ہے اُس پر ایک نظر پھر ڈال لیجئے :

''ایک پہاڑ تھا - نہایت بلند ، آسماں سے پیوند - کمال دلکشا، عجب فرح افزا - باغبان قدرت نے گل ہائے بوقلموں موقع موقع پر لگائے - کدہور صفت کاملہ نے اشجار گوناگوں بانواع مختلفہ اُس کوہ میں اُگائے - کسی طرف دراز قامت سر بفلک اُٹھائے تھے - کسی جانب درخت بیل دار خاکساری سے زمین پر بچھے جاتے تھے''-

اس کے بعد میدان کا حال شروع ہوتا ہے - وہ میدان جس کی منظر کشی اشک نے ان الفاظ میں کی ہے کہ '' ایک میدان تھا - سبز گھاس سے کوسوں تک تختہ زمرد کا معلوم ہوتا تھا''- لکھنوی نسخے میں ایک شاعرانہ مرقع بن کر پڑھنے والے کی نظر میں کھبتا ہے :

''اُس کے دامن میں ایک صید گاہ تھی مفرح، از بس پر فضا ، بوٹا پتا گھاس کا رشک افزا - لالۂ و گل جدول آب رواں ، چشمہ ہر ایک چشمۂ حیواں ، صبا گلزار درختوں کی خوشبو سے رشک نافۂ تاتاری تھی ، نکہت خوش آیند غنچہ ہائے شگفتہ غیرت دہ شمیم باد بہاری تھی - درختوں پر فیض ترشح اور موافقت ہوا سے جوبن تھا - گل ہائے خود رو سے وہ مقام نمونۂ گلشن تھا''

پہاڑ اور صید گاہ کے ذکر میں لکھنوی مؤلفین نے جو زور طبع صرف کیا ہے وہ الفاظ کی موزونیت ، فقروں کی چستی اور قافیوں کے ربط و آہنگ سے ظاہر ہے ۔ اور ان چیزوں کو دیکھ کر پڑھنے والا مؤلفین کے ذہن کی کاوش اور تخیل کی رسائی کی داد دئے بغیر نہیں رہتا ، لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی محسوس کرتا ہے کہ یہ ساری شاعری تصور کو اصلیت اور حقیقت سے دور لے جاتی ہے اور عبارت کو اس قدر دشوار بنا دیتی ہے کہ عام پڑھنے والا اس سے کوئی معنوی لطف و انبساط حاصل نہیں کرتا ۔ وہ ''اشجار گوناگوں بانواع مختلفہ'' اور ''نکہت خوش آیند غنجہ ہائے شگفتہ'' کی پر تکلف اور پر تصنع ترکیبوں میں الجھ کر رہ جاتا ہے ۔ بلکہ ''کدیور صفت کاملہ'' اور ''قبض برسح'' کے ٹکڑوں سے لطف اندوز ہونے کے لئے تو شاید لغت سے رجوع کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے ۔

اس سے اگلے ٹکڑے میں سکار کی افراط کے ساتھ جن بے شمار چرند و پرند کے نام لکھے گئے ہیں اُن میں معلومات کا ایک خزانہ پوشیدہ ہے اور لکھنوی نسخے کے علمی اور معلوماتی انداز کی طرف اشارہ کرتا ہے ۔

آخری ٹکڑے میں وہی منظر پڑھنے والے کے سامنے آتا ہے جو اشک والے نسخے میں کھینچا گیا ہے ۔ اس ٹکڑے میں لکھنوی مؤلفین نے اشک کے بنائے ہوئے مرقع کو ذرا بنا سنوار کر ایک دلکش اور قابل قبول صورت دی ہے ۔ اس ٹکڑے میں لفظی تکلفات سے احتراز کرکے سادہ منظر نگاری کو مطمح نظر بنایا گیا ہے اس لئے پڑھنے والا یہ منظر جیسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے ۔

اشک کے نسخے کی عبارت کے مقابلے میں جب لکھنوی نسخے کی عبارت کا تجزیہ کیا جاتا ہے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ لکھنوی مؤلفین نے اپنی کتاب میں بہت سے موقعوں پر ربط و آہنگ پیدا کرنے اور عبارت کو ادبی اور شاعرانہ بنانے کی غرض سے اتنے اضافے کئے ہیں کہ یہ نسخہ بجائے خود ایک الگ تصنیف و تالیف معلوم ہونے لگتا ہے ۔ ایسے موقعوں پر اصل اور نقل (یا نظر ثانی) میں اتنا فرق پیدا ہو گیا ہے کہ دونوں میں کسی طرح کی مطابقت اور

یک رنگی تلاش کرنے میں دشواری ہوتی ہے ۔ اسی طرح کے اضافوں نے اس نسخے کی ضخامت اصل سے ڈیوڑھی کر دی ہے ۔

ہماری داستانوں میں داستان گویوں نے افسانوی دلچسپی کے علاوہ جن چیزوں سے پڑھنے والوں کو اپنا گرویدہ بنایا ہے اُن میں رزم و بزم کے مضامین، عشق و محبت کے مناظر اور ظرافت و مزاح کے عناصر کی جگہ عموماً نمایاں ہوتی ہے ۔ یہ باتیں ہمارے سب اچھے داستان گویوں نے محسوس کی ہیں اور اپنے اپنے مخصوص ماحول اور معاشرتی مزاج اور ناظر کی پسند کے مطابق ان چیزوں سے اپنی کہانیوں کی دلکشی بڑھائی ہے ۔ اشک کی داستان امیر حمزہ میں بھی انہیں عناصر کو دلچسپی کی بنیاد تصور کیا گیا ہے لیکن اشک اور لکھنوی مؤلفین کے اُسلوب فکر، طرز تخیل اور انداز بیان میں جس طرح ہر موقعے پر سادگی و رنگینی، بے ساختگی اور تکلف، فنی بے نیازی اور انہماک و توجہ کے عناصر کا غلبہ ہے اسی طرح رزم و بزم کی مرقع کشی، عشق و محبت کے بیان اور ظرافت و مزاح کے صرف میں بھی دونوں کے مزاج اور مذاق کا فرق نمایاں طور پر ظاہر ہوتا ہے اور بعض اوقات اس فرق کا اظہار اتنی شدت سے ہوتا ہے کہ لکھنوی نسخہ ایک ہی تالیف کا نقش ثانی معلوم ہونے کے بجائے ایک علیحدہ اور منفرد تصنیف معلوم ہوتی ہے ۔ اس بات کی وضاحت کے لئے چند مثالوں پر نظر ڈال لیجئے ۔ سب سے پہلے دو ایسے مواقع دیکھئے جن میں دونوں مولفین نے رزم گاہ کے مناظر کی تصویر کھینچی ہے ۔ پہلا موقع سہیل یمنی اور امیر کی جنگ کا ہے ۔ اشک نے داستان کے اس ٹکڑے کی تفصیل یوں بیان کی ہے :

''تمام رات دونوں لشکروں میں طیاری جنگ کی رہی ۔ امیر اُس شب یاروں کو ہمراہ لے کر شب بیدار رہے ۔ عمر عیار جام شراب کا ہاتھ میں لے کر لگا امیر کو پلانے ۔ اُس وقت شب مہتاب میں خیمہ کے روبرو وہ جو بڑی بڑی قناتیں تھیں کھول ڈالیں ۔ فقط ایک نمگیر اطلس کا کہ اُس میں بادلے کی جھالر لگی ہوئی تھی کلابتوں کی ڈوریوں

سے طلائی الماس تراش استادوں پر کھڑا ہوا تھا ۔ اُس چاندنی رات میں میدان کا عالم اور ابتدائے برسات کی ہوا ، مطلع صاف تھا ۔ لیکن کہیں لکے ابر کے سفید سفید چاند کی روشنی میں فلک پر معلوم ہوتے اور صدا دریا کی موج کی اور سناٹا ہوا کا اور لشکر کی دھوم ، آواز کوس و نقارے کی آتی ہوئی نہایت بھلی معلوم ہوتی تھی ۔ اُس وقت امیر کو سرور شراب کا اور اُس گلابی آنکھوں میں سرخ ڈوروں کی نمود ، جیسے برگ گل بر رگ گل کا عالم ہوتا ہے ، اُس حالت میں عمر کو فرمایا کہ اب ہم جام اور شیشہ رکھ دو اور ھتھیاروں کو منگوا لو ۔ عمر نے اُس وقت امر کا ، معہ یاروں کے سلاح منگوایا اور لگے سان دینے ۔ غرض اسی طرح تمام رات گزری[1] ۔

یہی بات لکھنوی نسخے میں اس طرح بیان ہوئی ہے :

''تمام رات دونوں لشکروں میں طبل و نقارہ بجا کیا ۔ امیر سب بیدار رہے اور جناب باری میں مصروف مناجات و استغفار رہے''[2] ۔

قصہ گو اور انشا پرداز کی حیثیت سے اسک میں موزونیت ، توازن اور اعتدال کے احساس کی جو کمی ہے اُس کا اظہار کسی نہ کسی طرح اُن مثالوں میں بھی ہوتا رہا ہے جو اب تک اُن کی داستان کی مختلف خصوصیات کے لئے پیش کی گئیں لیکن ان اہم او ضروری خصائص قصہ گوئی سے وہ کتنے عاری ہیں اس کا اندازہ اوپر کے دونوں ٹکڑوں کا مقابلہ کر کے کہیں زیادہ ہوتا ہے ۔ اشک کی یہ طویل تمہید جس میں اُنہوں نے منظر نگاری اور رنگینی تخیل کے جوہر دکھانے کے علاوہ اپنی شاعرانہ جولانیوں سے بھی پورا فائدہ اُٹھایا ہے حد درجہ بے محل بھی ہے اور کئی حیثیتوں سے توازن کے فقدان کی غماز بھی ۔ اُنہوں نے اپنی بات اس جملے سے شروع کی ہے :

''تمام رات دونوں لشکروں میں طیاری جنگ کی رہی''

---

۱ ۔ صفحہ ۵۳ نسخہ اشک ۔ ۲ ۔ صفحہ ۵۸ لکھنوی نسخہ ۔

اور اس اجمال کی تفصیل میں امیر کی شراب نوشی، 'اطلس کا نمگیر، (جو بادلے کی جھالر، کلابتوں کی ڈوریوں سے مزین اور الماس کے استادوں پر کھڑا ہے) سب مہتاب، برسات کی خنک ہوا، آسمان پر بکھرے ہوے لکہ ھائے ابر، موج دریا کا نغمۂ شیریں، امیر کی گلابی آنکھوں میں سرخ ڈوروں کی نمود جیسی چیزیں شامل ھیں ۔ سلاح کی طلبی اور ان پر سان لگانا محض روا روی کی چیزیں ھیں ۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ ساری ''شاعری'' نہ صرف اس فضا کی ضد ہے جو صبح کو برپا ھونے والی جنگ کا پیش خیمہ ھونی چاھئے بلکہ امیر کے کردار پر ایک بد نما داغ ہے، اور اس طرح قصہ گو میں قصہ گوئی کی صلاحیتوں کے خلاف ایک بین اور صریح شہادت ۔ اس کے برخلاف لکھنوی مولفین کے احساس توازن کو دیکھئے جو لفظی اور معنوی تکلفات کو ادا سعار سمجھتے اور شعریت، ادبیت اور عبارت آرائی کے کسی موقعے کو ھاتھ سے نہیں جانے دیتے ۔ طبل و نقارہ کا ذکر اسک کی طرح انھوں نے بھی کیا ہے لیکن امیر کو بادہ نوشی میں مسرور و مخمور دکھانے کے بجائے مصروف مناجات و استغفار دکھایا ہے کہ یہی چیز فطری بھی ہے اور اس خاص محل اور کردار کی نوعیت کے اعتبار سے قابل قبول بھی ۔ واقعہ نگاری اور منظر کشی کے لئے بھی انھوں نے اس محل کو قطعی ناموزوں جانا ہے اور اپنی تخیلی قوت کو بے محل صرف کرنے کے بجائے اسے واقعہ کے اگلے اور زیادہ اھم حصے کے لئے محفوظ رکھا ہے ۔

صبح ھوتی ہے اور میدان کارزار گرم ھوتا ہے ۔ اس کا نقشہ پہلے اسک کی نظروں سے دیکھئے :

''صبح کو نعمان بن منظر دس ہزار سوار لے کر میدان میں کھڑا ھوا ۔ اس طرف سلطان صاحب قران امیر حمزہ نامدار ہزار سوار کی جمعیت ھمراہ لے کر تمام سلاح نبیوں کا لگائے ھوئے مرکب سیاہ قیطاس پر سوار ھوئے اور طوق بن حران ھاتھ میں علم لیا ھوا، اس کا سایہ صاحب قران پر کیا ھوا ۔ دست راست امیر کے سلطان بخت مغربی سلاح جواھر نگار میں مغرق اور دست چپ کو سہیل اور

اسی طرح پیچھے امیر کے مقبل وفادار دو ترکش قضاتی ایک گھوڑے سے لگائے ہوئے اور ایک کمربند سے کمان ہاتھ میں لئے ہوئے مستعد اور آگے جلو میں عمر و عیار پیک نامدار خنجر گزار چست و چالاک بنا ہوا اس طرح آہستہ آہستہ جس وقت کچھ ایک کرن سورج کی نکلنی شروع ہوئی ، اُس وقت مقابل نعمان کی فوج کے جا کر کھڑے ہوئے ۔ لیکن عمر نے اس قرینے سے صفیں استادہ کی تھیں کہ وہ ہزار سوار بھی چار ہزار سے کم نہ معلوم ہوتے تھے ۔ اور اُس وقت ھلکا ھلکا خفیف سا کچھ ابر بھی آسمان پر چھایا ہوا تھا اور سبزہ میدان کا بھلا معلوم ہوتا ہوا ۔ خنکی ہوا کی، نشان دونوں فوجوں کے لہراتے ہوئے ۔ سبزہ کی زرہ جوشن کی اور گھوڑوں کا ھنہنانا ، نقیبوں کی صدا اس وقت سب منتظر ملکہ ھمائے تاجدار کھڑے تھے کہ ایک مرتبہ قلعہ کی طرف سے ایک سوار جواھر پوش نکلا ۔ گویا سراسر یہ مرکب جواھرات کے دریا میں غوطہ مارے تھا ۔ لیکن ایک نقاب سبز زمرد نگار منہ پر پڑا ہوا ۔ مع سپر ، تلوار ، خنجر ، ترکش کمان مسلح اور ایک چوگان ہاتھ میں لئے ہوئے آیا ۔ مانند شعلۂ آتش منہ مسلمانوں کی طرف کیا اور آواز دی ”کہاں ہے خواھندۂ مغربی ، آوے میدان میں کہ اُس کا کسب و ھنر دیکھ لوں“، ساتھ ھی اس کہنے کے امیر نے خنگ نبی اسحاق کو ران میں گدگدایا ۔ مثل برق کے میدان میں آیا اور برابر اُس کے آ کر کہا ”او معشوق! دیکھوں تیرا کمال ، جو یہ شہرہ تو نے پیدا کیا ہے“ اس نے اشارہ کیا اپنے عیار کو ۔ اُس نے ایک گوئے میدان میں ڈالا ۔ اُس معشوق نے چوگان کو گوئے سے آشنا کیا اور میدان میں لے چلی ۔ امیر نے تامل کیا ۔ جب کہ آدھے میدان میں گزر گئی تو امیر نے بھی چوگان عمر کے ھاتھ سے لے کر سیاہ قیطاس کو میدان میں ڈالا اور برابر آ کر چوگان گوئے کو مارا اور طرف میدان کے پھیرا ۔ اُس معشوقہ نے نقاب کھول کر سر پر ڈالا اور امیر کو کہا ”میری طرف

اور اس اجمال کی تفصیل میں امیر کی شراب نوشی، ''اطلس کا نمگیر، (جو بادلے کی جھالر، کلابتوں کی ڈوریوں سے مزین اور الماس کے استادوں پر کھڑا ہے) سب مہتاب، برسات کی خنک ہوا، آسمان پر بکھرے ہوئے لکہ ہائے ابر، موج دریا کا نغمۂ شیریں، امیر کی گلابی آنکھوں میں سرخ ڈوروں کی نمود جیسی چیزیں شامل ہیں - سلاح کی طلبی اور اُن پر سان لگانا محض روا روی کی چیزیں ہیں -

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ ساری ''شاعری'' نہ صرف اُس فضا کی ضد ہے جو صبح کو برپا ہونےوالی جنگ کا پیش خیمہ ہونی چاہئے بلکہ امیر کے کردار پر ایک بد نما داغ ہے، اور اس طرح قصہ گو میں قصہ گوئی کی صلاحیتوں کے خلاف ایک بین اور صریح شہادت - اس کے برخلاف لکھنوی مولفین کے احساس توازن کو دیکھئے جو لفظی اور معنوی تکلفات کو اپنا شعار سمجھتے اور شعریت، ادبیت اور عبارت آرائی کے کسی موقعے کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے - طبل و نقارہ کا ذکر اسک کی طرح اُنھوں نے بھی کیا ہے لیکن امیر کو بادہ نوشی میں مسرور و مخمور دکھانے کے بجائے مصروف مناجات و استغفار دکھایا ہے کہ یہی چیز فطری بھی ہے اور اُس خاص محل اور کردار کی نوعیت کے اعتبار سے قابل قبول بھی - واقعہ نگاری اور منظر کشی کے لئے بھی اُنھوں نے اس محل کو قطعی ناموزوں جانا ہے اور اپنی تخیلی قوت کو بے محل صرف کرنے کے بجائے اُسے واقعہ کے اگلے اور زیادہ اہم حصے کے لئے محفوظ رکھا ہے -

صبح ہوتی ہے اور میدان کارزار گرم ہوتا ہے - اس کا نقشہ پہلے اسک کی نظروں سے دیکھئے:

''صبح کو نعمان بن منظر دس ہزار سوار لے کر میدان میں کھڑا ہوا - اس طرف سلطان صاحب قران امیر حمزہ نامدار ہزار سوار کی جمعیت ہمراہ لے کر تمام سلاح نبیوں کا لگائے ہوئے مرکب سیاہ قیطاس پر سوار ہوئے اور طوق بن حران ہاتھ میں علم لیا ہوا، اُس کا سایہ صاحب قران پر کیا ہوا - دست راست امیر کے سلطان بخت مغربی سلاح جواہر نگار میں مغرق اور دست چپ کو سہیل اور

اسی طرح پیچھے امیر کے مقبل وفادار دو ترکش قضاتی
ایک گھوڑے سے لگائے ہوئے اور ایک کمربند سے کمان
ہاتھ میں لئے ہوئے مستعد اور آگے جلو میں عمر و عیار
پیک نامدار خنجر گزار چست و چالاک بنا ہوا اس طرح
آہستہ آہستہ جس وقت کچھ ایک کرن سورج کی نکلنی
شروع ہوئی ، اس وقت مقابل نعمان کی فوج کے جا کر کھڑے
ہوئے۔ لیکن عمر نے اس قرینے سے صفیں استادہ کی تھیں کہ
وہ ہزار سوار بھی چار ہزار سے کم نہ معلوم ہوتے تھے۔
اور اس وقت ہلکا ہلکا خفیف سا کچھ ابر بھی آسمان پر چھایا ہوا
تھا اور سبزہ میدان کا بھلا معلوم ہوتا ہوا۔ خنکی ہوا کی،
نشان دونوں فوجوں کے لہراتے ہوئے۔ سبزہ کی زرہ جوشن
کی اور گھوڑوں کا ہنہنانا ، نقیبوں کی صدا اس وقت سب
منتظر ملکہ ہمائے تاجدار کھڑے تھے کہ ایک مرتبہ
قلعہ کی طرف سے ایک سوار جواہر پوش نکلا۔ گویا سراسر
یہ مرکب جواہرات کے دریا میں غوطہ مارے تھا۔ لیکن
ایک نقاب سبز زمرد نگار منہ پر پڑا ہوا۔ مع سپر ، تلوار ،
خنجر ، ترکش کمان مسلح اور ایک چوگان ہاتھ میں لئے
ہوئے آیا۔ مانند شعلۂ آتش سمند مسلمانوں کی طرف کیا اور
آواز دی ”کہاں ہے خواہندۂ مغربی ، آوے میدان میں کہ
اس کا کسب و ہنر دیکھ لوں“، ساتھ ہی اس کہنے کے امیر
نے خنگ نبی اسحاق کو ران میں گدگدایا۔ مثل برق کے
میدان میں آیا اور برابر اس کے آ کر کہا ”او معشوق!
دیکھوں تیرا کمال ، جو یہ شہرہ تونے پیدا کیا ہے“
اس نے اشارہ کیا اپنے عیار کو۔ اس نے ایک گوئے میدان
میں ڈالا۔ اس معشوق نے چوگان کو گوئے سے آشنا کیا اور میدان
میں لے چلی۔ امیر نے تامل کیا۔ جب کہ آدھے میدان میں
گزر گئی تو امیر نے بھی چوگان عمر کے ہاتھ سے لے کر
سیاہ قیطاس کو میدان میں ڈالا اور برابر آ کر چوگان
گوئے کو مارا اور طرف میدان کے پھیرا۔ اس معشوقہ نے
نقاب کھول کر سر پر ڈالا اور امیر کو کہا ”میری طرف

دیکھ،، جوں ھی نگاہ امیر کی اُس پر پڑی تو واقعی ایک معشوقہ ہے کہ حسن و جمال میں لاثانی ۔ آفتاب اور ماھتاب اُس کے حسن کی تجلی کے آگے شرمندہ ھیں ۔ ایک سکتہ کی حالت ھوگئی ۔ اُس معشوقہ نے امیر کی یہ حالت دیکھ کر گھوڑے کو جولان دیا اور پھر چوگان سے گوئے کو لے چلی ۔ امیر نے دفعتاً ھوش میں آ کر اپنے مرکب کو بھی ایڑ دی اور کہا ،،او علامہ! معلوم ھوا اسی طرح نو مردان عالم کو فریب دے کر شرط جیت لیتی ہے ۔ لیکن میں ھرگز تیرے حسن کا فریفتہ نہیں ھوا ۔ میرے ھاتھ سے کہاں جا سکتی ہے،، یہ کہہ کر چوگان کو اس پر لائے اور میدان کی طرف لے چلے ۔ ھر چند ھما نے چاھا کہ گوئے تک پہنچے لیکن امیر لے ھی گئے اور فرمایا ،،اے ھما! اب کیا کہتی ہے؟،، کہا ،،ایک مرتبہ پھر آزمائیے،، امیر نے گوے اُس طرف پھینکا اور وہ اس دفعہ مثل ھوا کے لے چلی ۔ امیر نے بھی پھر گھوڑا دبا کر گوے پھیری ۔ اُس نے دیکھا کہ حمزہ گوے کی طرف مصروف ہے ۔ بھاگی اور چاھا کہ بھاگ کر صف میں جاوے ۔ نظر امیر کی اُس پر پڑی ۔ گوئے اُس پر چھوڑ کر اُس کے برابر گئے اور کمربند پکڑ کر گوئے سمیت اُٹھا لیا اور لا کر عمرو کے حوالے کیا ۔ اُس نے کمند کو ھاتھ سے باندھ کر لشکر کی راہ لی [۱] ۔

اب اس محل کی لکھنوی نسخے کی عبارت ملاحظہ کیجئے :

'' جب شاہ خاور تخت فلک پر جلوہ افروز ھوا اور شعاع نورانی سے میدان زمین پر نیزہ بازی کرنے لگا ، نعمان اپنے لشکر کو لے کر میدان میں نکلا ۔ پہلوانان صف شکن و فیلانان تہمتن کا پرا جمائے ھوئے عرصۂ وغا میں آ پہنچا ۔ سلطان ذی وقار صاحب قران روزگار امیر با وقار یعنی حمزہؑ نامدار خود بر سر ، زرہ در بر، شمشیر در کمر بھی

---

۱ ۔ صفحات ۵۳، ۵۵ داستان امیر حمزہ ۔ اشک ۔

مسلح ہو کر سیاہ قیطاس پر سوار ہوئے ۔ نیزہ ہاتھ میں لیا ۔ جلو میں اصحاب و رفیق جان نثار ہوئے ۔ طوق بن حران نے علم کا سایہ صاحب قران پر کیا ۔ ہمائے اوج سعادت اپنے دام میں لیا ۔ دست راست سلطان بخت مغربی اور دست چپ کو سہیل یمنی سلاح جواہر نگار بدن پر سجے ہوئے بادۂ غرور شباب سے جام کا سہٗ سر بھرے ہوئے اور عمرو عیار پیک نامدار، خنجر گزار جگر فگار بکمال چستی و چالاکی گھوڑے کے آگے پھلانگیں مارتا خوش فعلیاں کرتا اور لشکریوں کو ہمت دلاتا، بڑھاوے دیتا چلا ۔ آن و بان سے ، بڑی شوکت و شان سے خنداں خنداں گھوڑے کے آگے بڑھا ۔ مقبل وفادار کو اس دن امیر نے ہراول کیا ۔ وہی رسالہ ہزار سوار کا جو سہیل یمنی کے ساتھ مسلمان ہوا تھا مقبل کے ہمراہ کر دیا ۔ عمرو نے اس تدبیر سے صفیں قائم کیں کہ غنیم بھی اس لشکر ظفر پیکر کو دیکھ کر حیران ہوا ۔ پانچ چھ ہزار سپاہی کا امیر کے لشکر پر گمان ہوا ۔ دونوں طرف سے جب صف آرائی ہو چکی ، مبارز طلبی کی جب نوبت پہنچی امیر ہمائے تاجدار کے اشتیاق میں منطر شاہ کے مقابل کھڑے تھے ۔ شیر غراں کی طرح پکارتے ہوئے بڑھ رہے تھے کہ ایک جوان نقاب زمردیں چہرے پر ڈالے سر سے پاؤں تک مع مرکب دریائے جواہر میں غرق ، سپر ، تلوار ، خنجر و کمان ، ترکش ، نیزہ خطی دوش پر سنبھالے چوگان ہاتھ میں لئے رہوار کو خیز کئے اوجھیوں پر لایا ۔ خراماں خراماں میدان میں آیا ۔ امیر کی طرف دیکھ کر آواز دی کہ ”خواہندۂ ہمائے تاجدار کون ہے ؟ میرے سامنے آوے ۔ یہی گوئے یہی میدان ہے اپنا کسب و ہنر دکھلاوے“۔ امیر نعرہ سنتے ہی خنگ اسحق نبی علیہ السلام کو برق کی طرح چمکا کر میدان میں آئے ۔ کاوا ایڑن پر لگائے ، کبھی اڑاتے ، کبھی جماتے، اس اسپ خوش خرام کو معرکے میں لائے اور فرمایا کہ او جوان ہوشیار ہو

ھمیں میدان ھمیں چوگان ھمیں گوئے۔ اس کے عیار نے گوئے کو میدان میں لا کر ڈال دیا اور اس معشوقہ نے گھوڑے کو ران سے گد گدا کر گوئے کو چوگان سے آشنا کیا چاھتی تھی کہ گوئے کو لے جاوے، اپنی چالاکی اور استادی دکھاوے کہ امیر نے عمرو کے ھاتھ سے چوگان لے کر گھوڑے کو آگے بڑھا کر اس برق کردار کو آسن سے دبایا ۔ چوگان کو سنبھال کر گوئے پر مارا ۔ قوت خدا داد کا جلوہ دکھایا ۔ اس معشوقہ نے دیکھا کہ ھاتھ سے بازی جاتی ھے۔ تمام شعبدہ بازی اور مساعی خاک میں ملی جاتی ھے، جھٹ پٹ نقاب الٹ کر چہرۂ پرنور وا کیا ۔ جمال جہاں آرا سے سطح میدان کو منور کر دیا ۔ ترجمہ

الٹ جو دیا رخ سے اس نے نقاب
زمیں پر دکھائی دیا آفتاب

ھوئی اس سے جب چشم حمزہ دو چار
ھوئے غرقۂ حیرت آئنہ وار

امیر تو دیکھ کر سنندر ھوگئے ۔ صانع مطلق کی قدرت کا مشاھدہ کر کے متحیر ھوگئے ۔ ھمائے تاجدار نے فرصت پا کر پھر گھوڑے کو جھجکارا اور چوگان کو گوئے پر لگایا ۔ اس نے اپنی دانست میں گوئے کے لے جانے میں کوتاھی نہ کی تھی، کوئی کسر باقی نہ رکھی تھی، لیکن امیر نے دل کو سنبھالا، لاحول ولا قوۃ پڑھ کر استقلال شہامت کو کام فرمایا ۔ مرکب کو جولان کر کے کہا "ھم تیرا فریب اور چالاکی سمجھے اور تیری مکاری اور سفاکی سمجھے ۔ معلوم ھوا یوں ھی تو گوئے کو میدان سے لے جاتی ھے اور مردان عالم سے شرط جیت کر ان کے سروں کو قلعے کے کنگروں پر لٹکاتی ھے ۔ مگر کسی صاحب ھنر سے سابقہ نہ پڑا ھوگا، کسی مرد دلیر سے معاملہ نہ پڑا ھوگا، گوئے کو میدان سے یوں لے جاتے ھیں، دیکھ جوھر شجاعت و مردانگی یوں دکھاتے ھیں ۔ دیکھ!

خبردار ہو ، ہوشیار ہو ۔ میں گوئے کو میدان سے لے چلا
اور خدا کے فضل سے میدان میرے ہاتھ رہا،،۔ یہ فرما کر
گوئے کو میدان سے لے گئے ، ہمائے تاجدار کو شکست
فاش دے گئے ۔ ہر چند ہمائے تاجدار نے مکرر چوگان گوئے
تک پہنچائی ، اپنی چالاکی اور ہنروری دکھائی لیکن
امیر سے کب سبقت لے جا سکتی تھی ۔ اُس شیر بیشۂ
شجاعت کے روبرو کب فروغ پا سکتی تھی ۔ امیر گوئے
کو لے گئے اور اُس کی طرف متوجہ ہوکر فرمانے لگے کہ
'' اے ہمائے تاجدار ! کہ اب کیا کہتی ہے ؟ کچھ اور
حوصلہ باقی ہے ؟ '' اُس نے کہا '' ایک مرتبہ اور امتحان
کیا چاہئیے ، عرصۂ کارزار کو گرم کرکے اپنے اپنے
جوہر دکھایا چاہئیے ''

امیر نے بموجب اُس کے کہنے کے گوئے کو میدان میں پھنیک
دیا اور پھر چوگان سنبھال کر اس چسنی و چالاکی کو کام فرمایا
کہ پھر میدان دوبارہ جیت لیا ۔ ہمائے تاجدار نے دیکھا کہ بازی
ہاتھ سے گئی ، ہزاروں آدمی میں عزت و آبرو خاک میں ملی ۔
چاہا کہ گھوڑے کو ایڑ کر کے اپنے بھائی نعمان تک پہنچے ۔
میدان چھوڑ کر اپنے لشکر میں جا ملے ۔ امیر نے گھوڑے کو خیز
کر کے ہمائے تاجدار کا کمربند پکڑ کے مرکب سے جدا کیا
اور عمرو کی طرف گیند کی طرح پھنیک دیا ۔ عمرو نے کمند کے لچھے
سے ہاتھ اُس کے باندھ کر اپنے لشکر کی طرف رخ کیا ۔ ہمائے
اوج حسن و جمال کو اپنے دام میں لیا [۱]۔

اشک کے کھنچے ہوئے مرقعے کو دیکھ کر پڑھنے والا کئی
باتیں محسوس کرتا ہے :

(۱) اشک نے میدان کازرار کا تصور پیش کرتے ہوئے اس
بات کی کوشش کی ہے کہ اس مخصوص محل اور واقعہ
کے متعلق ساری باتیں وہ سیدھے سادے لفظوں میں
بے تکلفی سے بیان کر دیں ۔ اس وقت اُنہوں نے یہ فنی

---

۱ ۔ صفحات ۵۹ و ۶۰ داستان امیر حمزہ ، لکھنوی نسخہ ۲ ۔

نکتہ قطعی فراموش کر دیا کہ میدان کا زرار کا نقشہ پیش کرتے وقت لکھنے والے کو اپنی تصویر میں ایسے رنگ بھرنے چاہئیں جو دیکھنے والے کے لئے جذباتی جوش اور ولولہ انگیزی کا سبب بن سکیں ۔

(۲) میدان جنگ کی تصویر کشی کرتے وقت انہوں نے اس بات کی ضرورت محسوس کی ہے کہ پڑھنے والے کے سامنے وقت اور مقام کا صحیح تصور آسکے ۔ یہ تصور قائم کرنے کے لئے انہوں نے سورج کی کرن ، ہلکے ہلکے خفیف ابر ، میدان کے سبزے اور ہوا کی خنکی کا ذکر کیا ہے ۔ اس کے باوجود کہ یہ جزئیات اس وقت اور محل کے عین مطابق ہیں جب فوجیں ایک دوسرے کے مقابل صف آرا ہوئی نہیں ، ان چیزوں کا ذکر اس لئے بے محل اور ناموزوں ہے کہ اس سے اس بنیادی تأثر میں انتشار پیدا ہوتا ہے جو رزم کے مضامین کے ساتھ مخصوص ہے ۔

(۳) رزم گاہ کا یہ محل کچھ اس انداز کا ہے کہ ہمائے تاجدار کی موجودگی نے اس میں ایک ہلکا سا رومانی رنگ پیدا کر دیا ہے ۔ رزم گاہ میں ایک حسین عورت کا وجود ایک ایسا تضاد ہے جسے نباہنے کے لئے لکھنے والے کو تخیل اور بیان کی پوری احتیاط اور نزاکت سے کام لینے کی ضرورت ہے ۔ اشک نے اس تضاد کی نزاکت کا احساس کئے بغیر تصویر کے رومانی نقوش کو زیادہ ابھار دیا اور رزم گاہ کا ذکر پڑھنے اور سننے والے کے لئے ولولہ خیز ہونے کے بجائے خاصی حد تک ہیجان انگیز بن گیا ہے ۔

(۴) ہیجان انگیزی کی اس کیفیت میں سامع یا قاری کے علاوہ امیر حمزہ بھی شریک ہیں ۔ ہمائے تاجدار جیسی ''معشوقہ'' کے ''حسن و جمال'' سے ''جس کے حسن کی تجلی کے آگے آفتاب و ماہتاب شرمندہ ہیں'' [۲] ۔ امیر پر بھی سکتہ طاری

ہو جاتا ہے گو وہ ''دفعۃً ہوش میں آ جاتے ہیں''۔
یہ کیفیت امیر کے کردار کی عظمت سے مطابقت
نہیں رکھتی۔

(۵) اشک کی قصہ گوئی اور اسلوب نگارش میں ہر جگہ توازن
اور احتیاط کی جو کمی ہے اس کا اظہار اس عبارت میں
بھی کئی طریقوں سے ہوتا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے
کہ اشک کو واقعہ نگاری اور منظر کشی میں اس بات کا
اندازہ نہیں کہ واقعہ اور منظر کا صحیح تصور قائم کرنے
اور قاری پر ایک خاص طرح کا تاثر پیدا کرنے کے لئے
کون سی تفصیلات کو ابھارنا اور کنہیں دبانا ضروری ہے۔
توازن اور احتیاط کے احساس کی کمی دوسری طرح یوں
ظاہر ہوتی ہے کہ اشک نے کرداروں کو قصے میں
جگہ دیتے وقت یہ بات پیش نظر نہیں رکھی کہ اُن کی
رفتار و گفتار میں مطابقت، مناسبت اور ہم آہنگی نہ ہو تو
کردار کا نقش بگڑ کر رہ جاتا ہے اور پھر تیسرے
یہ کہ لفظوں کا انتخاب موقع اور محل کی مناسبت سے
نہ کیا جائے تو عبارت کا سارا لطف ختم ہو جاتا ہے۔

(۶) اشک کی اس خاص عبارت کو پڑھ کر یہ اندازہ کرنا بھی
دشوار نہیں کہ واقعہ نگاری میں ابتدائی اور خاتمے کے
جملوں کی جو اہمیت ہے اسے اشک نے پوری طرح محسوس
نہیں کیا ہے۔ اس نے عبارت کو شروع کرنے اور
ایک خاص انجام تک پہنچانے میں لفظوں کی سجاوٹ اور
فقروں کی ترتیب کا اتنا خیال نہیں رکھا جتنا کہ
چاہئیے۔

اس کے مقابلے میں لکھنوی نسخے میں نمایاں طور پر یہ
خصوصیتیں نظر آتی ہیں:

(۱) طرز بیان کی رنگینی، پرتکلف اور پرتصنع عبارت آرائی،
قافیے اور سجع کی پابندی، بیان میں شاعرانہ تخیل اور
تصور اور التزام، الفاظ کا موزوں انتخاب اور ان سب سے

بڑھ کر مجموعی حیثیت سے عبارت کی چستی اور سجاوٹ
اُس کی بنیادی خصوصیات ھیں -

(۲) ان خصوصیات کو لکھنوی مؤلفوں نے ھر موقع اور محل
پر یکساں قادرالکلاسی اور اھتمام کے ساتھ برتا ھے -
چنانچہ موجودہ عبارت میں واقعہ کی تصویر کشی اور
کرداروں کی ھلکی سی جھلک دکھاتے وقت بھی اس اھتمام
اور قادرالکلامی میں کمی نہیں آئی -

(۳) لکھنوی مؤلفن ھر بات میں مبالغہ آمیزی کے عادی ھیں -
اس کے باوجود اُن کی واقعہ نگاری اور کردار نگاری میں
ایک ایسی احتیاط اور توازن ھے کہ واقعہ کا حسن اور
کردار کا وہ نقش برقرار رھتا ھے جو اُس کی ذات کے
ساتھ وابستہ ھے - یہی وجہ ھے کہ ھمیں اوپر والی عبارت
میں رومان کی ایک بڑی ھلکی سی جھلک بھی دکھائی
دے جاتی ھے اور شخصیتوں کی عظمت اور وقار کو بھی
ٹھیس نہیں لگتی -

(۴) لکھنوی نسخے میں ھر باب کے آغاز کو بڑی اھمیت دی
گئی ھے اور اُس کے ابتدائی دو ایک جملے ھمیشہ فضا
قائم کرنے اور آنے والے واقعات کی طرف بے حد متوازن
اشارہ کرنے کی خدمت انجام دیتے ھیں چنانچہ یہاں بھی
ابتدائی جملے میں شاہ خاور کی جلوہ افروزی کے ساتھ اُس کی
شعاع نورانی کی نیزہ بازی کا مذکور اُن واقعات کی طرف
ایک ھلکا سا شاعرانہ اشارہ ھے جو ابھی پیش آنے
والے ھیں -

(۵) باب کے آغاز کے ساتھ ساتھ انجام کو لکھنوی مؤلفین نے
تاثر پیدا کرنے کا ایک یقینی وسیلہ جان کر ھمیشہ اُسے
اپنی ذھنی توجہ کا مرکز بنایا ھے - چنانچہ اس محل پر
بھی جو داستان اشک نے ان الفاظ پر ختم کی کہ
''گوئے اُس پر (یعنی ھمائے تاجدار پر) چھوڑ کر اُس کے
برابر گئے اور کمربند پکڑ کر گوئے سمیت اُٹھا لیا اور

لا کر عمر کے حوالے کیا ۔ اُس نے کمند کو ھاتھ سے باندھ کر لشکر کی راہ لی'' اُسے لکھنوی نسخے میں یوں ختم کیا گیا ھے :

''امیر نے گھوڑے کو خیز کرکے ھمائے تاجدار کا کمربند پکڑ کے مرکب سے جدا کیا اور عمر کی طرف گیند کی طرح پھینک دیا ۔ عمر نے کمند کے گحھے سے ھاتھ اُس کے باندھ کر اپنے لشکر کی طرف رخ کیا ۔ ھمائے اوج حسن و جمال کو اپنے دام میں لیا ''

اس ٹکڑے میں جزئیات کا جو ھلکا سا لیکن سوچا سمجھا فرق ھے اُس سے قطع نظر ''ھمائے اوج حسن و جمال کو اپنے دام میں لیا'' والے ٹکڑے کا اضافہ قابل تحسین ھے ۔ اس کی سعریت ، موزونیت اور خیال کے اندر چھپی ھوئی رنگین کیفیت نے پوری عبارت کا تاثر ایک نقطہ پر مرکوز کر دیا ھے ۔

(٦) لکھنوی نسخے کی عبارت کی آخری (لیکن خاصی اھم) خصوصیت یہ ھے کہ اُس میں تفصیلات اور جزئیات کے انتخاب میں شروع سے آخر تک پوری توجہ اور کاوش صرف کی گئی ھے ۔

اشک کے نسخے میں رزمیہ مرقع نگاری کے جو دو نمونے ھم نے اوپر درج کئے ان کے علاوہ پوری داستان میں ایسے بہت سے موقعے آتے ھیں جن پر امیر حمزہ اور اُن کے لشکر کو حق کی حمایت میں باطل کی زبردست قوتوں کے خلاف رزم آرائی کرنی پڑی ھے ۔ ان جنگوں میں ھمیشہ فتح و ظفر امیر کے ساتھ رھی ھے اس لئے کہ اول تو امیر اور ان کے ساتھی شجاعت و مردانگی کی اُن تمام صفات سے مزین تھے جو ھمیشہ انسان کو فاتح و مظفر بنانے کی ضامن رھی ھیں ۔ ان کی کامیابی و کامرانی کی دوسری وجہ یہ تھی کہ امیر کی ساری شجاعت و مردانگی حق اور خیر کی حمایت اور شر و باطل کی شکست و ریخت کے لئے وقف تھی ۔ داستان امیر حمزہ کے دونوں نسخوں میں ایسے سب موقعوں پر برتری کا شرف امیر اور اُن کے

رفقا کو حاصل رہا ہے ۔ یہ فرق البتہ ہے کہ واقعات کے بیان اور کرداروں کی رفتار و گفتار کی پیشی کش میں اشک نے عموماً توازن و اعتدال کی کمی کا ثبوت دیا ہے ۔ اس کے برخلاف لکھنوی مؤلفین نے توجہ ، انہماک اور ذہنی کاوش کی بدولت واقعہ نگاری اور کردار نگاری دونوں کو حسب دلخواہ موثر بنایا ہے اور عموماً حسن بیان سے پڑھنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے ۔ لیکن کبھی کبھی تکلفات کی شدت اور عبارت آرائی کے تصنع سے پڑھنے والے کے لئے ذہنی تکدر کا سامان بھی بہم پہنچایا ہے ۔

لکھنوی نسخے میں عبارت آرائی کا جو اہتمام اور لفظی تکلفات کی جو کثرت ہے وہ لکھنوی مذاق اور اس شائستہ و مہذب ماحول کا اثر ہے جس نے زندگی کے ہر گوشے میں سادگی کے ترک اور تکلف و تصنع کو اپنا شعار بنایا ہے ۔ داستان امیر حمزہ کے لکھنوی نسخے کی خوبی اور اس کے مؤلفین کا سرف اسی بات میں ہے کہ انہوں نے اس طویل داستان میں ہر موقع پر لکھنوی مذاق اور اس کے مہذب تکلف و تصنع کی کامیاب پیروی کی ہے اور بہت کم موقعے ایسے ہیں جنہیں پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے تھک ہار کر یا عاجز آ کر اپنے اسلوب کی طرف سے بے توجہی برتی ہے ۔ بلکہ سچ تو یوں ہے کہ کسی طرح کی بے توجہی کے بجائے ان کی عبارت میں پوری ذہنی کاوش اور ایک خاص طرح کے فنی احساس کا عکس موجود ہے ۔ اب تک آپ نے لکھنوی داستان امیر حمزہ کی جتنی عبارتیں دیکھیں وہ موضوعات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہونے پر بھی اسلوب نگارش کے نقطۂ نظر سے یکساں خصوصیات کی حامل ہیں ۔ چنانچہ اس سلسلے میں رزمیہ نگاری کے دو نمونے ابھی آپ کے سامنے آ چکے ہیں ۔ اب میدان رزم چھوڑ کر ذرا بزم کی ایک جھلک دیکھ لیجئے ۔

یہ موقع وہ ہے جب امیر حمزہ چھپ کر ملکہ مہر نگار کے محل میں پہنچتے ہیں ۔ اشک کے نسخے میں یہ داستان جلد اول کی دسویں داستان ہے اور اس کا عنوان ہے :

” داستان دسویں ۔ امیر کا جانا محل میں مہر نگار کے اور اس کے چونکنے میں “

لکھنوی نسخے میں بھی یہ داستان دفتر اول میں ہے ۔ اس
نمبر البتہ کوئی نہیں ۔ اس نسخے میں اس داستان کا عنوان اس طر
قائم کیا گیا ہے :

''پہلی ملاقات امیر کی سر حلقۂ خوبان روزگار سے ، یع
ملکۂ مہر نگار سے ''

اب دونوں نسخوں کی عبارت ملاحظہ ہو :

عبارت نسخۂ اشک

''جوہریان بازار معانی کہتے ہیں کہ جب صاحب قران او
گئے اور دور سے لگے نگاہ کرنے، دیکھیں تو مہر نگار ۔
محل میں ایک جانب محفل نشاط آراستہ کی ہے اور اپنے ہ
نشینوں سے بادہ خواری میں مشغول ہے اور مہر نگ
بہتر از صد نگار درمیان میں معشوقان ماہ رویان کے
مانند بہار بیٹھی ہے کہ اس کے جمال کی تجلی سے وہ تم
مکان روشن ہے ....[1]۔ مہر نگار نے جس
وقت امیر کو دیکھا تھا اس وقت سے اس کو عجب طرح ک
وحشت تھی ۔ دن اس نے بہ ہزار دقت کاٹا ، جب رات ہوئ
واسطے جی بہلانے کے صحبت نشاط آراستہ کی اور اپنی دائ
کی بیٹی فتنہ خانم کو بلا کر کہا ''آج ہم کو نہایت
قلق ہے اور جی گھبراتا ہے تو اپنے ہاتھ سے شراب پلا
غرض جو جو اس کی محرم راز تھیں آ کر اس کے پاس حاض
ہوئیں ۔ اس وقت گلستان حسن و جمال میں ان غنچہ رویو
کا گرد اس کے بیٹھ کر گانا اور بجانا ایک جلوہ نور کا
معلوم ہوتا تھا.... .. .. غرض اس شب مہر نگا
دوپہر رات سے آگے تک بیٹھی شراب پیا کی ۔ ہر پیالے کے
ساتھ امیر کو یاد کیا کی اور کہا افسوس یارجانی وا

---

۱ ۔ اس جگہ اشک نے چار پانچ سطروں میں مہر نگار کا سراپا بڑے
روایتی اور فرسودہ انداز میں بیان کیا ہے جو ہماری مثنوی کا عام دستور ہے
اسے میں نے ترک کر دیا ہے ۔

محبوب زندگانی اس وقت تو کہاں ہوگا - چل پہنچ - ہردم
یہ کہتی تھی اور بے قراری کرتی تھی.......... .... "

اس کے بعد ملکہ نے خواصوں کو رخصت کیا اور چپر کھٹ پر لیٹ کر کروٹیں بدلنے لگی - صبح ہوتے نیند آگئی - امیر نے یہ موقع غنیمت جانا اور بقول اشک :

"اندر اُس بارہ دری کے گئے - دیکھیں تو پردے اُس کے چاروں طرف کو پڑے ہیں اور شمع ہائے موسی گل کاری کی ہر جا مانند آہ عاشقاں روشن ہیں اور چپر کھٹ میں مہر نگار سوتی ہے - لیکن اُس کے حسن کے روبرو تمام شمعوں کی روشنی پھیکی معلوم ہوتی تھی اور وہ مکان اُس کے جمال سے مانند آفتاب کے منور تھا - امیر نے جی میں خیال کیا کہ ایسے معشوقوں کا وصال قسمت سے میسر ہوتا ہے - شاید پھر تیرے نصیب نہ ہو - اب اس مکان میں تو بڑی محنت سے آیا ہے، اس معشوق کے رخسارۂ برگ گل سے ایک بوسہ تو لے - یہ کہہ کر اُس چپر کھٹ کے پاس گئے - برابر مہر نگار کے بیٹھ کر دونوں ہاتھ اپنے اُس کے سر کے دونوں طرف تکیہ پر ٹیک دئے اور چاہا کہ جھک کر اُس کے لب لعل سے بوسہ لے لیکن ابتدائے عشق تھا اور ناکردہ کار ہاتھ امیر کا تکیے سے پھسل گیا - چھاتی پر اُس معشوق کی پڑے..............."

اس طرح مہر نگار جاگ گئی اُس نے شور مچایا لیکن امیر کو پہچان کر نادم ہوئی - جو خواصیں شور سن کر آگئی تھیں اُنہیں بہانہ کر کے ٹالا - خواصیں چلی گئیں تو امیر کو پلنگ کے نیچے سے نکالا اور اپنے پاس بٹھا لیا - دونوں ایک دوسرے کو حسرت سے تکتے رہے - اتنے میں سپیدۂ سحر نمودار ہوا تو بقول اشک :

"امیر مانند شبنم کے، جوں برگ گل پر ہوتی ہے آنکھوں میں آنسو بھر لائے اور کہا 'اے مہر نگار جو تو نے میرے ہوئے دل کو کمند ناز سے گرفتار کیا ہے،

اس صید زخم زدۂ عشق کو نیم بسمل نہ چھوڑنا ۔ اب رخصت ہوتا ہوں.......... .. ،، ۱۔

اب ذرا یہی ٹکڑے لکھنوی نسخے میں دیکھئے :

،، عشق ہے تازہ کار تازہ خیال ہر جگہ اسکی ایک نئی ہے چال
کہیں آنسو کی یہ سرایت ہے کہیں یہ خوں چکاں حکایت ہے
گہ نمک اس کو داغ کا پایا گہ پتنگا چراغ کا پایا
کہیں طالب ہوا کہیں مطلوب اسکی باتیں غرض ہیں دونوں خوب

خامۂ دل افگار ، نبض شناسان عشاق، مزاج دانان بیماران فراق، کلک شوریدہ سر مضامین ذوق و شوق زبان پر لاتا ہے ، ہجر و وصل کی داستان سناتا ہے کہ امیر نے سقف قصر پر سے دیکھا کہ ملکۂ مہر نگار ماہرویان پری پیکر کے حلقہ میں بیٹھی ہے اور صراحی مئے گلگوں سے بھری ہوئی سامنے رکھی ہے ۔ جام بلوریں ہاتھ میں چھلک رہا ہے ، بادۂ ارغوانی پیالہ سے جھلک رہا ہے ، لکن گوہر اشک کی لڑی نوک مژہ سے مسلسل تا بدھن ہے ، آتش عشق کا نور سینہ میں شعلہ زن ہے ۔ آہ سرد لبوں پر ہے ، نالہ کشی کا شغل اکثر ہے ۔ دن کو تو امیر نے دور سے دیکھا تھا اب متصل سے جو نظارہ کیا کہ چشمہ خورشید درخشاں اس کے حسن کے آگے پانی بھرتا ہے اور ماہ تاباں اس کے چہرہ پر نور کے پرتو سے ضیا اقتباس کرتا ہے ۔ امیر اس کے حسن دل آویز کو دیکھ کے آپ میں نہ رہے اور بھی شعلہ ہائے شوق دل میں بھڑکے........ .. ..۲
ملکہ کا رونا موقوف ہوا اور فتنہ بانو نے کہ ملکہ کی دایہ کی بیٹی تھی ساغر مے ملکہ کے ہاتھ میں دیا کہ اس کو پیو ۔ ملکہ نے کہا ، میں سب کے پیچھے پیوں گی ۔ تھوڑی دیر کے بعد نوش کروں گی ۔ تم تو اپنے

---

۱ ۔ نسخہ اشک صفحات ۱۰۸ تا ۱۱۰

۲ ۔ اس کے بعد کی چند سطروں میں اس بات کا مذکور ہے کہ ملکہ مہر نگار کی محرم راز خواصیں اسے سمجھا بجھا رہی ہیں ۔ خواصوں کے سمجھانے سے ملکہ کو قدرے تشفی ہوئی اور غم غلط کرنے کو دور جام چلا ۔

اپنے صیاد کا نام لے کر پیو ۔ قدرے قلیل میرے واسطے زھنے دو ۔ ۱
پھر کامل بزم بادہ خواری گرم رہی ....جب دوپہر سے زیادہ
رات گزری مجلس برخاست ہوئی ۔ ملکہ چھپر کھٹ پر جا لیٹی ۔
ہر چند کروٹیں لیتی مگر صاحب قران کے خیال میں نیند نہ آتی ۔
زار زار روتی جاتی ، آخر روتے روتے تھک گئی ۔ صاحب قران نے
دیکھا کہ ملکہ بھی سوئی اور ہر عورت اپنے مقام پر جا کر سو رہی ،
سیڑھیوں کی راہ سے بام قصر سے نیچے اترے ۔ دبے پاؤں ملکہ کے
چھپر کھٹ کے پاس گئے ۔ دیکھا کہ ملکہ سو رہی ہے ، مگر چشم انتظار
کھلی ہے ؎

آنکھیں کھلی ہوئی ہیں عجب خواب ناز ہے
فتنہ تو سو گیا ہے در فتنہ باز ہے

دیر تک روئے منور کو دیکھا کئے ۔ دل میں سوچا کئے کہ بڑی
محنت سے یہاں تک پہنچا ہے ۔ کمال تکلیف اٹھا کے یہ قرب نصیب ہوا
ہے ، دل کی ہوس تو نکال ۔ کسی حیلے سے صاحب قران نے اپنے دونوں
ھاتھ گل تکیوں پر رکھے ۔ چاھا کہ اس کے لب شیریں کو چومیں اور
رخسار تاباں کا بوسہ لیں ۔ ھاتھ تکیوں سے پھسل گئے ۔ ملکہ کی
چھاتیوں سے لگ گئے ۔ (اس کے بعد عبارت کا وہ ٹکڑا ہے جس میں ملکہ
کے چونکنے اور خواصوں کے اس کے گرد جمع ہو جانے کا ذکر ہے ۔
ملکہ امیر کو پہچان کر خواصوں کو رخصت کرتی ہے اور صاحب
قران جو چھپر کھٹ کے نیچے چھپ رہے تھے ، باھر نکلتے ھیں)..........

صاحب قران ان کے جاتے ھی نیچے سے نکل کر اوپر آئے ،
ملکہ مہر نگار کے برابر آئے ۔ ملکہ نے دن کو تو دور سے نظارہ
کیا تھا ، اب جو پاس سے دیکھا اور بھی غش کر گئی ، ہوش سے
گزر گئی ۔ صاحب قران نے منہ سے منہ ملا ۔ اپنی بو جو سنگھائی، تھوڑی

---

۱ ۔ اس کے بعد سب خواصیں اپنے اپنے معبوب کا نام لے کر جام
شراب نوش کرتی ھیں اور آخر میں ملکہ کی باری آتی ہے ۔ اس طرح امیر
کو پتہ چلتا ہے کہ ملکہ ان کے دام محبت میں اسیر ہے اور خواصوں میں
سے ایک کو عمر عیار سے اور دوسری کو مقبل سے محبت ہے ۔ اشک نے
ان باتوں کی تفصیل یوں ھی بیان کی ہے ۔

دیر کے بعد ہوش میں آئی ۔ اتنے میں روئے صبح نمودار ہوا ۔ صاحب قراں نے مانند شمیم اپنی چشم نرگس میں اشک بھر کے کہا ''اے جان خدا حافظ ہے ۔ اب کشندۂ علقمہ قنسری ٹھہر نہیں سکتا ہے کہ خوف افشائے راز کا ہے ۔ ... .مگر اس بسمل خنجر ناز کو بھول نہ جانا ، مبتلائے فراق کو دل سے نہ بھلانا ۔

ملکہ نے ایک آہ سرد کھینچی اور آبدیدہ ہو کر بولی کہ دیکھئے اتنا دن کیونکر بسر ہوتا ہے ، کس طرح مطمئن دل مضطر ہونا ہے ۔ اچھا خدا کو سپرد کیا ، اللہ کی امان میں دیا ؎

بس اب آپ تشریف لے جائیے　　جو گزرے گی ہم پر گزر جائے گی
طبیعت کو ہوگا قلق تھوڑی دیر　　ٹھہرتے ٹھہرتے ٹھہر جائے گی

اس کے بعد امیر رخصت ہوئے.........۱

اشک اور لکھنوی نسخے کی ان دونوں عبارتوں کو ساتھ ساتھ رکھ کر اُن کا مقابلہ کیا جائے تو پہلا بدیہی فرق تو یہی نظر آتا ہے کہ لکھنوی مؤلفین نے اشک کی عبارت کی تعقید دور کر کے اس میں سلاست و روانی پیدا کی ہے اور دوسرے اُسے مقفیٰ و مسجع بنانے کے علاوہ اپنے شاعرانہ تخیل سے شعریت و رنگینی کے محاسن سے مزین کیا ہے ۔ لکھنوی نسخے کی یہ خصوصیت اس میں شروع سے آخر تک نمایاں ہے ۔ مختلف موقعوں پر قصہ گوئی کے تقاضوں کے مطابق لکھنوی مولفین نے اشک کی عبارتوں میں کمی بیشی کر کے جو تبدیلیاں کی ہیں اُس کے بہت سے نمونے ہمارے سامنے آ چکے ہیں ۔ عبارت کا آہنگ اور قصہ کے مختلف اجزا میں موقع اور محل کے مطابق توازن پیدا کرنا لکھنوی مؤلفین کا مقصد رہا ہے اور اس مقصد کے حصول میں اُنہوں نے ہر جگہ توجہ اور انہماک سے کام لیا ہے ۔ اوپر کی دونوں عبارتوں میں بھی مختلف طریقوں سے یہی فرق موجود ہے ۔ یہ فرق لکھنوی مؤلفین نے عبارتوں میں کون کون سی کمیاں اور کون کون سے اضافے کر کے پیدا کیا ہے اس کا اندازہ ایک ایک ٹکڑے پر نظر ڈال کر کیجئے ۔

---

۱ ۔ عبارت صفحات ۹۹—۱۰۱ لکھنوی نسخہ داستان امیر حمزہ

اشک نے عبارت کا آغاز صرف یہ کہہ کر کیا ہے کہ :

”جوہریان بازار معانی کہتے ہیں کہ جب صاحب قران اوپر گئے اور دور سے لگے نگاہ کرنے، دیکھیں تو مہر نگار کے محل میں ایک جانب محفل نشاط آراستہ ہے اور اپنے ہم نشینوں سے بادہ خواری مں مشغول ہے۔

مہر نگار کی بادہ خواری کا ذکر چھیڑنے سے پہلے لکھنوی نسخے میں اُس تمہید کا اضافہ کیا گیا ہے جو اس مصرعہ سے شروع ہو کر کہ ”عشق ہے تازہ کار و تازہ خیال“ اس جملے پر ختم ہوتی ہے ”کلک شوریدہ سر مضامین ذوق و شوق زبان پر لاتا ہے، ہجر و وصل کی داستان سناتا ہے“

یہ بات بالکل بدیہی ہے کہ شاعرانہ اور پرلطف ادبی تمہید نے آنے والے واقعات کی نوعیت کی طرف اسارہ کرکے ایک موزوں اور دل کش فضا پیدا کر دی ہے۔ اس افسانوی مقصد کے احساس کے علاوہ تمہید کے اشعار کا حسن انتخاب اور نثر مں الفاظ، ترکیبوں اور فقروں کی موزونیت، چستی، ترنم اور آہنگ بھی ایسی چیزیں ہیں جن سے پڑھنے والا لطف محسوس کئے بغیر نہیں رہتا اب آگے دیکھئے :

اس تمہید کے بعد دونوں نسخوں میں ملکہ سہرنگار کی بزم نشاط کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ اس محفل کی تصویر کے نقوش کی وضاحت کے لئے اشک کے نسخے میں مندرجہ جملے استعمال کئے گئے ہیں :

”مہر نگار نے محل میں ایک محفل نشاط آراستہ کی ہے اور اپنے ہم نشینوں سے بادہ خواری میں مشغول ہے“

”مہر نگار بہتر از صد نگار درمیان میں معشوقان ماہ رویاں کے، مانند بہار بیٹھی ہے کہ اُس کے جمال کی تجلی سے وہ تمام مکان روشن ہے“

”اُس وقت گلستان حسن و جمال میں ان غنچہ رویوں کا گرد اُس کے بیٹھ کر گانا اور بجانا ایک جلوۂ نور کا سا عالم معلوم ہوتا تھا“

لکھنوی نسخے میں اس بزم مے کی تصویر اس طرح کھینچی گئی ہے :

''........ملکۂ مہر نگار ماہرویان پری پیکر کے حلقہ میں بیٹھی ہے اور صراحی مئے گلگوں سے بھری ہوئی سامنے رکھی ہے - جام بلوریں ہاتھ میں چھلک رہا ہے - بادۂ ارغوانی پیالہ سے جھلک رہا ہے''

فتنہ بانو نے کہ ملکہ کی دایہ کی بیٹی تھی ساغر مے ملکہ کے ہاتھ میں دیا کہ اس کو پیو ....پہر بھر کامل بزم بادہ خواری گرم رہی.... ....جب دوپہر سے زیادہ رات گزری مجلس برخاست ہوئی''

اسک اور لکھنوی نسخے کی ان عبارتوں کو پڑھ کر ایک بات تو یہ ذہن میں آتی ہے کہ اشک جن کا عام انداز نگارش سادگی کی طرف مائل ہے اس موقع پر سادگی کی جگہ شعریت کے گرویدہ ہوگئے ہیں - یوں عبارت میں اگر کہیں کہیں لکھنے والا ادبی اور شاعرانہ رنگ آمیزی سے کام لے تو پڑھنے والے کے لئے یہ تبدیلی عموماً خوش گوار ہوتی ہے - لکن شرط یہ ہے کہ ادبی اور شاعرانہ قوتوں کے صرف کے لئے لکھنے والے نے صحیح محل کا انتخاب کیا ہو - جس طرح اس سے پہلے بعض مثالوں سے واضح ہو چکا ہے اشک نے شاعرانہ تخیل کی رنگینیاں عموماً منظر نگاری کے موقعوں پر صرف کی ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ پڑھنے والا اس منظر سے کوئی واقعاتی تاثر قبول کرنے کے بجائے محض بے محل حسن تخیل کے دام میں اُلجھ کر رہ جاتا ہے - یہی صورت اس جگہ بھی پیش آئی ہے - اشک کی واقعہ نگاری میں واقعہ کے نقش مبہم اور شعریت کے نقش نسبتاً زیادہ نمایاں ہیں - اس کے برخلاف لکھنوی نسخے میں جو باتیں کہی گئی ہیں اُن سے بزم کا واضح تر تصور نظر کے سامنے آ جاتا ہے - اس خاص موقعے پر مؤلفین نے اپنے معمول اور عام رجحان کے خلاف سادگی کو رنگینی پر ترجیح دی ہے کہ محل کا تقاضا یہی ہے -

اس ٹکڑے میں ملکہ مہر نگار کے حسن و جمال اور غم و اندوہ کی جو مصوری کی گئی ہے اُس میں بھی لکھنوی مؤلفین اشک کے

مقابلے میں زیادہ کامیاب نظر آتے ہیں اس لئے کہ انہوں نے دونوں چیزوں کے اظہار کے لئے زیادہ موزوں الفاظ چنے اور صرف کئے ہیں - اُن کے بیان میں ان موقعوں پر بھی شاعرانہ تخیل کی رنگینی اعتدال کی حد سے آگے نہیں بڑھی - اشک یہاں بھی اعتدال اور توازن قائم نہیں رکھ سکے -

عبارت کے اگلے حصے میں منظر کی نوعیت بدل جاتی ہے - بزم سے برخاست ہو چکتی ہے تو ملکہ چھپر کھٹ پر جا لیٹتی ہے اور بے چینی سے کروٹیں بدلتے بدلتے سو جاتی ہے - امیر اس موقع کو غنیمت جان کر چھپر کھٹ کے قریب پہنچتے ہیں اور ملکہ کے لب لعلین کا بوسہ لینا چاہتے ہیں لیکن اُن کی کہنیاں پھسل جاتی ہیں - ملکہ جاگ اُٹھتی ہے - خوف سے چلاتی ہے خواصیں اکٹھی ہو جاتی ہیں - ملکہ انہیں حیلے سے رخصت کرتی ہے اتنے میں سپیدۂ سحر نمودار ہوتا ہے اور امیر بادل ناخواستہ محبوب سے رخصت ہوتے ہیں -

اس منظر کے مجموعی نقش میں کئی اجزا شامل ہیں - جب تک لکھنے والا اُن میں سے ہر جزو کو اُس کی اہمیت کے مطابق منظر میں صحیح جگہ نہ دے پڑھنے والے کے ذہن پر اس نقش کا خاطر خواہ اثر نا ممکن ہے - آئیے پہلے دیکھیں کہ اس منظر کے اہم اجزا کیا کیا ہیں :

(۱) امیر کے فراق میں ملکہ کے دل کی کیفیت

(۲) ملکہ کے حسن کو دیکھ کر امیر کے دل کی حالت

(۳) امیر کا اقدام اور اُن کی ناکامی

(۴) ملکہ کا اضطرار اور محبوب کے غیر متوقع قرب سے اُس کا جذباتی ہیجان -

(۵) امیر کی رخصت کے وقت امیر اور ملکہ کے دلوں کی کیفیت -

اس مقصد کے حصول کے لئے کہ اس طرح کا کوئی منظر قاری کے ذہن پر چھا جائے اور اُس کی آنکھوں میں اپنی نظر سے دیکھی ہوئی

یز کی طرح پھر جائے اور وہ اپنے آپ کو اُس تجربہ میں جو اس
نظر میں پیش کیا گیا ہے پوری طرح شریک کرسکے ضروری ہے کہ
کھنے والا منظر کے مختنف اجزا کی اُس قدر و اهمیت کا احساس کرسکے
و ان اجزا کو اس منظر کی تعمیر میں اپنی اپنی جگہ حاصل ہے،
ہ الفاظ کے موزوں انتخاب سے ان مختلف اجزا کی کڑیوں کو اس طرح
ربوط کرسکے کہ وہ الگ الگ ہو کر بھی ایک زنجیر کے الگ نہ
و سکنے والے ٹکڑے بن جائیں، وہ اُن کرداروں کے مزاج، منصب
ور شخصیت و کردار کو پوری طرح پہچانتا ہو جو اس منظر کی
وح رواں ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ قاری کے مذاق اور
سند سے اس حد تک آشنا ہو کہ ہر چیز کو اُسی کے سانچے میں
ھال سکے۔

لکھنوی مؤلفین کی عبارت کے مختلف ٹکڑوں میں جو ربط،
ھنگ اور موزونیت ہے اُس کا اندازہ تو دونوں نسخوں کے یہ ٹکڑے
ڑھ کر ہو ہی جاتا ہے۔ اب دونوں کے الگ الگ اجزا کو ایک
وسرے کے مقابل رکھ کر یہ اندازہ بھی کر لیجئے کہ وہ قصہ گوئی
کے منصب، کرداروں کے مزاج اور قاری کے مذاق کو کس حد تک
پہچانتے ہیں:

اشک کے نسخہ کی عبارتیں	لکھنوی نسخے کی عبارتیں
(۱) اور آپ (یعنی ملکہ) ایک باره دری میں جا کر چپرکھٹ جواہر نگار پر واسطے آرام کے لیٹی لیکن اشتیاق میں امیر کے نیند نہ آتی تھی۔ پڑی ہوئی کروٹیں لیتی تھی اور صاحب قراں کے تصور میں روتی تھی۔ جب گھڑی چار ایک رات باقی رہی اس وقت اسی خیال میں آنکھ جھپک گئی۔	(۱) ملکہ چپرکھٹ پر جا لیٹی۔ ہر چند کروٹیں لیتی مگر صاحب قراں کے خیال میں نیند نہ آتی۔ زار زار روتی جاتی، آخر روتے روتے تھک گئی۔ صاحب قراں نے دیکھا کہ ملکہ بھی سوگئی اور ہر عورت اپنے مقام پر جا کر سو رہی۔

اشک کے نسخہ کی عبارتیں

(۲) امیر نہایت خوش ہوئے۔ اندر اس بارہ دری کے گئے۔ دیکھیں تو پردے اس کے چاروں طرف کو پڑے ہوئے اور شمع ہائے مومی گل کاری کی ہرجا مانند آہ عاشقاں روشن ہیں اور چپر کھٹ میں مہر نگار سوتی ہے۔ لیکن اس کے روبرو تمام شمعوں کی روشنی پھکی معلوم ہوتی تھی۔ اور وہ مکان اس کے جمال سے مانند آفتاب کے منور تھا۔ امیر نے جی میں خیال کیا کہ ایسے معشوقوں کا وصال قسمت سے میسر ہوتا ہے۔ شاید پھر تیرے نصیب نہ ہو اب اس مکان میں تو بڑی محنت سے آیا ہے اس معشوق کے رخسارۂ برگ گل سے ایک بوسہ تو لے۔

(۳) یہ کہہ کر اس چپر کھٹ کے پاس گئے۔ برابر مہر نگار کے بیٹھ کر دونوں ہاتھ اپنے اس کے سر کے دونوں طرف تکیہ پر ٹیک دئے اور چاہا کہ جھک کر اس کے لب لعل سے بوسہ لے، لیکن ابتدائے عشق تھا اور

لکھنوی نسخے کی عبارتیں

(۲) (امیر) سیڑھیوں کی راہ سے بام قصر سے نیچے اترے۔ دبے پاؤں ملکہ کے چپر کھٹ کے پاس گئے۔ دیکھا کہ ملکہ سو رہی ہے، مگر چشم انتظار کھلی ہے ؎

آنکھیں کھلی ہوئی ہیں عجب خواب ناز ہے
فتنہ تو سو گیا ہے، در فتنہ باز ہے

دیر تک روئے منور کو دیکھا کئے۔ دل میں سوچا کئے کہ بڑی محنت سے یہاں تک پہنچا ہے کمال تکلیف اٹھا کے یہ قرب نصیب ہوا ہے۔

(۳) کسی حیلے سے صاحب قران نے اپنے دونوں ہاتھ گل تکیوں پر رکھے۔ چاہا کہ اُس کے لب شیریں کو چومیں اور رخسار تاباں کا بوسہ لیں، ہاتھ تکیوں سے پھسل گئے۔ ملکہ کی چھاتیوں سے لگ گئے۔

ناکردہ کار، ھاتھ امیر کا تکیے
سے پھسل گیا ۔ چھاتی پر اس
معشوق کی پڑے،،

(۴) مہر نگار نے امیر کو نکالا اور
اپنے برابر بٹھلایا اول مرتبہ
امیر کو دور سے دیکھا تھا ۔
اب نزدیک سے دیکھا کہ
عجب طرح کا جوان ، زیبا
صورت و پاکیزہ سیرت ھے ۔
مانند شب چاردہ کے ، نور
رخسار اس کے کا ، چاند کی
صورت اس شب تیرہ کو
روشن کر رھا تھا ۔ صاحب
قران کی صورت کو دیکھ
کر مثال تصویر کے حیران
رہ گئی ۔ امیر بھی اس نگار
کو دیکھ کر دیوانہ وار
تک رہے تھے ۔

(۴) صاحب قران خواصوں کے جاتے ھی
نیچے سے نکل کر اوپر آئے ،
ملکہ مہر نگار کے برابر
آئے ۔ ملکہ نے دن کو تو
دور سے نظارہ کیا تھا اب
جو پاس سے دیکھا اور بھی
غش کر گئی ، ھوش سے
گزر گئی ۔ صاحب قراں نے
منہ سے منہ ملا ۔ اپنی بو
جو سنگھائی تھوڑی دیر کے
کے بعد ھوش میں آئی ۔

(۵) سفیدہ سحر کا نمودار ھوا ۔
امیر مانند شبنم کے جو
برگ گل پر ھوتی ھے
آنکھوں میں آنسو بھر لائے
اور کہا ،،اے مہر نگار!
جو تو نے میرے آھوئے دل
کو کمند ناز سے گرفتار کیا
ھے ۔ اس صید زخم زدۂ
عشق کو بسمل نہ چھوڑنا ۔
اب رخصت ھوتا ھوں ۔

(۵) اتنے میں سپیدہ صبح نمو دار
ھوا ۔ صاحب قران نے مانند
شبنم اپنی چشم نرگس میں
اشک بھر کے کہا ،،اے
جان! خدا حافظ ھے ۔ اب
کشندۂ علقمۂ خیبری ٹھہر
نہیں سکتا ھے ۔ کہ خوف
افشائے راز کا ھے.........مگر
اس بسمل خنجر ناز کو
بھول نہ جانا ۔ مبتلائے فراق
کو دل سے نہ بھلانا ۔

لکھنوی نسخے کی عبارتیں

ملکہ نے ایک آہ سرد
کھینچی اور آبدیدہ ہو کر
بولی کہ دیکھئے اتنا دن
کیوں کر بسر ہوتا ہے۔
کس طرح مطمئن دل مضطر
ہوتا ہے۔ اچھا خدا کو
سپرد کیا، اللہ کی امان
میں دیا ؎

بس اب آپ تشریف لے جائے
جو گزرے گی ہم پر گزر جائے گی
طبیعت کو ہوگا قلق تھوڑی دیر
ٹھہرتے ٹھہرتے ٹھہر جائے گی

اس کے بعد امیر رخصت ہوئے۔

پہلے ٹکڑے میں لکھنوی مؤلفین نے اختصار سے وہی مقصد حاصل کر لیا ہے جو اشک نے بات کو نسبتاً پھیلا کر حاصل کیا ہے۔ دوسرے ٹکڑے میں اشک نے جو تفصیلات استعمال کی ہیں وہ واقعہ نگاری کے لحاظ سے بے محل اور کردار نگاری کے نقطۂ نظر سے ناموزوں ہیں اس لئے کہ منظر کا طول قاری کے ذہن کو بھٹکاتا اور صاحب قران کے زبان سے جو کچھ کہلوایا گیا ہے وہ ان کے اعلی منصب کو گراتا ہے۔ لکھنوی نسخے میں ان دونوں چیزوں کے ذکر میں اختصار برتا گیا ہے، الفاظ کی رنگینی کے بجائے سادگی سے کام لیا گیا ہے اور عبارت کی سادگی کی کمی ایک اچھے اور برمحل شعر سے پوری کی گئی ہے۔ تیسرے ٹکڑے میں لکھنوی نسخے میں جس اختصار سے کام لیا گیا ہے اس سے منظر بھی زیادہ واضح اور حقیقی بن جاتا ہے اور امیر کے کردار میں جو غیر اہم اور غیر واقعاتی تفصیل ہے وہ بھی باقی نہیں رہتی۔ چوتھے ٹکڑے میں بھی لکھنوی مؤلفین نے غیر ضروری اور غیر اہم تفصیلات ترک کی ہیں اور ان کے بجائے دو جملوں کا اضافہ کر کے تصویر کو زیادہ حقیقی اور رومان انگیز بنا دیا ہے۔

پانچواں ٹکڑا اشک کے یہاں مختصر اور لکھنوی نسخے میں طویل ہے۔ طوالت کی کئی وجہیں ہیں۔ لکھنوی مؤلفین اس ٹکڑے کو زیادہ جذباتی اور نفسیاتی اعتبار سے زیادہ حقیقی بنانا چاہتے تھے۔ اشک کے نسخے میں ملکہ مہر نگار کے جذبات کے ذکر کو نظر انداز کرکے مؤلف نے جو غلطی کی ہے اس کی تلافی ضروری سمجھتے تھے اور ساتھ ہی فن کے اس منصب کی تکمیل بھی ضروری جانتے تھے کہ منظر کی ابتدا کی طرح اس کا خاتمہ بھی گہرے اور دیرپا نقش اور تاثر کا حامل بن سکے۔ ملکہ کے الفاظ، اس کی زبان سے نکلے ہوئے دو بر محل سادہ اور پر معنی شعر اور یہ جملہ کہ اس کے بعد امیر رخصت ہوئے نقش اور تاثر کو گہرا اور یقینی بنانے کے ضامن ہیں۔

اشک اور لکھنؤ والے داستان امیر حمزہ کے مختلف ٹکڑوں کا مقابلہ کرنے کے بعد جو جو نتیجے ہمارے سامنے آئے انہیں یکجا کرکے دیکھا جائے تو دونوں نسخوں میں بنیادی طور پر دو امتیازی فرق نظر آتے ہیں۔ ایک فرق طرز بیان اور اسلوب نگارش سے تعلق رکھتا ہے اور دوسرے کا تعلق قصہ گوئی کے مختلف عناصر سے ہے۔ ان دونوں بنیادی امتیازات کا تجزیہ کیا جائے تو دونوں کے ضمن میں اور بے شمار فرق پڑھنے والے کو محسوس ہوتے ہیں۔ لیکن ان تفصیلات سے قطع نظر اشک اور لکھنوی نسخے کے بنیادی امتیازات کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ نتیجہ نکالنے میں کوئی تامل نہیں ہوتا کہ لکھنوی مؤلفین نے اشک کے نسخے پر نظرثانی کرتے وقت اُسے ہر لحاظ سے قاری کے لئے دلچسپ اور دلنشین بنانے کو اپنا فنی منصب جانا ہے۔ لکھنوی مؤلفین میں سے ایک (یعنی شیخ تصدق حسین) اپنے عہد کے مشہور داستان گو ہیں اور بڑی داستان امیر حمزہ کی چھیالیس جلدوں کے ترجمہ اور تصنیف میں سب سے زیادہ حصہ انہیں کا ہے۔ ایک ماہر داستان گو ہونے کی حیثیت سے اُنہیں اندازہ ہے کہ داستان میں واقعہ نگاری، منظر کشی، کردار نگاری اور لطف بیان کے اعتبار سے کیا کیا چیزیں ایسی ہو سکتی ہیں جو پڑھنے والوں کی نظر میں اُسے زیادہ سے زیادہ پسندیدہ بناسکیں۔ چنانچہ اُنہوں نے اشک کے متن پر نظر ثانی کرتے وقت اُس کے ایک ایک لفظ کو توجہ کا مرکز بنایا ہے اور ترتیب میں تقدم و تاخر کرکے، متن

کی جزئیات میں بھی حسب ضرورت اور حسب موقع کمی بیشی کرکے اسے ایسی صورت دی ہے کہ بعض اوقات اصل تالیف اور ترمیم شدہ نسخے میں زمین آسمان کا فرق معلوم ہوتا ہے اور کہیں کہیں تو یہ شبہ بھی ہوتا ہے کہ دونوں بنیادی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں ۔ اتنا بڑا فرق یقیناً مصنفوں کے نقطۂ نظر کے اس فرق کی وجہ سے پیدا ہوا ہے جو اپنے فن کی طرف سے انہوں نے اختیار کیا ہے ۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ لکھنوی مؤلفین کا نقطۂ نظر ہر جگہ فن اور اس کے تقاضوں کا پابند رہا ہے اور اس نقطۂ نظر نے اشک کی بظاہر سیدھی سادی تالیف کو ایسا فنی کارنامہ بنادیا ہے کہ اسے اور داستانوں کی تاریخ میں ہمیشہ ایک امتیازی حیثیت حاصل رہے گی ۔

تبصرہ

لطائف السعادت ، مصنف انشا اللہ خاں انشا ، مرتب ڈاکٹر آمنہ
خاتون ایم اے ، پی ایچ ڈی (علیگ) ، مہاراجہ کالج میسور ،
مطبع کوثر پریس بنگلور۔

طبع اول ۱۹۵۵ ، ضخامت ۱۸۰ صفحات ، قیمت ۵ روپیہ۔

نمبر ۱۳۹۱ فسٹ عیدگاہ میسور کے پتہ سے مل سکتی ہے۔

انشا اللہ خاں انشا کے بارے میں بیتاب کا یہ قول مشہور ہے کہ ان کے فضل و کمال کو شاعری نے اور شاعری کو نواب سعادت علی خاں کی صحبت نے ڈبو دیا۔ دریائے لطافت کے مقدمہ میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے اس فقرے کے آخری حصہ سے تو اتفاق کیا ہے لیکن یہ تسلیم کرنے میں انہیں تامل ہے کہ شاعری کسی کے فضل و کمال کو ڈبو سکتی ہے۔ لیکن جس قسم کی شاعری انشا نے خاص طور پر اپنی زندگی کے اس آخری حصے میں کی جو لکھنؤ میں گذرا اسے سامنے رکھیں تو یہ قول بھی درست معلوم ہوتا ہے۔ انشا کی فطری ذہانت طباعی اور نکتہ آفرینی ، ان کے علم و فضل اور ہمہ دانی پر تذکرہ نگاروں نے اتفاق کیا ہے لیکن ان کی شاعری کا وہ حصہ جو لکھنؤ کے نوابی دربار کا مرہون منت ہے اُن کے لئے واقعی باعث شرم ہے۔ اس میں ریختی ، فحاشی ، ہجو گوئی سب کچھ ہے لیکن بعض لوگ اسکی ذمہ داری سعادت علی خاں کی بجائے خود انشا پر ڈالتے ہیں اور مولوی عبدالحق صاحب کا تو خیال ہے کہ نواب سے جو رنجش آخر میں ہوئی اس کی وجہ یہ تھی کہ انشا حد سے آگے بڑھ گئے تھے بلکہ نواب کے مذاق میں جو پستی آئی تھی اس کی ذمہ داری اُن کے مصاحبوں اور درباریوں پر عائد کرتے ہیں ،

لطائف السعادت کی اشاعت سے انشا اور دربار لکھنؤ کے اثرات کے باب میں ہمیں یقینی شہادت ملتی ہے۔ انشا نے نواب سعادت علی

خاں کے دربار میں پیش آنے والے ۵۵ متفرق لطائف نواب صاحب کی فرمائش پر فارسی میں قلمبند کئے تھے۔ اس کا قلمی نسخہ برٹش میوزیم میں موجود تھا۔ ڈاکٹر آمنہ خاتون نے جو اس سے پہلے انشا کی دریائے لطافت کو مرتب و مدون کرکے علی گڈھ سے ڈاکٹریٹ لے چکی ھیں برٹش میوزیم والے نسخہ کی روٹو گراف کاپی سے یہ نسخہ مرتب و مدون کیا ھے۔ ایک صفحے پر اصل فارسی عبارت اور اس کے بالمقابل اردو ترجمہ دیا گیا ھے اور اصل کتاب سے متعلق مفید حاشیے بھی شامل کئے گئے ھیں۔

ان لطائف کے پڑھنے کے بعد یقین ھوجاتا ھے کہ سعادت علی خاں کی طبیعت میں ایسا چھچھورا پن تھا جو کسی مشرقی حکمران کے شایان شان معلوم نہیں ھوتا۔ ان کی محفلوں اور مجلسوں میں بیہودہ مذاق اور فقرے بازیاں ھوتی تھیں جن میں نواب اور ان کے مصاحبین جی کھول کر حصہ لیتے تھے۔ اس سے ایک طرف اس نوابی دربار کا وہ ماحول سامنے آ جاتا ھے جو لکھنؤی شاعری کے زوال کا باعث ھے اور دوسرے یہ بات سمجھ میں آ جاتی ھے کہ دھلوی شاعری کی روایات لکھنؤ پہنچ کر کیوں نہ پنپ سکیں۔

ترجمہ لفظی ھے۔ اس سے کہیں کہیں مطلب خبط ھو جاتا ھے۔ اگر لفظی ترجمہ پر سختی سے عملدرآمد نہ ھوتا تو بہتر تھا۔ کتاب میں طباعت کی بہت غلطیاں ھیں اور آخر میں غلط نامہ شامل ھونے کے باوجود بہت سی اور غلطیاں رہ گئی ھیں، اس طرح کے تحقیقی مقالات و تصانیف میں یہ بات بہت کھٹکتی ھے۔ بعض اور تحقیقی پہلو بھی ذرا کمزور ھو گئے ھیں مثلاً قتیل کے فارسی رقعات طبع ھو چکے ھیں اس لئے قلمی نسخہ سے حوالے کی ضرورت صرف اس صورت میں پیش آ سکتی تھی جب مطبوعہ نسخے سے اختلاف ھوتا محض قلمی نسخہ کے حوالہ سے حوالہ کی اھمیت میں کوئی اضافہ نہیں ھوتا۔ مرتبہ نے بعض ایسی بحثیں چھیڑ دی ھیں اور ان کو طول دیا ھے جن کا کوئی محل نہ تھا، شیفتہ کے بارے میں انہوں نے باطن کا نقطہ نظر اختیار کیا ھے اور شیفتہ کی رائے کے وزن و وقار اور توازن سے انکار کرنے میں بڑی شدت اختیار کی ھے۔ قاضی

عبدالودود صاحب سے بعض اختلافات کے جواب دینے میں بھی یہی رویہ اختیار کیا ہے ۔ اگر اختلاف میں اس شدت کا اظہار نہ ہوتا تو بہتر تھا ۔ سب سے زیادہ جو بات کھٹکتی ہے وہ مؤلفہ کی ایک اور تصنیف تحقیقی نوادر کا اشتہار ہے جو چھ صفحوں پر پھیلا ہوا ہے ۔ ایسی علمی اور تحقیقی کتاب میں اس کا کیا موقع تھا ۔

بحیثیت مجموعی موصوفہ کی یہ کوشش قابل قدر ہے ۔ اس طرح اردو کی نادر اور نایاب تصانیف کی تدوین و اشاعت کی روایت کو تقویت پہنچتی ہے جسے اردو کے حق میں ایک نیک فال سمجھنا چاہئے ۔ خاص طور پر بھارت میں ایسے ہی کاموں سے اردو کے فروغ اور اس کے مستقبل کے امکانات وابستہ ہیں ۔ انشا کے ہم عصر اور ہم پیالہ و ہم نوالہ دوست سعادت یار خاں رنگین کا بھی اسی طرح کا ایک مجموعہ اخبار رنگین موجود ہے جس میں انہوں نے اپنے زمانے کے حالات و واقعات کو بطور روزنامچہ لکھا ہے ۔ ڈاکٹر صابر علی خان جنہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے میری نگرانی میں اردو میں پہلی پی ایچ ڈی کی ڈگری رنگین اور ان کی تصانیف پر لی ہے اسے مرتب اور شائع کر رہے ہیں امید ہے کہ اس کی اشاعت کے بعد لطائف السعادت اور اخبار رنگین کے تقابلی مطالعہ سے نہ صرف اس عہد کے حالات و واقعات کے بارے میں نئی معلومات حاصل ہوں گی بلکہ خود انشا اور رنگین کے مرتبہ کے تعین میں بھی آسانی ہو جائے گی ۔

ابواللیث صدیقی

فخرالملک خواجہ عمیدالدین تونکی

ارمغان پاک مرتبہ شیخ محمد اکرام میں جو ایم - اے فارسی کے نصاب میں شامل ہے فخرالملک خواجہ عمید الدین تونکی کے کلام سے بھی کچھ انتخابات لئے گئے ہیں - مجھے خواجہ عمید کی نسبت کے متعلق کچھ تردّد تھا - چنانچہ میں نے استاد محترم پروفیسر ڈاکٹر محمد شفیع صاحب سے استمداد کی - میری درخواست کے جواب میں انہوں نے تونکی پر دو نوٹ لکھ کر مجھے بھیجے - ان کے فوائد کے پیش نظر میں نے مناسب خیال کیا کہ ان کو فائدہ عام کی غرض سے میگزین میں شائع کر دیا جائے -

مدیر

عزیزم

ارمغان پاک (ص ۳۰ بعد) میں امیر فخرالدین عمید نونکی کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ منتخب التواریخ بداونی جلد اول ص ۹۶ ببعد سے لیا ہے - بداونی نے منتخب التواریخ میں اس شاعر کے کلام سے کوئی ۳۰ صفحے رنگ دیئے ہیں اس عذر کے ساتھ کہ اس کے اشعار عزیز الوجود ہیں اس لئے اس کا جو کلام ملتا ہے وہ نقل کرنا ضروری ہے -

اب رہے آپ کے دو سوال کہ عمید الدین کی نسبت نونکی ہے یا لومکی؟ بداونی کے نسخہ مطبوعہ کلکتہ میں عمید کی نسبت کو دو طرح سے چھاپا گیا ہے: ص ۷۰ پر 'تولکی' 'ص ۹۶ پر 'نونکی' - میرے پاس بداؤنی کا قلمی نسخہ ہے اس میں دونوں مقامات پر اس کو لویکی لکھا ہے - یہ تین نسبتیں ہوئیں: تولکی، نونکی اور لویکی - مجمع الفصحاء ۱ : ۳۵۳ پر اس شاعر کی چند اور نسبتیں بھی دی ہیں جن سے پہلی تین نسبتوں پر چار نسبتیں اور بڑھائی جاسکتی ہیں یعنی دیلمی، سنامی، گیلانی اور لومکی - مجمع الفصحاء کی عبارت یہ ہے : عمید دیلمی و هو فخر الملک خواجه عمید الدین گویند نه از دیلم رشت است و از هندوستانست و منشأش سنّام بوده و مدّاحی سلطان محمد یمین (کذا) مینموده و بعضی او را چنانکه اشارتی شد از اهل گیلان من بلاد دارالمرز و طبرستان دانند، همانا از گیلان بوده و بهندوستان رفته و دیالمه اهل آنولایت را گویند، وی را عمید لومکی هم نامند سبب آن معلوم نشده،،

ظاہر ہے کہ خواجہ عمید الدین اگر کسی شہر کی طرف منسوب ہے تو اس شہر کا اب پتہ نہیں لگتا - سمعانی، ذہبی، سیوطی نے اس قسم کی کوئی نسبت نہیں دی اور نخبة الدهر دمشقی، نزهة القلوب، جغرافیه مفصل ایران اور فرهنگ آنند راج میں بھی ایسی کوئی نسبت درج نہیں - معلوم نہیں کہ روز روشن ص۵۷۲ نے کس بنا پر لکھ دیا ہے: ''عمید از

سر زمین لویک که شهریست در ملک ایران بوده'' یه عبارت میرے نسخه بداونی کے 'لویکی' کی تائید کرتی ہے اگرچه اس لویک کا پته اوپر کے مآخذ کے علاوہ بیہقی ، طبقات ناصری ، بداونی ، اور اکبر نامهٔ ابوالفضل سے بھی نہیں ملتا ۔ ڈاکٹر اقبال حسین (کٹک) کی (Early Poets of India) ص ۲۰۰ سے معلوم ہوتا ہے که تقی اوحدی نے لکھا ہے که عمید سنام میں پیدا ہوا ۔ اس لئے وہ سنامی ہوا ، دوسری نسبتیں شاید اس کے آباء کے وطن کی طرف توجه دلاتی ہیں مگر ممکن ہے یه نسبت سمام کی طرف نه ہو کسی اور چیز کی طرف ہو ۔ نونه، ماہی اور چاهک زنخ کودک کو بھی کہتے ہیں (آنند راج)، لُوَیّ ایک درخت ہے اور لِوَیّ گیاہ خشک پرمرده کو بھی کہتے ہیں (منتہی‌الارب)، بہرحال جب تک کوئی ایسے مآخذ نه ملیں جن سے اس نسبت کی تشریح ہوسکے صرف قیاس آرائی ہی ممکن ہے ۔ اس میں شک نہیں که بداونی والی نسبتوں میں سے 'تولکی' اقرب الی الفہم ہے مگر یه نسبت سوائے طبع سدہ بداونی کے اور کہیں نظر نہیں آئی ۔ اور عجب نہیں که تصحیح قیاسی ہو ، اس لئے که قلمی نسخے میں نہیں ہے ۔

آپ کا دوسرا سوال یه ہے که عمد نونکی خواجه عمید الدین سنامی ہی ہے یا کوئی اور؟ سطور بالا سے ظاہر ہے که امیر فخر الدین عمید وہی شخص ہے جس کو نونکی ، لومکی اور سنامی وغیرہ کہا گیا ہے ۔ ارمغان پاک میں ص ۳۱ پر عبید چھپا ہے مگر بداونی جلد اول ص ۱۲۶ پر عمید ہی ہے اور میرے خطی نسخه میں بھی عمید ہے اس لئے اس 'عبید' کو سہو کاتب ہی سمجھئے ۔

کل کے نوٹ کے سلسلے میں یه امر قابل ذکر ہے که منتخب التواریخ کے اس قلمی نسخه میں جو پنجاب یونیورسٹی میں موجود ہے اور جو غالباً اسی کاتب کا لکھا ہوا ہے جس نے میرا نسخه تیرھویں صدی هجری میں لکھا تھا جابجا 'لویکی' لکھا ہے ۔ منتخب التواریخ بداونی ۱۲۸۴ھ = ۱۸۸۴ع میں لکھنؤ میں بھی چھپی تھی ۔ اس کے ص ۲۱ اور ۲۷ پر عمید لونکی لکھا ہے جس

کو بظاہر لومکی یا لویکی دونوں طرح پڑھ سکتے ھیں - اسی اڈیشن کے ص ۲۷ پر 'کردہ ام' والے قصیدے میں تخلص 'عمید' ھی ھے نہ کہ 'عبید' - نزھہ الخواطر نے (بتقلید نسخۂ بداونی) ۱:۱۸۷ پر النونکی لکھا ھے مگر قصیدہ مذکور میں 'عمید' ھی درج کیا ھے -

ڈارن (Dorn) روسی نے مرعشی کی تاریخ طبرستان و رویان و مازندران ۱۲۶۶ھ ۱۸۵۰ع میں چھاپی تھی - اس میں ایک 'قریۂ لاویج' مذکور ھے جس کے کتاب میں پانچ حوالے دیے ھیں - اگر 'عمید' کے بزرگ واقعی دیلم یا گیلان کے تھے تو ممکن ھے کہ لاویج (= لاویک = لویک) ان کی بستی کا نام ھو - گو یہ بعید سی بات معلوم ھوتی ھے مگر کوئی اور نام جو عمید کی نسبت سے قریب تر ھو مجھ کو اس کتاب میں یا تاریخ گیلان فومنی میں یا کسی اور مأخذ میں نہیں ملا -

مزید یہ کہ مجمع النفائس آرزو (نسخۂ دانش گاہ پنجاب صفحہ ۵۷م) میں عمید الدین دیلمی اللوبکی (بالباء) لکھا ھے ! آرزو نے اس کا لقب اوروں کی طرح فخر الملک لکھا ھے اور اس کو اعاظم حکماء سے بتایا ھے اور کہا ھے کہ ''وہ (مولدو) منسا کے رو سے سنام کا تھا، اس کے آبا و اجداد ظاھرا دیالمہ سے ھوں گے''- اللوبکی غالباً تصحیف اللویکی ھے لیکن اگر یہ صحیح ھے تو یہ آٹھویں صورت عمید کی نسبت کی ھوئی !

محمد شفیع

محمد علی خان متین پسر حسام‌الدین متوطن کشمیر در تذکرهٔ خود این بیت شاه آفرین را باندک تغیر مطلع کرده بنام خویش نوشته ـ

در مشربے که مائیم آلوده دامنیٔ نیست
ساغر بکف چو تصویر رندیم و پارسائیم

حال آنکه این فقیر سی سال* پیش ازیں بت مذکوره در دیوان مرحوم دیده و در سخن فهمان لاهور بیت مذکور بنام شاه مرحوم اشتهار تمام دارد ـ

اشعار شاه فقیرالله آفریں انتخاب زدهٔ
سراج الدین علی خان آرزو

بسا کفرے که دارد فیض ایمان عشق میداند
خط کافر مسلمان میکند حسن فرنگش را

وله

ز شوخی کز جهان برهمزدن گلها ز ناز آید
امید داد(۱) باشد برق خرمن داد خواهان را

وله

خوشا دورے که در عالم ایازے بود و محمودے
وفا عنقا محبت کیمیا شد در زمان ما

وله

دل قبله و نیاز نماز دوام ما
گر دانـدن رخ است ز دنیـا سلام مـا

وله

مـا تنگ قسمتـان ز دهانش بخط خوشیم
چون روزه دار صبح امیـد است شـام مـا

---

*ترتیب میں نے بدل دی ہے - اصل میں پیش ازیں "بسی سال" یا "سی سال" ہے -

(۱) مجمع النفائس نسخه الف : زاد بجائے داد -

ولہ

تمام سعی است لیک غافل کہ مے بجامش کنند یاخون
دریں تمنا کہ شیشہ گردد چہا کہ نگداخت سنگ خارا

ولہ

سوختیم از بس بیاد آسمان گوں نرگسش
موج نیلوفر زند چوں مے در آتش خون ما

ولہ

شدم محو تصور بسکہ حسن بے مثالش را
دلے دیگر بود ہر قطرۂ خونم خیالش را

ولہ

لطافت این قدر در گلشن امکان نمی باشد
کہ باشد سایہ محو از حوش رعنائی نہالش را

ولہ

در دہر بسکہ ریشہ دود حیا بجا ترا
جان کندنست کندن دل زین سرا ترا

ولہ

سرو جنت بر لب کوثر خوش است
جا بچشم پاک می زیبد ترا

ولہ

برسم امتحان گر در پس آئینہ جا گیرد
سمندر مے کند آں آتشیں رخسار طوطی را

ولہ

کوہ کن بودن و مجنوں گشتن
کار شوقست نہ کار من و تست

ولہ

نہ ہمیں ہالۂ ماہ دورہ داماں از تست
دست در گردن خورشید گریباں از تست

ولہ

داری ہوائے مشق جنون آفریں ہنوز
کز گرد باد در کف خاک تو خامہ ایست

ولہ

خوشم بہ تنگیٔ عشق تو ، دور دیدۂ بد
بخلوتے کہ کسے راہ نیافت تنہائی است

ولہ

پختہ کے خواہد شدن سودائے خام عاشقان
مصلحت بینے کہ دل نام است خود دیوانہ است

ولہ

آفرین در ترک دنیا این قدر تاخیر چیست
جنبش یک آستین یا پشت پائے بیش نیست

ولہ

جوہر خود تیغ عریان را نہفتن رسم نیست
عشق بالا دست خود فاش است گفتن رسم نیست

ولہ

گرچہ خاموش ست با چندین زبان گویاست بید
گفتن راز جنون منع و نہفتن رسم نیست

ولہ

زوال عمر خوش آید نہ تنگیٔ قسمت
کہ روز کم چو شود مفت روزہ دارانست

ولہ

ما را ببوسہ می دہد آن یار تازہ خط
آبے کہ خضر در ظلماتش ندیدہ است

ولہ

بپاکیٔ نظرم عشق می خورد سوگند
خیال روئے تو کردن ہنوز بے ادبی است

ولہ

در طریق عشق شیریں کار جائے حرف نیست
کوہ کن ننوشتہ مکتوبے ز جوئے شیر داشت

ولہ

زحمت اگر ہست کشاد پر و بالے
در بیضہ چو گل صید تو در چنگل بازست

ولہ

خطرہا ست ہر چند در راہ عشق
چو ہمت کمر بست خواہیم رفت

ولہ

از ہجوم جلوہ چوں خورشید روپوس خودست
شیشۂ ایں بادہ پنداری کف جوس خود است

ولہ

تا انتہائے کار من و روزگار چیست
نے از زمانہ مردمی و نہ ز من لجاج

ولہ

رو داری از آئینہ بہر وجہ محال است
جز صدق نمی آید از اصحاب صفا ہیچ

ولہ

عاشق بےتاب از یک جلوہ نتواں رام کرد
صید این پروانہ را باید چراغاں رام کرد

ولہ

آفرین دستے کہ وا می کرد آں بند قبا
حلقہ امشب بر در چاک گریباں می زند

ولہ

ز دنیا چشم ہمت بست دل وارستہ از غم شد
نظر پوشیدنی زخم مرا چوں دیدہ مرہم شد

ولہ

تا چشم کنم باز شب وصل سحر بود
عمر گذراں بر سر انصاف نیامد

ولہ

اے راحت اغیار مرا کاهش جاں چند
عاشورهٔ ما بودن و عید دگراں چند

ولہ

ایزد چو جلوه زیب نہال تو آفرید
مانند من بسینه قیامت الف کشید

ولہ

ز نفیٔ خویش شبنم آفتاب و قطره دریا شد
اگر از خود برآئی آنچه نتوانی ، توانی شد

ولہ

ایکه پیراهن از اندام تو یوسف شده است
بے توام تنگیٔ دل چند به زنداں دارد

ولہ

کامل کجا مقید اسباب مے شود
بے نردباں مسیح ببام فلک رسید

ولہ

از حسن نیمرنگ تو اے ساقیٔ بہار
نظاره شیر مست گل ماهتاب شد

ولہ

ز رویٔ تعظیم اگر عزیزاں بسر نشانند، جاش دارد
کسے که چوں گل دریں گلستاں شگفته روئی معاش دارد

ولہ

امشب گل رویٔ که مرا باغ نظر بود
در هر مژه برهم زدنے سیر دگر بود

ولہ

صحرائے طلب کاغذ آتش زدہ دیدم
هر سوخته جان دامن وحشت بکمر بود

ولہ

عزّتے نیست هنرمند حوادث زده را
هست ببقدر چو آن نسخه که ابتر باشد

ولہ

رگ جان میزند بال طپیدن در تمنایش
تبے چون شرر گرمم آفرین در استخوان باشد

ولہ

ز حسن خلق خوش آسوده باشد آفرین ما
که از وضع ملایم بالش پر زیر سر دارد

ولہ

می فزاید ظلمت دل صحت افسردگان
چو زمستان بیشتر گردد شود شبها بلند

ولہ

کجا رفتی که قربانگاه کردی بزم عیشم را
ز جوش اشک خونیں حلق بسمل آستینم شد

ولہ

بسکه بے روئے تو باعیشم کدورت یار شد
خنده گرد آلوده تر از رخنۂ دیوار شد

ولہ

یکے ادا نشود با هزار عمر ابد
اگر بقدر جفا ها وفا توانی کرد

ولہ

دیگر ز بے نیازی از آزادگان مپرس
دامان وصل گر بکف افتد رها کنند

ولہ

کسے کو قصر دیں را فکر بر پا ساختن دارد
بیاد کربلا خاکے بسر انداختن دارد

ولہ

عشق و تشریف ہم آغوشی معشوق محال
حسرتے چند بہم آور و افغاں بردار

ولہ

از بدمعاش مردم ایں دھر آفرین
خوست گر کنارہ گرفتی، کنارہ تر

ولہ

دومو گشتی و بر روئے تو گفتند
ز برھم خوردن روز و شب عمر

ولہ

تا جگر خون نکند سیر گلستان نکند
نشکند تا دل عاشق نزند گل بر سر

ولہ

سایہ سرو قدت محسر نازست ہنوز
جلوہ کن جلوہ شب فتنہ درازست ہنوز

ولہ

یکقلم لعل مخطّط پسران بے آبست
جز عقیق تو کہ لب تشنہ نوازست ہنوز

ولہ

پیچیدہ است نور نظر ہائے عاشقاں
چوں تار عنکبوت براں بام و در ہنوز

ولہ

شب کرا بود ببرنخل تو کاں سیب ذقن
گوئے چوگاں زدہ از گردش رنگست ہنوز

وله

ز بیم نازکی دزد نفس چون غنچه چشم من
بے فشاند بداماں نگاه تا گردی از پایش

وله

سمند فتنه زیں تا کرده نازش بهر نخچیرے
که از خونم سر انگشت حنائی داشت فتراکش

وله

نشاط عید نفس شوم اجر روزه مے داند
الهی توبه از جرمے که طاعت کرده ام نامش

وله

دست کسے که گیرد از پافتادهٔ را
باشد کلید جنت پنہاں در آستینش

وله

آتش نفس ز شعله و ژولیده مو ز دود
در بزم تست کاسه بکف چوں گدا چراغ

وله

امروز اگر نه پرسد چشم تو حال زارم
دست منت فردا در دامن تغافل

وله

اے مسلماناں حذر از صحبت ارباب جاه
جز شکست کعبهٔ دل ناید از اصحاب فیل

وله

تنگ شد آخر فضائے جلوه بر طغیان گل
ابر باشد یک کف سیلے خود از طوفان گل

وله

نگذاشتم ز صبح نشانے ز دود دل
کردم سیاه روز جهانی ز دود دل

ولہ

زکوٰۃ گنج بے پایان خوبی بوسۂ زان لب
اگر دایم نباشد گاہ گاہے آرزو دارم

ولہ

باشد طپش ہائے دلم آتش فروز جلوہ اش
گلبرگ شمع خود بود از سوختن پروانہ ام

ولہ

غم و نشاط من از تست چون گل رعنا
زین ہواست خزان و بہار گلزارم

ولہ

چرا نہ در صف رندان بے نوا باشم
چرا نہ سہر نیستان بوریا باشم

ولہ

قبلہ و قبلہ نمائے خویشم
من ہم از خود خبرے یافتہ ام

ولہ

ہمہ چو دود ز ما آفرین نظر پوشند
بفرق مردم اگر سایۂ ہما باشم

ولہ

یار ساقی بزم خالی از رقیب
ہر چہ بادا باد میخواہد دلم

ولہ

ہیچ نکشود آفریں از پیر عقل
از جنون ارشاد میخواہد دلم

ولہ

حظ نیست آفرین کہ ز دیوان حسن دوست
پروانۂ رسیدہ بتاکید بوسہ ام

وله

مرهم کافور را سیماب آتش دیده ساخت
داغها کز دوری احباب پیدا کرده ام

وله

هر چند که مهتاب صفا بخش نشاط است
بے نار پری چهره بود دیو سفیدم

وله

گریزانم ز جمشید و فریدون، بندهٔ عشقم
همیں یک حلقهٔ صاحبدلانرا حلقه در گوشم

وله

گل اندامے که در جیبم گل خمارہ مے ریزد
حمائل چوں گریباں مے کند دستے بهر گردن

وله

چرخ مے پرورد درنده چند
گلهٔ گرگ را سبا نست این

وله

چو روز این معنی پوشیده پیداست
تو شب باز و فلک ها پرده تست

وله

بموج باده عناں دادهٔ دریغ از تو
بکوچهٔ غلط افتادهٔ دریغ از نو

وله

فغاں که فرق سفید و سیاه هنوزت نیست
خطت دمید و هماں سادهٔ دریغ از تو

وله

از تب غم نا کشیدیم آتس افشاں نالهٔ
بر لب ما کرم سب نابست هر بخالهٔ

وله

اے خداوند دل درد گرفتارش ده
شبنم از خون جگر برگل رخسارش ده

وله

اوّلش مست جنون همحون من غمزده کن
بعد ازاں ره به پریخانهٔ دیدارش ده

وله

حیات ماست ساغر، دمبدم ساقی مئے نابے
نماند آسس ما زنده چوں یاقوت بے آبے

وله

هر قدرها که برانند مگس باز آید
خجلت از ذلت دنبا نکشد نفس دنی

وله

صورت دیوار هم هشیار شد
من هماں مست الستم[1] آفریں

وله

مرا ناخن بدل زد کج کلاهے
که هر مویش بود مژگاں سیاهے

وله

شد نوش لب تو یکقلم غارت نیش
تا روز سیاه خط ترا آمد پیش

وله

خط را متراش کم نخواهد کشتن
ایں سبزه ز آب تیغ مے بالد بیش[2]

---

۱ - اصل : بللی - تصحیح از مجمع النفائس الف -
۲ - مجمع النفائس ب : می گردد بجائے می بالد -

میر غلام علی آزاد

میر غلام علی آزاد سلمه الله تعالی - خان آرزو گوید - "میر غلام علی آزاد تخلص از فرزندان سید عبدالجلیل بلگرامی که عبدالجلیل تخلص میکرد - مرد فاضل و عالم بزیارت بیت الله فائز گردیده - از چند گاه در اورنگ آباد فروکش بوده - صوبه داران دکن خلے در تعظیم و توقیر او میکوشند - و سعادت دارین حاصل می نمایند با فقیر آرزو اخلاص غایبانه دارد - سابق از کمال شوق هندوی جوابے فرستاده - طلب اشعار و احوال فقیر نموده یک دو غزل فارسی و قصیده عربی در کمال بلاغت و فصاحت فرستاده بود - درینولا هندوی جوابے فرستاده سه جزو از غزلیات خود نوشته مشق سخنش رسیده تلاشهائے بالا دست دارد - چنانچه از اشعار که نوشته مے شود ظاهر است - گویند تذکرة الشعرای نوشته - درینولا نظر ثانی باز مے نویسد - انتهیٰ کلامه'

فقیر عبد الحکیم حاکم می گوید: سید معزی الیه را در ابتدا که قریب بیس سال یا زیاده بلاهور در صحبت شاه آفرین استاد خود دیده بود - درینولا که بقصد زیارت حرمین شریفین در اواخر رجب بشهر خجسته بنیاد وارد شد - مکرر بخدمتش رسیده، سبحان الله از خوبیها و اخلاق بزرگانه و فضل و کمال این بزرگوار چه نویسد - که بتحریر نمے آید - چون درآنوقت عزم (؟) مقصد اصلی بود - سه چهار روز مانده روانه سورت گردید - الحال که بعد حصول سعادت زیارت حرمین پانزدهم شهر جمادی الاول معاودت نموده مکرر بصحبتش رسیده مے شود - آن قدر ممنون و مرهون مروت و خلق حسن ایشان گردیده که حیرانست چه گوید - وچه نویسد خاندان او خاندان فضل و کمال بوده است - اکثر مردم بانواع قابلیت موصوف بود به دیوان عربی که دارند با آنکه فقیر از فهم آن قاصر است - لیکن ید بیضا است خوب، خوب، علما و فضلا را مثل آن دست نداده باشد - غزلیات فارسی نیز بچه شیرین زبانی گفته اند - و تلاشهائے بلند نموده نثری که در خزانه عامره تالیف تازه خود نوشته اند - اکثر فقراتش شنیده باشد، بے تصنّع که از نثر تذکره هائے بسیاری

اَعِزّہ صاحب سخن گوئے فصاحت ربودہ، با اینہمہ وضع فقرائے صاحبدل دارند ۔ اصلا بوئے خودی ازیں بزرگ خدا پرست نشنیدہ، با خلق بخلق و تواضع و کشادہ پیشانی پیش مے آیند ۔ و ہر قسم غربا و فقرا را از علو ہمت ذاتی و سخاوت اصلی و اخلاق عمیم خود مرہون و خوشنود می گردانند ۔ او سبحانہ، در گاہ بہ جمعیت و عافیت سلامت دارد ۔ چند نسخہ بفقیر و مہاں صاحب نور العین واقف عنایت کردہ اند و بہ مہمانداریہائے پیہم سیردن کام مفرمایند ۔

میر اولاد محمود برادر زادۂ ایشاں نیز چوں آں جواں بخت خلیق و خوش سلوک است طالب علمی درست دارد ۔ خدایش سلامت دارد ۔ قبل ازیں چند سال کہ فقیر از لاہور بجہاں آباد وارد شدہ ۔ روزے بخانۂ خان مغفور آرزوئے مرحوم اتفاق افتاد ۔ در ہماں ایام ہندوی ایشاں مع سہ جزو نقل برداشت و در نسخہ مسمی بانتخاب حاکم مرقوم نمود ۔ تا سال تحریر کہ یکہزار و یکصد و ہفتاد و پنج ہجریست ۔ در ہمیں شہر یعنی خجستہ بنیاد بخوبی و خوشی میگزرانند و جمیع اکابر چہ صوبہ دار و عہدہائے دیگر و عموم خلایق ہمہ معتقد کمال و اخلاق ایں عزیز بزرگ، و در خزانۂ عامرہ کہ در تسوید آں اشتغال دارند نوشتہ اند ۔ کہ حضرت لسان الغیب قدس سرہٗ سی صد و پنجاہ سال تخمیناً پیش ازیں بنام و تخلص فقیر ایما نمودہ و بعنایت بے نہایت بزبان عقیدتمند تکلم فرمود کہ ؎

فاش میگویم و از گفتۂ خود دلشادم بندہ عشقم از ہر دو جہاں آزادم

بندۂ عشق ترجمۂ غلام علی است چہ عشق عبارت از امیرالمومنین علیؓ باشد ۔ چنانچہ یکے از منقبت گویان سلف اشارہ میکند ؎

ہرچہ گویم عشق ازاں برتر بود عشق امیر المومنین حیدر بود

و حکیم رکنا مسیح کاشانی گوید ؎

علی باشد کسے کش عشق خوانی محبت تربت مستانۂ اوست

و فقیر در مقطع غزلے گوید ؎

(گرچہ غلام علی از ہمہ آزاد شد—فہم کن از نام او، بندۂ حیدر بود

ء نیز در مقطع غزل دیگر گوید ــه)
آزاد گرچه دام علائق گسسته است باشد غلام شاه ولایت پناه را
انتہی کلامہ ،

انتخاب میر آزاد سلمه الله تعالی که خان آرزو کرده

مرا از هیچکس گرد ملالے نیست بر خاطر
که طبع نازک من بر نمیدارد گرانی ها

ولہ

گر دماغ فقر داری گوشه گیری پیشه کن
از شکست پائے خود بشکن کلاه خویش را

ولہ

جفا جوئے که از خون دلم آلوده دامانرا
دل رنگین او باشد فشان شمشیر مژگانرا
چو خورشید قیامت از گریبان سربرون آرد
کف محتاج گردد سایبان بر سر کریمانرا

ولہ

از حرم آورد سوئے دیر هندوستان مرا
گردش چشم سیاحت کرد سرگردان مرا

ولہ

عیب مردم فاش کردن بدترین عیبها است
عیب گو اول کند بے پرده عیب خویش را

ولہ

ز ذوق بانگ الستند عارفان در وجد
سخن تمام شد و لذت سخن باقیست

ولہ

در کشور مانیست روا شب مژه بستن
با مردم خوابیده ستیزند عسس ها

ولہ

رتبۂ انجام در آغاز حاصل کردہ ایم
گلبن بستان ما چوں سمع گل در ریشہ داشت

ولہ

کار دانا نیست در ایام غم ناخوش شدن
وقت نرگس خوش کہ در فصل خزاں گیرد قدح

ولہ

سر کشی سرمایۂ نقصان دولت مے شود
نیشکر را بند بالا کم حلاوت میشود

ولہ

مریض را غم بالاتر از مرض اینست
کہ صبح صورت نحس طبیب باید دید

ولہ

نقش و نگار دنیا سیر بہشت دارد
اما چوپائے طاوس انجام زشت دارد

ولہ

قفل امید گدایاں از کلید التفات
گر جوانمردی کند وا فتح خیبر می کند

ولہ

نقشی است عجب دایرہ ہندی خطش
کز سایہ خورشید جمالش خبرم دارد

ولہ

در بیاباں جنوں گرم فغانم کردند
جرس قافلۂ ریگ روانم کردند

ولہ

خط، روشنیٔ حسن ترا بود حجابے
مقراض گل از شمع تو ہر چند بجا کرد

ولہ

زن بود در زبان هندی نار
و قنا ربنا عذاب النار

ولہ

تحفۂ شایستہ احباب از اقلیم فقر
گر نہ اس دست دعا بودے چه می برداشتم

ولہ

دیو هوا ، بسشه اگر بند کردۂ
آزاد حون حباب خراسے بر آب کن

ولہ

دریں عالم کہ همراہ موافق مںکند پیدا
نماید راست ار خضر و کلیم الله همراهی

انتخابے کہ مؤلّف از دیوان آزاد کرد

بر آر از مدّ بسم الله تیغ خوش مقالی را
مسخر کن سواد اعظم نازک خیالی را

ولہ

اے مست ناز گرد تو گستم عمر ها
بشکن توهم بگردش چشمی خمار ما

ولہ

شد سرنگوں بچاہ گریبان انفعال
بے دانشی کہ بست کمر بر عناد ما

ولہ

نیاز نقد هم با خویش دارد نعمت ایوان
صداعی هست در سامان اسباب ضیافتها

ولہ

گر نور سینہ نیست چہ حاصل ز نور چشم
بے شمع خانہ خاک بسر ماہ بام را

ولہ

کمند جاں بہ دل دوستان اسیرم کرد
وگرنہ صورت رم آفریدہ اند مرا

ولہ

ببیں دو مردمک یار و ابروئے خم را
کہ ریخت ایں دو کمان مہرہ خون عالم را

ولہ

خانہ ہا سوختی و ایں مردم
خا نہ آ با د گفتہ ا ند نر ا

ولہ

د عو ی عا شقی است د ر سر ما
داغ سود است مہر محضر ما
نقص عشق است رسم بیتابی
بر نخیزد سپند مجمر ما

ولہ

دماغ را ز مئے کہنہ تازگی بخشید
بہ پیر میکدہ بخت جواں رساند مرا

ولہ

ندانستند خوباں آہ قدر آلفت ما را
تلف کردند بے تقصیر حق خدمت ما را

ولہ

ز مہتاب حوادث چین بہ پیشانی نمنداز
تماشا مے تواں کردن کمان طاقت ما را

وله

نمکے بر جراحت زده اند (؟)
یکجهان سور کرده اند مرا

وله

در وصل سست لذت هنگامۀ فراق
پروانه رار شمع جدا میکسم ما

وله

نه تنها من بلا گردان آں شمع شب افروزم
حو فانوس حالی گرد او گردند محفلها

وله

خوامنم آه بر آرم سر مجلس فهمید
گفت آهسته مشو در پئے رسوائیٔ ما

وله

دارد بباغ نالۂ مستانه عندلیب
از دست شاخ گل زده پمانه عندلبب

وله

روز افزونست شب در هجر آں عالیجناب
سایه طولانی شود هنگام رفت آفتاب

فیض حق افزوں ز استعداد نتواں یافتن
سبرد هرکس بقدر ظرف خود از بحر آب

وله

من از حلاوت دشنام یار دانستم
که نام تلخی رنجنں چرا بود شکراب

وله

بر نمیدارم نظر یک لحظه از لعل لبت
آنچه میخواهم نو میدانی عنایت کردنیست

اورینٹل کالج میگزین

نومبر ۱۹۵۶ء

جلد ۳۳ عدد ۱

عدد مسلسل ۱۲۷

مدیر :—

ڈاکٹر سیّد عبداللہ

★

باہتمام مسٹر احسان الحق ہیڈ کلرک، یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور،
پرنٹر و پبلشر اورینٹل کالج میگزین، پنجاب یونیورسٹی پریس، لاہور
میں طبع ہو کر اورینٹل کالج لاہور سے شائع ہوا۔

ترتیب

---

۲۲۹ پنجاب یونیورسٹی پریس ، لاہور—۳۰۰—۵۷-۱-۲۳

ڈاکٹر نذیر احمد

تذکرۂ میخانہ کا ایک اہم مخطوطہ

تذکرۂ میخانہ فارسی کے بہترین تذکروں میں سے ہے، اس کا مولف مرزا عبدالنبی فخر الزمانی قزوینی ہے جس نے ۱۰۲۸ ہجری میں جہانگیر کے عہد سلطنت میں پٹنہ میں اسے مکمل کیا اور جس کو پروفیسر محمد شفیع نے نہایت اہتمام سے ایک مقدمہ، حواشی اور تتمہ حواشی کے ساتھ ۱۹۲۶ ہجری میں شائع کر دیا ہے۔ اس تذکرہ کے مخطوطے کمیاب ہیں۔ یورپ کے کتابخانوں کی فہرست میں اس کا ذکر[1] نہیں ملتا صرف میونک کی فہرست (ص ۳۷) میں دیوان عرفی کے ایک نسخہ میں ''احوال عرفی شیرازی از میخانہ عشاق عبدالنبی'' نقل ہوا ہے۔ پروفیسر محمد شفیع صاحب نے ہندوستان میں اس کے دو نسخے حاصل کئے۔ اور انہیں کی مدد سے مطبوعہ نسخہ کا متن تیار کیا۔ ان میں سے ایک خود ان کا ذاتی نسخہ ہے، دوسرا رام پور کے کتاب خانہ (رضا لائبریری) میں محفوظ ہے۔ یہ دونوں نسخے بہت قدیم ہیں اور مصنف کی زندگی ہی میں ان کی کتابت ہوئی، ممکن ہے کہ مولف کی نظر سے بھی گذر چکے ہوں۔ مولانا شبلی مرحوم نے شعر العجم میں اس سے مدد لی ہے، چونکہ شعرالعجم میں منقول عبارتیں دونوں موجودہ نسخوں سے مختلف ہیں اس سے پروفیسر شفیع کا قیاس ہے کہ اس کا ایک اور نسخہ ہندوستان میں موجود ہوگا۔ خوش قسمتی سے اس تذکرہ کا ایک نا مکمل نسخہ طہران میں کتاب خانہ ملی[2] ملک میں میری نظر سے گزرا جس کا تعارف ذیل کے اوراق میں کرایا جاتا[3] ہے:

---

۱ - ملاحظہ ہو تذکرہ میخانہ مقدمہ، ص الف -

۲ - یہ نہایت اہم کتاب خانہ ہے جس میں بہت کمیاب خطی نسخے پائے جاتے ہیں - افسوس کہ اس کا کیٹلاگ ابھی تک مرتب نہیں ہوا ہے -

۳ - ایک اور نسخہ سید عبدالرحیم خلخالی کے پاس ہے جسکی کتابت ۱۰۵۱ھ میں ہوئی - (دیوان حافظ مرتبہ خلخالی دیباچہ ص ''یا'')

تعداد اوراق، ۲۴۳، فی صفحہ ۱۸ سطر، سائز ۶۳·۱۰"×۲ ۶۳"
لکھی ہوئی، سطح کی تقطیع ۶۳ ۷"×۶۷ ۳" ابتدا اور خاتمہ ناقص، سنہ کتابت و نام کاتب ندارد ۔ خط نستعلیق ۔ کاغذ اور خط سے اس کی قدامت ظاہر نہیں ہوتی ۔ تیرھویں صدی ھجری کا ھوگا ۔ ابتدائی تین اور آخری دو ورق کے حصے کٹ گئے ھیں ۔ بقیہ اوراق صاف اور اچھی حالت میں ھیں ۔

ابتدائی عبارت یہ ھے :

''در ایام شباب منظوم ساختہ و سوای خمسہ و کتاب مذکور الخ''

یہ عبارت نظامی کے حالات سے متعلق ھے اور مطبوعہ نسخے کے ص ۱۱ سطر ۹ سے شروع ھوتی ھے ۔ ۔

آخری حصے کے دو ورق میں دو سخص کا حال درج ھے اور دونوں ناقص پہلے کے ابتدائی حالات ھیں آخری ناقص اور دوسرے کے ابتدائی اور آخری دونوں نا مکمل ھیں ۔ مطبوعہ نسخے کے آخری تین شاعروں کے حالات جو ص ۵۷۵ سے ۵۷۹ تک پھیلے ھیں، اس میں نہیں پائے جاتے ۔ اس سے ظاہر ھوتا ھے کہ آخر سے اس نسخہ کا نقص زیادہ ھے ۔

لیکن اس نسخے کے مطالب دونوں خطی نسخوں سے زیادہ ھیں ۔ مرتبہ اول میں اس میں ۲۹ شاعروں کے حالات ھیں جب کہ مطبوعہ نسخے میں صرف ۲۶ شاعر پائے جاتے ھیں ۔ پروفسر شفیع کے نسخے میں ابتدا میں ۲۲ شاعروں کے ترجمے تھے چنانچہ مطبوعہ نسخے کے صفحہ ۳۴۳ پر بھی تعداد صراحۃً درج ھے، فیضی اور صحیفی کا حال حاشیہ میں اضافہ ھوا اور دغفور اور ملکی کا ختم کتاب کے بعد ضم ھوا ۔ رام پور کے نسخہ میں ۲۶ ساعر مذکور ھیں لیکن متن کتاب میں جہاں پروفیسر شفیع والے نسخہ میں ''بیست و دو'' ھے وھاں ''دو'' کے بجائے بیاض ھے ۔ زیر نظر نسخہ میں اس جگہ یہ عبارت پائی جاتی ھے :

نخستین مرتبہ این تالیف را بانصرام رسانید و بقدر وسع خود آنقدر کہ مقدور بود احوال خداوندان این بیست و نہ ساقی نامہ وغیرہ از متقدمین و متاخرین از روی اسناد ارباب خبر و از اقوال مردم معتبر ترتیب دادہ بر بیاض برد،

وہ تین شاعر یہ ھیں :

صفی صفاھانی ، عتابی تکلو ، افضل خان دکنی ، پہلے دونوں کے حالات ابو تراب اور فغفور کے درمیان بالترتیب بیان ہوئے ھیں ، آخری کے فغفور کے بعد ، یعنی اس نسخہ میں اس مرتبہ کا آخری شاعر افضل ھی ھے ۔ صفی مطبوعہ نسخے میں تیسرے مرتبے میں شامل تھا یعنی ان لوگوں میں جنھوں نے ساقی نامے نہیں لکھے تھے، لیکن بعد میں اس کا ساقی نامہ مل گیا ، اس لئے آسے پہلے مرتبے میں شامل کردیا یعنی ان لوگوں کے ساتھ جنھوں نے ساقی نامے لکھے تھے اور اس وقت تک فوت ہو چکے تھے ۔

دوسرے مرتبے میں مطبوعہ نسخے میں ۲۰ شاعروں کے حالات ھیں جب کہ ایرانی نسخہ میں ۲۳ کے پائے جاتے ھیں ۔ باقر خوردہ ، نظام دست غیب اور اسد بیگ کے حالات زیادہ ھیں ، باقر کا نام عارف ایگی کے قبل اور نظام کا ایگی کے فوراً بعد آیا ھے ، اسد کا مولف میخانہ کے پہلے ۔ مطبوعہ نسخے میں اسد بیگ تیسرے مرتبے میں مذکور ہوا ھے ۔ معلوم ہوتا ھے کہ بعد میں مولف کو اسد کا ساقی نامہ مل گیا جس کے نتیجے میں آسے دوسرے مرتبہ میں ان شاعروں کے ساتھ شامل کر دیا جو ساقی لکھ چکے تھے اور اس وقت بقید حیات تھے ۔

تیسرے مرتبے میں پروفیسر شفیع کے نسخے میں ۲۰ شاعر تھے اور یہی تعداد اس نسخہ میں لکھی ھے (ملاحظہ ہو نسخہ مطبوعہ ص ۵۲۴) ایک شاعر 'رامی' کا حال بعد میں حاشیہ میں بڑھایا گیا ۔ رام پور والے نسخے میں ۲۵ کی تعداد پائی جاتی ھے یعنی چار شاعر نظیری ۔ قدسی ۔ قمشہ اور باقیا پہلے نسخے سے زیادہ ھیں ۔ ایرانی نسخہ میں اس مرتبے میں ۳۴ شاعروں کے حالات ھیں جن میں مطبوعہ نسخے کے آخری تین شاعر محذوف ھیں اور دو شاعر صفی اور اسد بیگ مرتبہ اول و دوم میں بالترتیب شامل ھیں اس حساب سے ۱۴ شاعروں کے حالات اس میں زیادہ ھیں ۔ اس مرتبے کے ۳۴ شاعر اس ترتیب سے آئے ھیں خط کشیدہ نام اضافہ شدہ شاعروں کے ھیں ۔

نظیری - شراری - ابوالحسن فراهانی - حیاتی - موزون الملک -
قدسی - رونقی - نظر قمسہ - نادم - رشکی - حیدر خصالی - عطائی -
طبعی - شمیمی - علی احمد نشانی - دیری - محوی - باقیا - کیفی - انوری -
وجودی - صالح - محمود - تسبیہی - شرمی - مظفر - ابراهیم - صفائی -
حریفی - عبداللہ مرہ - ذهنی - عارفی - احولی - طنبورہ -

هندوستان کے دونوں نسخوں میں تین جگہ ناموں کی ترتیب میں اختلاف ہے، نسخہ رام پور میں مرتبہ اول میں فیضی اقدسی سے پہلے ہے اور ایرانی نسخہ میں اس کے برعکس، دوسرے مرتبہ میں ملکی غروری سے پہلے ہے اور ایرانی نسخہ میں بھی یہی ہے، تیسرے مرتبہ میں نظر قمسہ رونقی سے پہلے جب کہ زیر نظر نسخہ میں اس کے برعکس ہے -

ایرانی نسخہ جس متن کو ظاهر کرتا ہے وہ هندوستان کے دونوں نسخوں سے بعد کا ہے - مگر اس کے ساتھ یہ حقیقت فراموش نہ کرنا چاهئے، کہ جو حصے اس نسخہ میں زیادہ هیں ان میں بھی ۱۰۲۸ هجری هی درج ہے بلکہ ایک جگہ ۱۰۲۶ هجری ملتی ہے - بہرحال اس سے مزید یہ معلوم هوتا ہے کہ مصنف برابر نظرثانی اور اضافہ کرتا رها تھا - جس کی بنا پر بہت سے نئے شعرا کے ترجمے اس بعد والے نسخے میں شامل هوگئے - نظرثانی اور ترمیم و تنسیخ کا حال اس سے بھی معلوم هوتا ہے کہ بعض شعرا کے حالات وغیرہ میں بھی خاصا تغیر پایا جاتا ہے - مطبوعہ نسخے میں ظهوری کو طهرانی بتایا گیا ہے (ص ۲۶۷، ۲۶۸) لیکن اس نسخہ میں عنوان کے ساتھ وطنی نسبت نہیں پائی جاتی مگر حالات کے ذیل میں اس کا وطن ترشیز لکھا ہے - یہ نسبت بہت مشہور ہے - ممکن ہے بعد میں آیے یہ اطلاع ملی هو جس کی بنا پر اس نے اپنی پہلی رائے بدل دی هو - سنجر کاشی کے ساقی نامہ کے ابیات کی تعداد مطبوعہ نسخے میں ۷۸ ہے جب کہ اس نسخہ میں ۳۵۰ سے زیادہ ہے اور دیوان سنجر کے خطی نسخہ (کلکتہ) میں ۳۵۱ ہے جو یقیناً کم ہے کیونکہ پروفیسر شفیع صاحب کی تصریح کے بموجب میخانہ میں نقل شدہ ابیات میں سے ۲۹ بیت دیوان میں نہیں هیں - اسی طرح طالب آملی کا ساقی نامہ

دونوں نسخوں میں نہیں پایا جاتا ۔ بعد میں جہانگیر نامہ سے ایک ساقی نامہ منتخب کر کے ایرانی نسخہ کے منقول عنہ میں شامل کر دیا گیا تھا ۔ اسی طرح مطبوعہ نسخہ میں حیاتی کی وطنی نسبت گیلانی اور ایرانی نسخے میں رشتی ہے ، آخر الذکر میں قاسم گونا بادی کے بجائے جنا بادی پایا جاتا ہے ۔ یہ ساری مثالیں اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ خود مصنف نے میخانہ کے بعد والے نسخوں کے متن میں کافی تغیر کیا تھا ۔

ایرانی نسخے میں کتابت کی کافی غلطیاں پائی جاتی ہیں اور بعض جگہ خود کاتب نے نقاط شک ڈال دئے ہیں کہیں کہیں جگہ خالی چھوڑ دی ہے ۔ پھر بھی اس نسخہ کی دریافت سے مطبوعہ نسخے کے متن میں کافی اضافہ ہو سکتا ہے ۔ چنانچہ جو حصے اس نسخہ میں زیادہ ہیں انہیں ذیل کے اوراق میں پیش کر دیا گیا ہے ۔ اگر مطبوعہ نسخے سے حرف بحرف مقابلہ کر لیا جائے تو بہت سی مفید باتوں کا اضافہ ہو جائے ۔

صفی صفاهانی[1]

و این کمترین در سنه عشرین و الف درمند و بخدمت آن سرامد مستعدان ایی جزو زمان رسید دران وقت سال عمرش بشصت و یک رسیده بود اشعار خوب و ابیات با اسلوب دارد و کلیات سخنانش قریب بشش هزار بیت باشد ازان جمله مثنوی نزدیک هزار بیت در بحر خسرو و شیرین دارد و این بیت از اول مثنوی اوست (بیت)

خداوندا بعشقم رهبری کن خدائی کردهٔ پیغمبری کن (صفحه دیگر)

و در بحر مثنوی مولوی معنوی جلال الدین محمد رومی قدس سره نیز پارهٔ اشعار گفته این دو بیت ازان مثنوی اوست که در مدح حضرت مولوی گفته مثنوی

مثنوی مولوی معنوی مردهٔ صد ساله را بخشدنوی

اینقدر دانم که آن عالیجناب نیست پیغمبر ولی دارد کتاب

ساقی نامه خود را هنگام ملاقات باین ضعیف داد و ازان سر زمین در خدمت صاحب خویس بکابل رفت و به تحقق پیوست که در سنه ثمان و عشرین (و) الف در شهر مذکور از ساغر مرگ بیشعور گردید -

ساقی نامه صفی صفاهانی

آلا ای خرد پرور کام جوی
همی باده گلزار و روی نکوی

ازان غم برون کن ز انبارها
و زین شادی آور بخروارها

مکن تکیه بر هستی بی ثبات
غنیمت شمر چند روزه حیات

سر این بند و زنجیر را جز بمی
ندانند شکستن فلاطون و کی

---

1 - حالات مطبوعه ساقی میخانه کی طرح هیں -

علاج غم آن به که از می کنی
کنون گر نکردی دگر کی کنی

بمی رونق عقل و دانش بده
که به روز بینی نهانش بده

کمش عقل را کار فرما بود
پرش جهل را رونق افزا بود

حکیمانه گر باده ریزی بجام
فلاطون و لقمان در آری بدام

دگر ساغر از می لبالب کنی
دل روشن از تیرگی شب کنی (ص دیگر)

وگر کم خوری زین کلید هنر
کشائی در گنج لعل و گهر

بمیخانه درد نوشان در آ
زمانی در خرقه پوشان در آ کذا

که بینی گروهی منزه زلاف
برونهای شوخ و درونهای صاف

بمی سینه از دل همه بغض وکین
سلیمان در آورده زیر نگین

ز خود بیخبر وز جهان باخبر
مبرا ز خوف و بری از خطر

جهان زیر فرمان و گردون به بند
کمند افگنانند و خود در کمند

ازیشان مدد جوی و همت بخواه
کز ابرست سر سبزی هر گیاه

اگر من ز ساقی شدم کامجوی
مکن عیبم ای یار فرخنده خوی

بیا ساقی از احتیاجم برآر
وزین کشور بیرواجم برآر

شهی کو ستاند ز گردون خراج
بساقی کشاید کف احتیاج

بهندم رسان خوش دران مرزو بوم
بویرانه تاکی نشینم چو بوم

بملک عراقم چو گنجی بخاک
و یا موم در آتش تابناک

بیا ساقی آن آب آتس خصال
بده تا برآیم ازین تیره حال

مدد کن بیکجرعه بی غشم
که از بخت بد بر سر آتشم

ز روی و کف ساقی کامیاب
خلیلم در آتش کلیمم در آب

بده ساقی آن رسک کان یمن
بدانسان که گردون نماند بمن

که گردون دون بس حسود آمدست
ز رسکی که دارد کبود آمدست

نیارد که بیند دل شادمان
همی جان دهد از غم بیغمان (صفحه)

بده ساقی آن ساغر یکمنی
بکوری این چرخ اهریمنی

مغنی نو هم نغمهٔ ساز کن
در خرمی و فرح باز کن

مرا نالهٔ نی به از صد جله
درای بمنزل برد قافله (کذا)

بده ساقی آن سلبسیل وجود
که گلشن شوم بر خلیل وجود

دل از هر بد و نیک خالی کنم
به پیرانه سر خورد سالی کنم

مغنی یکے نغمه پرداز شو
به از خود جمله تن ساز شو (کذا)۱

یکی نغمه بی مزد و منت بیار
همه حور و غلمان ز جنت بیار

رهی زن که بر خود بگرییم زار
ازان پیش کز ما بر آید دمار

بده ساقی آن مایه دل خوشی
کلید نها نخا نه بی هشی

بده ساقی آن کیمیائی رحیق
کز و شیشه شد لعل و ساغر عقیق

بعزت بیا شام و عزت بده
که د ر د ه بز ر گست سا لا ر د ه

بده ساقی آن حور مستور را
جگر گوشهٔ تاک انگور را

مرا میز بانیست هم کیش من
نهد خوان رنج و بلا پیش من

بمن هر زمان درد و غم میدهد
کریمی ست و منعم نه کم میدهد

جفائی فلک را چه روئین تنم
درین آسیا سنگ زیرین منم

نیاسایم از جور گردون دمی
نخورده غمی پشم آمد غمی

بیا ساقی آن دشمن فکر را
بمن بخش آن شاهد بکر را

که با او دمی سادسانی کنم
کلاه نمد را کیا نی کنم (ص دیگر)

---

۱ - به نقاط شک

ایا شاهد سرو بالای من
فدای قدت جمله کالای من

برقص اندر آرم کنم جان نثار
بخاک رهت سازم ایمان نثار

تو دامن فشانی چو از روی ناز
منت جان فشانم ز راه نیاز

بده ساقی آن تلخ شیرین نسب
بصورت حریر و بسیرت قصب

بده ساقی اکنون که دوران تست
صراحی و ساغر بفرمان تست

نکوئی کن و رور فرصت شمار
که هر مستی دارد از پی خمار

(کذا) صراحی من از رشک مردم نشست
که آن دست در گردن ما کسست

(کذا) پیاله تو هم نا قبولی مکن
مپوس[1] آن لب و بوالفضولی مکن

سفالین لبی را کجا شایدی
که هر لحظه آن لعل آلایدی

مغنی توهم جرعهٔ نوش کن
اہا ساز دستی در آغوش کن

رسان این دعا را بآواز نی
بعرض مهین وارث ملک و کی

بگوای خداوند اقبال و بخت
شهنشاه شاهان با تاج و تخت

اگر دورم از درگه شهر یار
امیدم چنانست از کردگار

---

۱ - ممکن ہے ببوس ہو -

که شه را یمن لطف نزدیک باد
دل خصم او تنگ و تاریک باد
بفتراک شه دست اقبال باد
ظفر پیش و نصرت ز دنبال باد
بهر نیک و بد ایزدش یار باد
بفرق عدو خاک ادبار باد
تو حاجت روا گشتی ای شهر یار
ز فیروزی بخت در هر دیار
که از عمر ایشان فراید بشاه
که جاده چو سد ره شود شاهراه (ص)

به این در بکلک و زبان سفته ام
باقبال ساه جهان گفته ام

خدیو عدو بند کشور گشای
جهان داور و نقد سیر غدای

سپهر مروت جهان کرم
که نگذاشت نقدی بکان کرم

بشمشیر بگرفت روی زمین
ببخشید آنکه بنقش نگین

ز عدلش جهان جمله یکسهر شد
خرابی چو عنقا درین دهر شد

شهنشاه شاهان روی زمین
کزو روشنی یافته شمع دین

جهاندار شاها جهان ران تست
زمین و زمان هم بفرمان تست

فلک را به پیشت سر افگند گیست
بگوشش ایدرش حلقهٔ بند گیست

چو رخش عزیمت در اری بزین
بهم در نوردی زمان و زمین

چو تیغ تو دشمن نوازی کند
سر خصم چون گوی بازی کند

ز تیغ تو فتح و ظفر روشنست
چه سد حصم گر آهنین جوشنست

چو روی آوری پشت بینی ز خصم
بزلنهار انگشت بینی ز خصم

مگر تیغ قهر تو عریان شده
که دستار از فرق کیوان شده

(کذا) بکام تو باد اچرخ بلند
سر دسمنانت بخم کمندن

بشادی بزی ای مجسم ز جان
که از تست روشن چراغ جهان

ز نور آفریدت خداوند پاک
چنین پاک گوهر نزاید ز خاک

جهان داورا کام دلها برآر
جهانرا باین شاه عاقل سپار

دلش را بهرکام مفور دار
که تو کام بخشی و شه کامگار (ص‌دیگر)

چراغ دلش را فروزنده دار
چو بخشی خودش شاه فرخنده دار

شها تا فلک ساقی کام باد
ترا بادهٔ عیش در جام باد

صفی از غلامان درگاه تست
دعا گوی عمر تو و جاه تست

این قطعه و این بیت پر از واردات اوست **قطعه**

(کذا) خاک وار پشت مرا انگشت من
خم شود از بار منت پشت من

همتی کو تا بخارم پشت خویش
وارهم از منت انگشت خویش

(بیت) الهی قفل غفلت را کلیدی
یزید نفس ما را با یزیدی

ذکر هزار دستان چمن نکته سرای مولانا عتابی تکلو

این عندلیب بوستان کمال پسر بخشی بیگ تکلوست و والده اش هروی است و تولد خودش نیز در هراه واقع شده و لیکن در دار الموحدین قزوین نشو و نما یافته و در دارالسلطنت صفاهان شهرهٔ جهان شده این جامع فضائل انسانی که مسمی به حسن بیگ ست و این سرآمد بلبل گلستان معانی که متخلص است بتخلص عتابی اقسام اشعار را خوب گفته و از هر جنس شعر نیکو بسیار دارد قصیده گوئی را بکمال رسانده و غزل را از امثال و اقران گذرانده و خمسه شیخ نظامی گرامی را بغایت مرغوب تتبع نموده دو صندوق از اوراق اشعار او بنظر این محقر در آمد اقسام منظومات او بعضی تمام و برخی نا تمام بران اوراق پریشان مسطور بود سوای خمسه دو نسخه دیگر دیده شد یکی را در بحر (صفحه دیگر) تقارب گفته و سام پری نام نهاده بود و دیگری را ایرج وگیتی خطاب داده و این ایرج وگیتی را در بحر مخزن اسرار شیخ گرامی نظامی برشته نظم در آورده و در بحر حدیقه مثنوی دیگر گفته و آنرا بحدائق الازهار مسمی گردانیده است و مثنوی نیز در بحر مثنوی مولوی به ترکی گفتهو بمجمع البحرین موسوم ساخته و ساقی نامه اش را مولف این تالیف حنیف از روی مسودات او بدر نوشته مرقوم قلم شکسته رقم گردانید کلیات سخنانش بیک لک و پنجاه[1] هزار بیت میشود و لکن واردات خویش را آن عزیز در ایام خویش جمع نکرده بود و بر بیاض نبرده و ربطی نداده و بعد از وفاتش ناخلف پسرش مشتاقی باوجود موزونیت ابیات را فراهم نیاورده و دیوانی هم ترتیب نداده و عتابی در اول سخنوری و آغاز نظم گستری بسعادت بندگی خداوند ایران پادشاه پادشاه نشان شاه عباس حسینی صفوی بهادر خان مستسعد گردید و حسب الحکم آن عالمیان پناه مثنوی در بحر مخزن گفته این دو بیت ازان اشعار است :

مثنوی

شاه جهان کوکبهٔ عباس شاه

در ره مردان خدا خاک راه

جوهر تیغش همه تسخیر باد

همچو دم صبح جهانگیر باد

مرضی طبع مبارک ایشان گردید و بصلهٔ ابیات مذکور ده طارن را که از اعمال ورامین است و بر اطراف آن قریه باغستان مملو از میوه های لطیف و شیرین بدو (ص دیگر) مرحمت فرمود و بتحقیق پیوسته که مولوی افیونی گذرا بود و شراب نمیخورد و در علم فقه مهارت تمام داشت و در عمل آن جد لا کلام، روزی شاه گردون اساس شاه عباس در آئین سدی شهر صفاهان بدو تکلیف می خوردن نمود عتابی از غرور زهد و خود نمائی و تقوی ریای خود را از ارتکاب تجرع باز داشت دران زمان یکی از حاضران بعرض خدیو ایران رسانید که وی خود را قطب میگوید و دم از ولایت میزند شاه انجم سپاه بعد از استماع این سخن فرمود که من تیری بجانب او می اندازم اگر کار گر نیاید قطب خواهد بود و الا فلا - خان عظیم الشان فرهاد خان و اکثر اعیان که حاضر بودند بعرض رسانیدند که زندگانی پادشاه ایران در از باد اسلحه جنگ بانبیاء و ائمهٔ هدی مضرت رسانده چه جای اقطاب احتیاج امتحان نیست از کجا معلوم که عتابی خود را قطب خوانده شاید که گویندهٔ این کلام غرضی در ضمن این نقریر داشته باشد و جهان پناه انتظار تیر و کمان داشت که بدست در آورده کار حسن بیگ با تمام رساند در انوقت فرهاد خان بعتابی گفته که اگر میل استخلاص داری باید که بجهت عذر تقصیر خود بیتی بگوی که مشتمل باشد بر رفع حرمت شراب این خسرو کامیاب و صفت بزم این سلطان گردون جناب، چنانچه درین باب (صفحه دیگر) تکاهل ور زیدی و فکر بکری از دل بر زبان نیاوردی حرمان زندگانی اختیار کردی آن فرید زمان و منتخب دوران در همچنان وقتی این رباعی بدیهه انشا نمود

رباعی

ای شاه ستاره خیل خورشید اقبال
وی از پی سایهٔ تو گردون چو هلال

ایام تو عید است درو روزه حرام
بزم تو بهشت است درو باده حلال

خسرو جمشیدشان بعد از استماع این دو بیت بغایت خندان شد و بصله این بدیهه گوئی جان عتابی را باصد تومان و اسب مع زین نقره بدو مرحمت فرمود و عتابی بعد از وقوع این قضیه مدتی در ایران بود بار دیگر بحسب تقدیر بهندوستان آمد و به تحقیق پیوسته که کرت اول از عراق بهند همراه میر معصوم بکری که از جانب پادشاه بحر و بر جلال الدین اکبر بخدمت خسرو دارا شکوه دین پناه عباس پادشاه آمده بود، آمد و بوسیلهٔ آشنائی میر مذکور بسعادت آستان بوسی آن خسرو داد گر غریب پرور مستسعد گردید و قصیدهٔ که در مدح آنحضرت بر سبیل ره آورد گفته بود بر ایستادگان بارگاه آن جمجاه انجم سپاه خواند مطلعش اینست ـ بیت

شها درمیان تو و ذات داور نگنجد مگر لفظ الله اکبر

ابیات این قصیده تمام مرضی طبع دشوار پسند محفل فرمان روائی مملکت هندوستان گردید مایل مدح را تکلیف بندگی خویش فرمودند آن خرد مند مرد بعرض جهاندار سپهر نبرد رسانید که بنده بعزم گشت این (صفحه دیگر) ولایت آمده ام نه از برای طلب جاه و حشمت و برخصت آن حضرت چندی در دارالامان هندوستان بعیش و عشرت گذرانید و روزگاری در از عرض و طول این مملکت کشور البهجت را سیر نمود پس ازان باجازت بندگان حضرت خلافت پناه عازم ایران شد و اکثر اعیان دولت جلالی و ارکان سلطنت اکبری ویرا رعایتها نمودند تا بسامان و سر انجام تمام عیاری متوجه عراق گردید و در مرتبهٔ ثانی وقتی بهندوستان روان شد که خسرو بحر و بر جلال الدین اکبر جهان گذرانرا چون اجداد خویش پدرود نموده بود و نور مردم دیدهٔ اکبری صاحب اقبال سکندری نور الدین جهانگیر پادشاه غازی بر سریر سلطنت متمکن گشته و عالم را ازیمن عدل طبیعی خویشتن

رشک گلشن ارم کرده امید که تا انقراض عالم کامران و کامیاب باشد و گیتی تا انتها در تصرف بندگان انجناب ـ اما چون عتابی بعد از طی مراحل راه دارالامان هند بقندهار رسید میر زای دانشوران میرزا غازی ترخان دران بلده حاکم بود ویرا دید و قصیدهٔ در ردیف افتاب در مدحش گفته بدو گذرانید و میرزا نکته دان بصله این بیت که
بیت

ای خاتم جلال ترا آسمان نگین
د :یر آن نگین ورقی از زر آفتاب

وی را رعایتها فرمود و میگویند که هفتاد قصیده در ردیف آفتاب گفته و همه را مطبوع انشاء نموده بهر تقدیر وقتی که در کرت ثانی بهندوستان (صفحه دیگر) رسید نخست بشرف ملازمت میرزا غیاث بیک اعتماد الدوله که رای خورشید پیرای او در این جزو زمان شمع شبستان مملکت جهانگیریست مشرف گردید و قصیدهٔ در مدح خدمتس گفته بر سبیل ره آورد گذرانید این چند بیت ازان قصیده است ـ
نظم

سمی صدر رسالت غیاث دولت و دین
وزیر مشرق و مغرب خدایگان معین

برای حمل وقارو بلندی قدرش
معلقند ترازوی آسمان و زمین

بنقشه ایست ز گلزار دولتش گردون
شگوفه ایست ز بستان رفعتش پروین

به نیزهٔ قلم ار خصم خویش را بکشد
زبان کشته برون آمد از پی تحسین

پلارکیست قلم در کمش بقطع سوال
که همچو خنجر مژگان بشد نیام نشین

و این خجسته وزیر همایون مشیر بعد از استماع این ابیات با او کمال مهربانی بجای آورد و در رعایت خاطرش دقیقه فرونگذاشت و من العجایب آنکه میر جنوبی تبرای(کذا) که درین دولت عظمی بخطاب

صلوة خانی ممتاز و سر افرازست آن رباعی عتابی را که از برای
بزم پادشاه ایران و استخلاص جان خود گفته بود بر ایستادگان
بارگاه جهانگیری خواندو بعرض رساند که این دو بیت را بنده در مدح
حضرت گفته ام نور الدین قلی صفاهانی که یکی از روشناس این
خسرو گردون اساس است معروضداشت که این رباعی از منظومات
تکلوست و او الحال در خدمت اعتماد الدوله است (ص دیگر)
حضرت در ساعت عتابی را بحضور طلبیده از وی پرسیدند که این
دو بیت از تست گفت بلی از منست فرمودند که از برای که انشا
کردهٔ جواب داد که در مدح بندگان عرش اشتباه گفته ام جهان پناه را
این سخن بغایت مستحسن افتاد یک فیل و هزار روپیه بصله این دو
بیت بدو مرحمت فرمود و مولوی صلهٔ یک رباعی از دو پادشاه
عظیم الشان بدستوری که مسطور شد گرفت و چون روزگاری بدین
مقدمه بگذشت بار دیگر عازم ایران گردید اعیان درگاه جهانگیری
بواسطه خاطر وزیر کبیر خسرو جهانگیر ویرا رعایت بسیاری نمودند
و مولوی بآرزوی تمام و جمعیت لا کلام متوجه مسکن خویش
گردید چون درطی طریق داخل قندهار گشت سال عمرش به پنجاه
و دو رسیده بود از ناسازگاری روزگار بیمارشد و دران بیماری ببلده
مذکور کوچ کرده در یک منزلی شهر فرود آمد و اشتداد مرض کار برو
دشوار کرد و نفسش را بشماره انداخت این بیت را دران مکان
در همان وقت انشا فرمودند که بیت

متاع هستی من (کذا)[۱] بود پنداری
که چون شدم ز جهان در دلی نماند غبار

پس ازان دل ازین بستان سرای دو در برداشته ودیعت حیات را
بناچار بموکلان قضا و قدر سپردند مدفنش در همان مکان بر سر راه
ایرانست این چند بیت متفرقه از اقسام اشعار از واردات طبیعت اوست

من سکندر نامه

نظامی که وصف سکندر نمود
اگر ساحری کرد معجز نبود (ص دیگر)

---

۱ - کلمه ای مثل ''خاک'' افتاده -

بیانش گر آئینه انورست
معانی من سد اسکندر است

بر آب ار نگارم خیال سخن
چکد عکس را آب خضر از دهن

من خسرو شیرین

خبر دادند شیریں را که پرویز
رسید اینک چو اشک خود جلوریز

چنان شد و چنان گرم و سبکرو
که گفتی آفتابست این نه خسرو

من صفت فرهاد

هنوزم تیشه درکار آزمائیست
وگرنه پیشه ام بعد از حدائیست (کذا)

زداید عکس را ز آئینهٔ آب
رباید خواب را از دیده در خواب

وله

شراری کزدم آن تیشه جستی
چو انجم در دل گردون نشستی

زهر خون کز مژه بر سنگ میریخت
پی تصویر شیرین رنگ میریخت

دهانش را سر موی نموده
نموده گرچه صد چندان که بوده

شد از دندان آن بیچاره دلتنگ
که مروارید را نبود مکان سنگ

بود آخر ز سنگ آن غنچهٔ تنگ
ولی چون لعل پنهان در دل سنگ

من هفت پیکر فی وصف الجبل

بود کوهی دران کهن میدان
سایه اش بر دو کون گشته گران

چرخ نیلوفری برش بمثل
همچو نیلوفری بدامن تل

دامن از روزگار درچیده
لعل خورشید در کمر دیده

من سام نامه فی بحر تقارب (صفحه دیگر)

بتی همچو آئینه رخ آفتاب
لبی همچو یاقوت و حرفش چو آب

رخی همحو نار خلیل آبدار
دهان غنچه و غنچه چون نوک خار

دو پستان دو چشمه چو کوثر بهم
چو نور نظر هر دو را سر بهم

ز شمع رخش یک شرر آفتاب
زده آتش از خوی بیاقوت ناب

خرامان ز شوقش به بستان نهال
خروشان ز شوقش در ایوان مثال

نگاهش چو مستان در آغوش خواب
دو مستند افتاده اندر شراب

نه در ساغرش بود لعل شراب
کش از تاب یاقوت شد آتش آب

وله

نظر کز رخ سام بر داشتی
همان سام را در نظر داشتی

شبی روز گردید با عیش و ناز
که چرخ از پیش دیدها کرد باز

عنان نکاور بتقدیر داد
دم همتش را بشمشیر داد

چو زد بر کمر گاه سر[۱] (کذا) دلیر
دن (کذا) سرا را کرد چون چشم شیر

ابا روی سام آسمان جم گرفت
همه دهر چون چرخ رستم گرفت

نه پر بود بر گوهرین افسرش
که بر آتش افشاند مرغی پرش

من حدیقه الازهار فی بحر حدیقه الابرار

ای بحکم تو نه فلک بر پای
چون خیالی ولی ز آب صدای

نه نجومست آنکه جلوه گرست
دیده ها بهر دیدن هنرست

ای گدای تو پادشاهی بخش
بنده را منصب گدائی بخش (ص‌دیگر)

که گدای تو شاه بی سپه ست
هر که شد بندهٔ تو پادشه است

خاک راه تو تاج خورشید است
خاکروب در تو ناهید است

دل که بیگانه از تو شد سنگست
در دو عالم مکان او تنگست

آشنای تو داند این معنی
که جوی نیست دینی و عقبی

---

۱ - بدون نقط

دل چو برداشتی ز غیر خدای
نور شو در دل ستاره در آی

پای بر فرق ماه و مهر گذار
پایه بر تارک سپهر گذار

آخر شب دمی ز خواب درای
ذره وار آفتاب را بستای

یار را بی رقیب در بر کش
ساغر از دست دوست بر سرکش

در دل شب ببین تجلی طور
دیده بکشای تا ببینی نور

در دلت مشرقی پدید آید
کافتابش به بندگی شاید

من مجمع البحرین ترکی فی بحر مثنوی مولوی

نی [۱]اَرر دل سنر شکایت هر نفس
ایریلق در دین بیلن هر ناله بس

ایله ظلمت بولدی ایامم منم
کیم چراغ آلمش او نگا شامم منم

کوز دا مردم داغدُر بین دین ایراق
موج دریای عدم در اشتیاق

من منظر ابرار فی بحر مخزن اسرار

جعفر صادق شه والا گهر
چرخ بخاک قدمش تا کمر

رفت یکی عید ز منزل برون
تا الفش را کند از سجده نون

---

۱ - یہ تین بیت ترکی چغتائی زبان میں ہیں جو آجکل کی ترکی سے مختلف ہے ۔

همچو مه اش خرقهٔ پشمینه بود
لا جرم آن در خور آئینه بود(ص دیگر)

تا نشود اهل حسد شادمان
شد چو ضو ار سایه کنان بر کران

راه وی افتاد بویرانهٔ
دید یکی پیرزن از خانه

سر بدر آورد چو آه از جگر
شسته بخون دامن مژگان تر

گفت که آه از دل بی پا و سر
نیست کسم تا کشد آه از جگر

گاو کش افتاده یکی در خروش
خود چو یکی نوحه گر اندر خروش

کرد شه دین ز بلاکش سوال
گفت چه پرسی چو عیانست حال

زین بقرم کز لبن همچو نوش
مشتری آمد قمر نقره پوش

مرد چنین روز مرا تیره ساخت
شیر فلک را بسرم یره (کذا) ساخت

بیوه و طفلی دوسه دارم به پیش
بی پدر و بی کس و بی قوم و خویش

کرده ام از خون دل آبستنش
بوده فزون منبع شیر ازمنش

نصفی ازان صرف هبی در لیال
نصف دگر خرج لباس عیال

چون بشنید این سخن از وی امام
کرد هدف چرخ و دعارا سهام

قال باذن الله قم لا تخف
تیر دعا را گذراند از هدف

گاو چنان خاست[1] که شیر از کنام
پیر زن افغان زد و گفت ای امام
عیسی مریم شده اینک پدید
کاین اثر از غیر نبی کس ندید
مردی ازان قوم سوی زن روان
آمد و دید آن شه صادق بیان
گفت بآن پیر زن بیخبر
کای بغلط گفته ملک را بشر
این پسر باقر وخود صادقست
نام مسیحاش نهی لایق ست (ص دیگر)
بلکه مسیح از دم او زنده است
تا ابد از حرف تو شرمنده است

من ایرج گیتی

یافت چو آئنهٔ گیتی نمای
دید یکی ماه وش دلربای
بیدل و دین گشت و پریشان فتاد
در صدد پیروی آن فتاد
دید بخوابش بهمان دلبری
بیخبر ار رابطهٔ مادری
آتش عشقش جگرافروز گشت
عاشق آن دلبر جانسوز گشت
نسبت رویش چه بخورشید یافت
دیده دل جانب خورشید تافت
زانرو خورشید پرستی گزید
کاینه اش را رخ خورشهد دید
پس که دو خورشید دلش را ربود
شیوه خورشید پرستان ستود

---

۱ - اصل نسخه خواست، تصحیح قیاسی -

گل چو رود در چمن روزگار
بلبل دل خسته بسازد بخار

آن ز خبر بیخبر بت پرست
چون ز خدا ماند به بت داد دست

داشت یکی پیرو شاپور نام
پر فن دانا دل شیرین کلام

همدم و همراز وهم آواز او
گشته ز همرازی دمساز او

گفت بشاپور غم و درد خویش
کای شده تو سرهم دلهای ریش

فکر دلم کن که بجان آمدم
وز دل و دلبر بفغان آمدم

سوختم از حسرت دیدار دوست
تا زده بر سر گل دیدار دوست

غزل

ازان خیال تو ام در دل خراب در آید
که خانه را چو بود رخنه آفتاب در آید (ص دیگر)

سرحیای تو کردم عرق ز چهره میفشان
که گل نکو ننماید چو از گلاب در آید

وله

طرف مهش تا ز خط نقاب گرفته
شهر بهم خورده کافتاب گرفته

چشم مرا پار های دل ز فراقش
همچو در خانهٔ خراب گرفته

تهمت بیداری شب از نو نخیزد
نرگست از بس که رنگ خواب گرفته

سر قصیده

خیالت بچشمم چو همدم نشیند
چو عکس اندر آئینه یکدم نشیند

چو نور نظر در نظر جا نگیری
بلی شعله بر جای خود کم نشیند

دلم در سیه خانهٔ چشم شوخت
چو مسکین که برخوان جانم نشیند

بچشمم خیال تو الفت بگیرد
که با مردم آبی آدم نشیند

خیال نگاه تو در دیدهٔ تر
چو مستی که با اهل ماتم نشیند

گهر چون نیفتد ز چشمی که بی تو
همی با لب بحر توام نشهند

گلستان شود خوی ز عکس جمالت
چو بر لاله از باده شبنم نشنید

دلم بر سر نیز ها بین ز مژگان
چون خونی که بر موی پرچم نشیند

جهد آتش از داغ دل همچو مجمر
چه باشد لبم گر فرا هم نشیند

بزاید غم زندگان تا بمردن
مگر در لحد زاده بیغم نشیند

چو زلف بتان هر دم آشفته خیزد
نسیمی که بر خاک آدم نشیند

اگر زیور دست گل زر نباشد
شکفتم که خندان و خرم نشیند (ص دیگر)

خط و خال او دیده را دلنشین شد
نو آموز را دل معجم نشیند

دل از دام زلفی چسان سر بر آرد
که غم بر غم و غصه برهم نشیند

چرا سر نساید بخاک خیالی
که در پایهٔ او فلک خم نشیند

شهی کش سپاهی لشکر ملک شد
کجا سایه اش بر سر جم نشیند

من و بندگی بر در پادشاهی
که حکمش بر اولاد آدم نشیند

محمد که بر انبیاء اشرف آمد
که برجای او غیر بن عم نشیند

فلک را فلک جانشین باید آخر
که تا سایه اش بر دو عالم نشهند

ساقی نامهٔ مولانا عتابی

جهانرا رباطی شمر چار در
تو از رفتن و آمدن بیخبر

بکوش ای خداوند عقل و حواس
که خود رنج باشی و مردم سپاس

چو یکذره بی پر تو مهر نیست
اگر حق شناسی خس و گل یکی ست

نخیزد نسیم تهی از شمیم
که یک حال دارد شمیم و نسیم

تواند بر آتش نگهداشت موی
چنان کاتش از وی شود چاره جوی

بلندی ده زیر دستان خداست
به بیگانهٔ خویش هم آشناست

چو ابر عطا گوهر افشان شود
خس و خار رشک گلستان شود

شنیدم که دیوانهٔ خاکسار
بویرانهٔ داشت گاهی گذار

قضا را یکی خواست تا خاک و خشت
برد بهر دیوار و بام و کنشت

چو دیوانه دید اضطرابش فزود
زبان بهر تنبیه آنرا کشود (ص‌دیگر)

که گاهی چو دارم در این گوشه جای
نخواهم که خیزد غبارش هوای

ز ویرانیش خاطرم مضطرست
مرا خشت او بالس و بسترست

بخاکش که آب خضر شد برم
نخواهم که گردد جدا از برم

تو از مهر یزدان چرا غافلی
مشو کم ز دیوانه گر عاقلی

خدا را بهر ذرهٔ پرتویست
مداو جهانرا شمار نویست

بهر چه افتدش دیدهٔ ناسپاس
نمازش برد مرد حق ناشناس

سر مو جدائی نداری ز دوست
ولی آشنائیت در خورد اوست

ز ویرانهٔ کم نهٔ پیش دوست
که ویرانها را همه گنج اوست

بیا سلقی آن دشمن رنج را
بده تا در آرم بدل گنج را

بده ساقی اول می روشنم
که از پیل می بیخ غم برکنم

بده می که رخساره گلگون کنم
چو نی ناله از سینه بیرون کنم

که در دور او چشمهٔ زندگی
نهان شد بظلمت ز شرمندگی

بده ساقی آئنهٔ عقل و هوش
که چون عکس تا چند باشم خموش

دل افسرده را شمع سوزان می است
رگ مرده را رشتهٔ جان می است

در آئنه گر پرتوش جا کند
درو عکس کار مسیحا کند

چکد باده گر بر عظام رمیم
شود اژدهای عصای کلیم

چو ساقی کند صاف درد شراب
عرق ریزد از پنجهٔ آفتاب

چو عکس رخ ساقی افتد بمی
توان دید نور الهی زوی (ص دیگر)

اگر استخوان یابد از باده نم
شود خاک دروی چو مغز قلم

کند در دمی سنگ را لعل ناب
مگر باده شد پرتو آفتاب

اگر باده بخشد ز هستی نجات
ز چشمم تو اندازم آب حیات

دل تنگ طوفان غم را تنور
شود گر نباشد می اسباب سور

چو سیمرغ شب سر زد از کوه قاف
چو بهمن بدستان می کن مصاف

ز تیر کمانچه ز تار کمند
که گردون سپر پیش هر یک فکند

سلا ح نبر د غم آ غا ز کن
نواهای رستم دلی ساز کن

نماید ر جوف صراحی شراب
چو از آستین کلیم آفتاب

می آتشین شمع بزم بقاست
صراحی می آب آتش نما ست

بمی گر برم جان زغم دورنیست
که مینای می چشمهٔ زند گیست

ز آب عنب معجزی دیده ام
که از آتش طور نشنیده ام

بده می که خاکم بدخشان شود
دلم در گلم لعل رخشان شود

شود باده گر شمع جانرا لگن
نکاهد عظام و نمیر د بدن

چو از طور انوار موسی نمود
درخت کدو نار موسی نمود

ز می گلستان شد فضای قدح
د ر و خط ساغر دعای قدح

بده ساقی آن آب آتش مثال
کز اندیشهٔ او بسوزد ملال

اگر زندگی آید از نی به تن
مؤبد بماند چو هستی بدن

اگر بادہ با نی شود ہمنفس
بیکدم شود نی مسیحا نفس (ص دیگر)

چکد می چو بر پرتو آفتاب
شود سرمہ یاقوت و خاکستر آب

ز می اشک چو آب حیوان شود
ز عکسش مژہ شاخ مرجان شود

چناں گر صراحی شود عکس می
بود راز دلہا نمایان زوی

رخ زرد را می دہد آب و تاب
کند قطرہ را چشمۂ آفتاب

چنان ساغر از تاب می بر فروخت
کہ در دیدۂ عکس مژگان بسوخت

بدہ آب خشکم می چون گہر
کہ آتش زنم در غم خشک و تر

بدہ می کہ از نشاء معنوی
نہم خشت زر برخم خسروی

بدہ می کہ راز فلک را ز می
توان دید چونانکہ از شیشہ می

مغنی بگو تا چہ گفتی بہ نی
کہ شد استخوانم فروزان چومی

شدہ آسمان سر بسر چشم و گوش
کہ از مستی ما کند کسب ہوش

می وحدت از ما بجوید مدام
نہ آن می کہ شرب ویش شد حرام

بگردیدہ ام گرد نی تاکنون
چو دیوانہ بر آب و غافل کنون[1]

---

۱ - یہ بیت مشکوک ہے لفظوں پر نقطے نہیں ہیں -

نی ار بادہ بہند بہ پیرامنش
نفس جان عیسی شود در تنش

بیک دیدہ بینم سفید و سیاہ
حرامست آری بجز یک نگاہ

دران سر کہ می جلوہ سازی کند
بنہ چرخ چون حقہ بازی کند

میم دہ کہ بگریزم از صبر خویش
دل خارہ را سازم از نالہ ریش

حباب میست آسمان کبود
ازانرو درو ہر دو عالم نمود

می آتشین آتش موسویست
خم می نہانخانۂ معنویست (ص دیگر)

بود بادۂ صاف یاقوت ناب
چرا بد بود زادۂ آفتاب

خرد مند کز بادہ یابد نشان
نیندیشد از دوری جسم و جان

ہمی کوشد ازمیل روی شباب
کہ خشت سر خم شود آفتاب

شبی را کہ می روشنائی دہد
بخورشید کی آشنائی دہد

کسی را کہ بر گنج باشد گذر
برای خزف کی کشد درد سر

حریفان ز می گرمی دیدہ ام
کہ آتش کند آب در دیدہ ام

بدہ ساقی آن شمع مجلس فروز
کہ شمع از فروغش شود رشک روز

بده می که از فیض هندوستان
شود بخت من چون رخ دوستان

که می داد در هندم از غم نجات
عیان دیدم از ظلمت آب حیات

لب یار یاقوت آتش و شست
ازان لعل یاقوت در آتشست

تو یاقوت بین کاندر آتش خوشست
که یاقوت را آب از آتشست

زمی سرّ مردان هویدا شود
که آتش ز فولاد پیدا شود

چو جوهر ز شمشیر گردد عیان
خط یار در آب چون ارغوان

سرم گرم گردد چو از تاب ناب
بیک جرعه می طی کنم آفتاب

ذکر شمع انجمن معنی افضل خان دکنی

این عندلیب شاخسار فصاحت طبع نظم درستی داشت و اشعار خوب در زمانه بیادگار گذاشته اسم او میرزا علی و مولدش از شهر قم ست ـ در اول جوانی با پدر از وطن خروج نموده بهند دکن آمده و در خدمت خان نکته دان شاه نواز خان داخل مداحان شاه دانش پناه برهان نظام شاه بحری شده و خطاب افضلخانی ازان خسرو قدر دان یافته و فسونی دران مکان تخلص نموده و در هند مغل بافضلخان دکنی اشتهار یافته و به تحقیق پیوسته که بعد از فوت برهان نظام شاه ملازم چاند بی بی شده و پیش ازآنکه قلعه احمد نگر بتصرف لشکر ظفر اثر و عسکر فتح پیکر آفتاب فلک بختیاری مشتری آسمان کامگاری خسرو جهانگشا جلال الدین اکبر پادشاه درآید ازان حصار برسم حجابت برآمد و چند دربندگی شاه زادهٔ دانش پناه شاهزاده دانشاه بسر برده آن گوهر درج کامگاری ویرا پس از

فتح دیار برار بدرگاه عرش اشتباه پادشاه خورشید کلاه فرستاد آنحضرت روزینهٔ از برای وجه معاش فسونی مقرر فرمود ویرا به بنگاله مرخص گردانید ـ افضلخان مدتی در ملک بنگ نیک زندگانی کرد و در سال هزار و بیست و هشت از این عالم فانی آهنگ سرای جاودانی نمود دیوانش قریب به پنجهزار بیت باشد ساقی نامه را با ملک قمی در دکن گفته چون آن مثنوی تمام بدست این ضعیف نیامد بنابران یک قطعه از ساقی نامهٔ او که (صفحه دیگر) عالمگیر گردیده بود و مقبول طبع صغیر و کبیر گشته در این اوراق پریشان بر بیاض برد امید که مرضی طبع ارباب فطرت گردد ـ

قطعه

سرت گردم ای پیر دردی فروش — که بار غمم بر گرفتی ز دوش

مرا مومیائی ده از لای خم — که پایم شکسته است درپای خم

رباعی

گر دیده بدیدن جمال تو خوش است — گاهی دل غمگین بخیال تو خوشست

از تو بجز فراق تو ناخوش نیست — آن نیز بامید وصال تو خوش است

طالب آملی[۱]

الحال بدولت این پادشاه غریب دوست مسکین نواز و این خورشید ذره پرور از همه چیز بی نیاز و سرآمد سخنوران وبر گزیدهٔ نکته پرورانست الهی شگفتگی طبع مشاطگان سخن و به پیرایه بندی دیباچه آرایان صحایف نو و کهن که تا زبان سخن در کام جنبان ست و بنان قلم در کف نقش بندان همواره گلشن اقبال این شهریار نامدار از صرصر حوادث در حفظ (صفحه) و امان خویشتن داری و همیشه ذات ملک صفات این جهانگیر جهاندار را از جمیع آفات مصؤن داشته بر سریر سلطنت متمکن لمولفه ــه

خداوندا بطبع اهل دانش — بنوردیدهٔ اصحاب بینش

---

۱ ـ اس کے حالات مطبوعہ نسخ کی طرح ھیں ـ

بان عشقی که دادی عاشقانرا   بعرفانی که دادی عارفانرا
که شه را چون سخن پاینده داری   چو نام نیک دایم زنده داری

بر معنی طرازان کشور معانی پوشیده نماند که ملک الشعرای این جزو زمان طالبای آملی ساقی نامه نگفته بود این ضعیف از جهانگیر نامهٔ او ابیاتی چند که در صفت بزم جهانگیری و مناسبتی باین کتاب داشت انتخاب نموده درین تالیف حنیف مرقوم قلم پریشان رقم گردانید ۔

مثنوی طالب آملی من جهانگیر نامه

دلا تا توانی کم آزار باش
بهر کار چون عقل هشیار باش

بآزار کس آستین بر بمال
که دستست چرخ از پی گوشمال

درای از در مهربانی درای
کزین در بری ره بجنت سرای

بشیرین زبانی نشین در کمین
بیاموز صیادی از انگبین

ببینی که چون شهد گردد چو قند
بشیرینی آرد مگس را به بند

تو هم ساز شیرین زبانی شعار
بدین دام سیمرغ میکن شکار

زبان شهد ساز و جهان قید کن
بدین باز مرغان دل صید کن

از این دست هرکس بتابد کمند
سر سرکشان را در آرد به بند

ص بحمد الله این شیوه خاص از شه است
شهی کز ضمیر سپهر آگهست

جهاندار عادل جهانگیر شاه
که چترش کله گوشه ساید بماه

ضمیرش یکی صبح صافی دمست
جهان سر بسر زخم او مرهمست

سپهری و با زیردستان بمهر
ز خون خواره و کینه ور چون سپهر

جهانی ولی خاص پرور چون جان
نه خس طبع دون پرورش[۱] چون جهان

برحمت نشانی بعدل آیتی
بخلق از خدا لطف بیغایتی

سلیمان با تاج و انگشترین
ز نام بلندش مثبت نگین

بقصر فلک منزلت قیصری
بآینهٔ خاطر اسکندری

قضا تند شیری بزنجیر او
پر تیر تقدیر تدبیر او

ز فرقش عیان دولت سرمدی
ز پیشانیش فرّهٔ ایزدی

فروزندهٔ اختر مردمی
شناسندهٔ جوهر آدمی

ندیده بچشم جواهر گزین
نگین خانهٔ تخت مثلش نگین

در ایام آن عادل دادرس
ز نوشیروان مانده نامی و بس

نگارنده اگر نام او اختران
بفیروزهٔ هفتمین آسمان

---

۱ - اصل نسخه میں پرورش ہے -

نگین هست بینند و نامش بلند
در آئینهٔ کار چون بنگرند

چو آئینه پیشانیش غرق نور
سرو افسرش نور بر فرق نور

جبینش چو آئینه صبحگاه
تتق بسته نور از رخش تا بماه

نمایان بران روی فرخنده فال
دو ابرو بشکل دو مشکین هلال

کسی کان دو ابرو بران روی دید
بیک ماه دید اتفاق دو عید

بهر مشرب او را ز چشمی نگاه
بدرویش درویش و با شاه شاه

چو گل با بزرگان بهشتی گلی
باطفال چون غنچه کوچک دلی

نه در دور او یکدل از غم دو نیم
نه در عهد او هیچ کودک یتیم

کبوتر ز امنیت روزگار
نهد بیضه در حلقهٔ چشم مار

چو بیند سزاواریش بر سریر
نگین از نگین خانه آید بزیر

سلیمان کزین کوچکه کرد بار
باو داد انگشتری یادگار

بتاجی خوش از حشمت کیقباد
بجامی ز میراث جمشید شاد

همائیست قدرش همایون بفال
ز نه چرخ نه بیضه در زیر بال

زند بحر دستش چو موج کرم
فزون بخشد از فلس ماهی درم

کند چو اشارت بابروی تیغ
خورد آب بر خون آتش دریغ

عجب گر بدوران جودش سحاب
ز دریا کشد منت یکدم آب

جهان از وجودش یکی گلشن است
که هر برگ او اختر روشن است

اگر قبله باشد یکی روی اوست
وگر خود دو طاق دو ابروی اوست

چو از چرب دستیش سنجد کلام
زبان مغز بادام گردد بکام

ز مسکین نوازیش در هر دیار
توانگر فقیری کند اختیار

زند غنچهٔ گل در ایام او
زر خویش را سکه بر نام او

ص رقم سنج این نامهٔ نو سواد
عذار ورق را چنین رنگ داد

که طی شد چو از سال هجرت هزار
دهش بر سرو بر سر ده چهار

شهنشه گرفت از لب جام بوس
بر اورنگ بنمود عزم جلوس

دو آواره یابی بدشت عدم
بعهدش یکی فتنه دیگر ستم

سران سپه را چو شد آگهی
چه سلطان سلیمی چه اکبر شهی

ز شادی چو گل چهره افروختند
سپند از پی چشم بد سوختند

نمودند دلها یکی با زبان
بشکر جلوس خدیو زمان

بترتیب بزم آنگهی خواستند
ملوکانه جشنی بیاراستند

سراپیانها فلک سای شد
چو گردون بسی خیمه بر پای شد

ز بس اشعهٔ لعلی و گوهری
هوا شد مرصع چو بال پری

ز بس فرش رنگین فضای زمین
چمن شد ز گلهای ابریشمین

زمین هر قدم قابل بوس گشت
نگارین تر از بال طاؤس گشت

چو شد محفل از فرش رنگین بهار
زمین گشت چو آسمان پرنگار

نهادند تختی سزاوار بخت
فکندند در خورد آن تخت رخت

مربع سریری بصد آب و تاب
ز گوهر پر و انجم بی حساب

ولی انجمش کام بردار نی
همه ثابت و هیچ سیار نی

ز بس آتشین گوهر شب فروز
ازو انجمن در چراغان روز

بهر قبه با چرخ دست آزمای
بهر پایه بر عنصر مانده پای

ص سزاوار اورنگ را چون هما
بر اورنگ اقبال دارند جا

نگین خانهٔ تخت دولت نشین
چو از گوهر شاه شد با نگین

لب تهنیت رشته از در کشید
مبارک مبارک بگردون رسید

سخن گستران تهنیت خوان شدند
ز درج ثنا گوهر افشان شدند

ز بس گوهر آفرین شد نثار
گران گشت بر گوشها گوشوار

دهل چاک زد پردهٔ گوش بر
بغرش درآمد چو زخمی هزبر

بسیرا فلک شد خروش نفیر
برآورد نی همچو بلبل صفیر

جلاجل فغان بر ثریا رساند
جرس شور بر چرخ اعلا رساند

سران در نثار درود آمدند
چو هفتم فلک در سجود آمدند

فلک را ز سرتاج یکسر نهاد
ز بس دست تسلیم هر سر نهاد

چو غوغای شادی بلندی گرفت
دعاها اجابت پسندی گرفت

وزان گشت از می نسیم فرح
بگردید چون چشم ساقی قدح

بهر گوشه جام می خوشگوار
بگردش درآمد چو چشمان یار

---

۱ - اصل نسخه : "بسر"

صراحی بدست سبو داده دست
برقاصی آمد چو طاؤس مست

می زعفران رنگ شد گلفشان
بدل داد خاصیت زعفران

مغنی چو بلبل درآمد بکار
بنالید چنگ و بدرید تار

بدل ناخن نغمهٔ رنگ رنگ
همی کرد بیداد چنگ پلنگ

نفس عنبرین ساخت مجمر ز عود
بگردون فرستاد مشکین درود

ص باتش در آمد ز نزدیک و دور
برسم عروسان هندی بخور

بجنت شد از عطر مجلس پیام
پیامی که آسوده سازد مشام

بود هر پیامی سزاوار گوش
پیام گل و مل سزاوار هوش

تو گفتی همه آهوان طراز
سر حقهٔ نافه کردند باز

ز هر جنس می بزم را رنگ داد
چه شکر نزاد و چه انگور زاد

بهر گوشه از نقل شیرین و شور
گهر سنج شد کاسهای بلور

قدح شکرین ساخت لب چون عروس
گهی بوس بگرفت وگه داد بوس

هرآن بوس تر کز لب شیشه خورد
بدست بلورین ساقی سپرد

بدان بوسه صد عشوه ساقی فزود
بساغر پرستان تکلف نمود

برگهای ساز اندر افتاد سوز
وزان سوز شد نغمه مجلس فروز

ز هر سو بآهنگهای حزین
روان شد زبانهای ابریشمین

بریشم ز بس نور بردل کشاد
تو گوئی ز کرم شب افروز زاد

بهر گوشه حوری وشی در سماع
ز آشوب می باپری در نزاع

ز شادی گل افشان زمان و زمین
گهی دست رقاص و گه آستین

ز بس رقص طاؤس می در مزج
برقص مدروان نماند احتیاج

رخ ساقی از باده گرداند رنگ
طلا گشت اما بآتش بچنگ

نسیم گل از دور ساغر وزید
گل نرگس از دست ساقی دمید

بط باده را آب از سرگذشت
بدریای می از درون غرق گشت

سبو بوسه ده شد قدح بوسه گیر
به پستان خم میشد از بهر شیر

بدان شیر بنمود هر می گسار
دهن باز چون کودک شیر خوار

جهاندار پیمانه بر لب گرفت
گلاب از گل باغ مشرب گرفت

ز می کرد پیوند گل باعذار
ز گل بست پیرایهٔ نو بهار

به طبعش چو گلگون می گشت گرم
عنان سخا در کفش گشت نرم

سران سپه را سر افراز ساخت
بالطاف شاهانه ممتاز ساخت

بپارید زانگونه باران جود
که شد سبز هر شاخ سبزی که بود

ز کف سیل احسان بدانگونه راند
که در هفت اقلیم مفلس نماند

نه همت ز می شاه بگرفت یاد
که می راست شه در سخا اوستاد

توهم در کرم ساقیا شو سحاب
بیاموز همت ز طبع شراب

که رخ بر فروزیم چون صبحگاه
بعهد جلوس جهانگیر شاه

بمن ده یکی جام بی انتظار
بشیرینی وعدهٔ وصل یار

که اندرزی از بهر تو سر کنم
که گوشت لبالب ز گوهر کنم

دلا در مقام ادب پافشار
مر این پایه را بخت عالی شمار

ادب ساز تعویذ بازوی خویش
درو جوی وزن ترازوی خویش

ادب مرد را پاسبان تنست
بدفع خدنگ بلا جوشنست

چه کوشش کنی دستیار تو اوست
چو بیچاره گردی حصار تو اوست

بهر بزم عزت فزائ دهد
بصدر شرف آشنائ دهد

ص بیازد هر انکس که این مهره بست
ز سنگ حوادث نیابد شکست

اگر کام جوئی ادب جوی باش
بسیلیش چون برخوری روی باش

ازو هرکه سر تافت از پا فتاد
بیکبار از طاق دلها فتاد

ادب سبز شاخی ست با برگ و ساز
گلش دولت و میوه عمر دراز

بکوش ای جوانمرد ثابت قدم
کزین شاخ گل چینی و میوه هم

ادب جوی را پاسبانی بجاست
توهم پاس او گر بداری رواست

بود فرض پاس تن و جان و سر
و زین جمله پاس ادب فرض تر

فلک فتنه جوئیست ناپایدار
سر او را قضا و قدر دستوار

فروزد کواکب چو گلهای باغ
کند فتنه جوئی بچندین چراغ

جهان دلخراشیست حیله تراش
برای خرابی وسیله تراش

بخوش طینتان۱ همنشینی کند
نهد عینک و پیش بینی کند

---

۱ - اصل نسخه : تهنتان .

ز هر فتنه انگیز گیرد کنار
وگر خود بود گوشهٔ چشم یار

ز راه خسان در نوردد بساط
به سنبل مزاجان کند اختلاط

بهم جنس خود انس گیرد مقیم
چو می با مغنی چو گل با نسیم

برای فضولان بگردد ز راه
بتدبیر خاسان نیفتد بچاه

ز هم صحبت بد گریزد چو باد
که نبود گیا را ببرق اعتماد

نبینی که چون مه نشید بمیغ
نچینند گلی جز فسوس و دریغ

تن کار زان باشد از خاک پاک
رخ خاک بیزان بود گرد ناک

ص بود سبزه زیبا بصحن چمن
شود زشت چون بردمد از دمن[۱]

گهر با خزف چون کند اختلاط
تمیز از میان در نوردد بساط

چو از راه ترکیبه و راه گذشت
موثر بود صحبت خوب و زشت

نسوزی بسود ای باطل دماغ
بظلمات بر نگذری بیچراغ

رهی پیش گیری بهنگام سیر
که باشد سر انجام آن کار خیر

بیا ساقی آن آبروی بهار
که گل بشگفاند ز باغ بهار

---

۱ - نسخه اصل به نقاط شک -

بمن ده که خیر منست اندران
اگر چه بود آب شه نام آن

رقم سنج دیباچهٔ ماه و سال
چنین رد به پیشانی صفحه خال

بروزی ز نوروز عشرت فزا
که روز شرف بود خورشید را

بکابل بر آراست جشنی بباغ
که نوروز جمشید را کرد داغ

بسطح هوا ز اطلس سایبان
ز نو شد یکی چرخ اطلس عیان

ز بس فرش رنگین زمین بوس کرد
چمن خنده بر بال طاؤس کرد

زمین پر گل و فرشها پر نگار
گل اندر گلی طرح شد چون بهار

جهان روز زیبائی از سر گرفت
طرب عیش را تنگ در بر گرفت

یکی خرمن گل بر افراختند
وزان تخت شاهنشهی ساختند

جهاندار بنشست بر تخت گل
بصد کامرانی زهی بخت گل

برغبت لب جام بر لب گرفت
گلاب از گل باغ مشرب گرفت

امیران لشکر بپا ساختند
چو فوج ریاحین صف آراستند

ص خرامنده شد ساقی خوشخرام
گهی چشم در گردش و گاه جام

می آمد بمجلس چو رنگین بهار
وزو چهرهٔ بزم شد لاله زار

می دوستکامی بساغر پرست
که از دست دادی که از چشم مست

درآمد نواهای مستان بگوش
می تلخ شیریں شد از نوش نوش

نگردد مگر گرد ارباب خیر
بشوید غبار شر از آب خیر

سپارد همی دل بتدبیر امن
سر فتنه بُرّد بشمشیر امن

به پیوند نیکان گرایش کند
بدان را به تیغ آزمایش کند

صراحی ز سر تاج زرین فکند
قدح شد بتعظیم او سر بلند

زمین بسکه صحن چمن بو گرفت
هوا طبع بیهوش دارو گرفت

بگردن نشی شیشه طاؤس شد
لب جام آمادهٔ بوس شد

لطافت ز بس ریخت بر انجمن
دم از روح زد عضو عضو بدن

ز رقاصی شاهدان بر بساط
همه بزم شد پر عبیر نشاط

بگردون رسانید غریوا خروش
بعجز آمد از بانگ خلخال گوش

چو لرزید بر تن لباس حریر
هوا موج زد موج مشک و عبیر

---

۱ - یہ لفظ مشکوک ہے۔

سر میکشان گرم گشت از شراب
چو مغفر ز تابیدن آفتاب

بهر سو صفی شوخ چشمان سبز
فراهم چو یکدسته ریحان سبز

لب از برگ تنبول یاقوت رنگ
دهان بر گهر کار بگرفته تنگ

سبک شد ترازو ساقی ز جام
که میکرد در کاسهٔ سر مقام

خم باده قالب سبکبار کرد
سبکروحی می درو کار کرد

بط می دران بزم دریا نمود
دمادم زدی غوطه در آب جود

تذروان برقص طرب خاستند
پر و بال عشرت بر آراستند

شد از جرعهٔ می کشان روی خاک
برنگ سهیل یمن تابناک

بر آورد ابریشم از دل خروش
جگرها تراشیده از راه گوش

روان کرد از چشم مستان شراب
فرو ریخت زانسانکه از چشمه آب

که ساقی ز مخموری چشم مست
بسی شیشه بر طاق دلها شکست

شد از زخمه مضراب مطرب کبود
ز ناخن زدن ناخنش گشت سود

تراویده شد نغمه بیحد ز نار
چو آبی که گردد روان ز آبشار

ابورغال (ع) بکسر رای و عین مهمله یا غین معجمه ، نام مردی -

ابوزرجمهر (ف) وزیر نوشیروان و آنرا بزرجمهر و بوزرجمهر نیز گویند -

ابوزنه (ع) به تشدید نون ، کنیت بوزنه معروف -

ابوزید (ع) نام شاطری و واضع مقام حریری -

ابو سریح (ع) نام سرودگوی -

ابوالشفا (ع) شکر -

ابوشه (ف) نام عمه شاپور که در مقام اصطرخ بود و در دستور بدین معنی با نون است [1] -

ابوالطمع (ع) خداوند طمع و نیز کنایه از مردی طامع مشهور -

ابو طیب (ع) عطرفروش -

ابو عاصم (ع) کنیت صحابیست که عرب آنرا کنیة ذوالسویق[2] نیز خوانند -

ابوالعجیب (ع) آنچه شگفت تر باشد و کنایت از بازیگر -

ابوالعلا (ع) پالوده و نام شاعر فصیح عرب -

ابو علی (ع) نام حکیمی پسر سینا وزیر فخرالدوله پادشاه ری و نیز نام طبیبی و نیز نام شاعری که او را ابو علی دقاق گفتند -

ابوالعیزار[3] (ع) بفتح عین مهمله و زای معجمه ، مرغ درازگردن که همیشه در آب بود و ماهی گیرد -

ابوالغیاب (ع) آب -

ابوالغیاث (ع) شراب و قیل آب -

ابوالفضل (ع) بمعنی خداوند فضل و نام کارکن سلطان محمود -

ابوقلمون (ف) کرفس دشتی بحذف همزه نیز و نیز جامه ایست رومی بغایت لطیف و در مویداست مرغیست بر کوه پر رنگ چون شب در آید آتش نماید و آوازی سخت نیکو دارد و نیز گفته سبز جانوریست از حربا قدری بزرگ که در صبح برنگی و درمیانه روز برنگی دیگر و شب برنگی دیگر نماید ، گویند شخصی سیاحی آورده بود چنین بود ، و در شرفنامه

---

۱ - در موید انوشه و اتوشه بتای قرشت بدین معنی آورده است -

۲ - سویق پست که بهندی ستو گویند -

۳ - نام دیگر سبطیر است - (لغت نامه)

است کنیت حرباست که پارسی آفتاب پرست گویند چنانکه گذشت -

ابوقیس[1] (ع) بکسر قاف ، شغال -

ابوالمجد (ع) و قیل امجد نام پیغمبر ما و نیز نام شاعری -

ابومره (ع) بضم میم ، کنیت ابلیس -

ابوالمضاء (ع) اسپ -

ابوالملیح (ع) چکاوک یعنی سرخاب -

ابوالمهنا (ع) شراب -

ابون (ف) راسن ، در موید از طب نقل کرده بمعنی چینه [2] -

ابوالهیجا (ع) کنایت از امیر المومنین علی است -

ابویحیی (ع) کنیت ملک الموت -

ابویقظان (ع) بقاف و ظای معجمه خروس -

ابهام (ع) بیای نقطه ، مجهول گذاشتن و بسته کردن و بیرون آوردن زمین نبات بهمی را و بهمی نوع است از خار و گویند جودر است و بمعنی انگشت نر -

ابهت (ع) بضم و بتشدید بای ، بزرگی و بزرگواری -

ابهد[3] (ف) بفتح و ضم ثالث ، نام داروی که آنرا اورس نامند و هاوبیر نیز گویند -

ابهل (ع) بوزن و معنی عرعر و قیل درخت آبنوس و در موید است درختی که او را ابرس خوانند و هندش هاوبیر و بدین معنی ابهد بدال نیز گذشت -

ابهول (ف) همان اصل السوس مذکور -

ابی (ع) پدر من و بمد ، سرباز زننده ، فارسیان بمعنی جانوران آبی و میوه [4] که عرب سفرجل خوانند استعمال کرده اند -

---

۱ - سگ - کلب - شغال - ابووائل - حمدونه - بوزینه - (لغت نامه)

راسن - زنجبیل شامی - (لغت‌نامه) 2. Elecampane, ginger. (Johnson), ابون و راسن و زنجبیل شامی و elecampane چیز یکی است اما برای ''چینه'' شاهدی یافته نشد - گمان می رود که این تصحیف است - (م - ب)

۳ - ابهل - صفینه Sabina نوعی ازعرعر و سرو کوهی و کوکلان و ورس وارس و اورس و صاحب غیاث اللغات گوید : ابهل تخم سرو کوهی است که بهندی هاؤبیر نامند - (لغت‌نامه)

۴ - نوعی از انگور کبود نیمرنگ و میوهٔ معروف و بدین معنی فارسی ماوراءالنهرست و آنرا در خراسان بهی و در فارس و عراق به گویند و بعربی سفرجل خوانند - (فرهنگ آنند راج)

ایبار[1] (ف) نوعی از جامه ـ

ایبر[2] (ف) سرشک آتش و قیل بدین معنی بزای پارسی است ـ

ابیض (ع) سفیدتر و هرچه سفید باشد و در شرح نصاب اسپ و شمشیر و جوانی و نام کوهیست ـ

ایبق (ف) نام داروی موی ریزی و در حل لغاتست اِبنوق نام داروی مذکور که بکدوی تلخ استعمال کنند ـ

ایبل[3] (ع) سر زاهدان ترسا ، ایبلون جمع آن ـ

ایبل الابیلین[4] (ع) کنایت از حضرت عیسیٰ علیه السلام و معنی ایبل مذکور شد ـ

[ایبون] رک : افیون ـ

ابیون (ف) بیای پارسی ، داروی بیهوشی که آنرا در شراب اندازند[5] ـ

اِت (ف) بفتح ، بمعنی تو و آنرا در مرکبات استعمال کنند چنانچه بندهات ـ

اَتا (ت) بفتح ، در سکندریست بکسر ، پدر ، بضم ، تلخه ـ

اَتابک (ف) بفتح ، ادب آموز کودکان و گوشه گیر کانرا ازینجا گرفته اند و گویند لقب بادشاهان شیراز ، در شرفنامه است سبب آنکه سعد زنگی اتابک سلطان سنجر بود ، شبی در حالت مستی سعد زنگی و سه نفر دیگر را بادشاهی داد ، بعد وفات ایشان بادشاه شدند و برخود همان لقب قدیم مستقیم داشتند و اطلاق لفظ بادشاه بر برادر زاد های سلطان کردند

اَتان (ع) ماده خر ، در شرح نصابست و سنگ گازران که درمیان آب باشد ـ

اِتب[6] (ع) بکسر ، دواج یعنی قبا و دواج کف ـ

اِتّباع (ع) بکسر و تشدید ، پس روی کردن و درپی فرستادن و رسیدن بکسی و در سخن دو لفظ پی یکدیگر آوردن که بیک سجع باشند چون خس و بس و بفتح و تخفیف جمع تابع ـ

---

۱ ـ مؤلف برهان قاطع ''ایباری'' نوشته و غالباً تصحیف است ـ
۲ ـ آبیز و آبیز و آبید و ایبد و آبیر و آبثر و آبیژ و صور دیگرهمه مصحف این کلمه‌اند ـ (لغت‌نامه)
۳ ـ ایبل ـ زاهد ترسایان و کان یسمی عیسیٰ علیه‌السلام ایبل‌الابیلین ـ (صراح)
۴ ـ ایبل‌الابیلون ـ (ا.) ۵ ـ رک : افیون ـ
۶ ـ جامهٔ که از میان قواره برگیرند و در گردن اندازند بی آستین و بی گریبان (لغت نامه)

اتبج[1] (ف) بضمتین ، دام -

اتحاف (ع) تحفه دادن -

اتراك (ع) جمع ترک بضم -

اترت (ف) بضم یکم و سیوم ، نام پادشاهی -

اتساع (ع) به تشدید ، فراخی -

اتسیز[2] (ف) بفتح یکم و کسر سیوم ، بادشاه خوارزم ممدوح رشید وطواط ، گویند زمخشری نیز در آن دور بوده ، در طبقات ناصریست امام الرشید وطواط کتاب حدایق السحر باسم او تصنیف کرده است ، نامش جلال الدین اتسیز بن خوارزمشاه است ، در عهدی که در آن ایام بدرگاه سنجری بود اورا با سلطان علاؤالدین غوری جهانسوز بواسطه فضل محبت تام افتاد تاحدی که چون سلطان علاؤالدین در تخت غور باز آمد خدای تعالی پسری بخشید اتسیز نام کرد -

اتقان (ع) بکسر ، کاری محکم کردن -

اتک (ت) بفتحتین ، دامن ، کذافی المؤید و در شرفنامه و در سکند ریست

اتلاف (ع) هلاک گردانیدن

اتلیکان[3] (ت) بکسر ، پروردگار -

اتماچی (ت) بفتح و جیم پارسی ، دلال -

اتمک (ت) بکسر[4] ، نان -

[اتوشه] رگ ابوشه -

اتوک (ت) بفتح ، موزه -

اته (ت) بضم ، پدر نسبی -

اتی[5] (ت) هفت -

اثاث (ع) بفتح ثای اول نیز ، رخت خانه -

اثام (ع) بثای مثلثه ، عقوبت و نام وادی است در دوزخ -

اثبات (ع) بجا داشتن و نبشتن نام در دیوان و ثابت کردن -

اتیاق (ع) بثای مثلثه ، طلب

---

۱ - ترکی (موید)

۲ - اتسیز (بفتح اول) ترکی بمعنی بی نام اتسیز (بکسر اول) بمعنی بی گوشت و لاغر است (Courteill) - مرکب از آت = آد بمعنی نام و سز ، ادات سلب ، مجموع کلمه بمعنی بی نام است و این تفالی است ماندن و نمردن کودک رادر بلاد ترکستان وکلمه دوم مرکب از ات بمعنی گوشت و سز ادات سلب (لغت نامه) -

۳ - ایلتکان (موید) ایلتکان (شرفنامه) ۴ - بالفتح (موید و فرهنگ آنندراج)

5. Yedi. (Fahir iz & Hony)

اعتماد کردن -

اثجل (ع) بثای مثلثه و بفتح جیم ، بزرگ شکم -

اثر (ع) بفتحتین ، نشان و نشان زخم و سنت نبوی و بکسر ، پس و درحل لغاتست و گوهر و شمشیر و اثر بکسر نیز بمعنی نشان و روغن خالص آید -

اثفیه (ع) بثای مثلثه و تشدید ، دیگ پایه کذافی النصاب -

اثلث[1] (ع) بثای مثلثه ، خاک سنگ ریزه -

اثلم (ع) بثای مثلثه ، رخنه -

اثم (ع) بکسر همزه ، بمعنی بزه و زنابوده و بمعنی می نیز آمده -

اثنای (ع) بثای مثلثه و نون ، جمع ثنی بفتح ، دو تا کردن و در شکستن لبهای دامن و آستین و بازگردانیدن و دویم شدن دیگری را ، فارسیان بمعنی میان استعمال کرده اند چنانچه گویند درین اثنا -

اثول (ع) مثله[2] بفتح یکم و سیوم ، احمق و دیوانه -

اثیث[3] (ع) بثای اول نیز ، پرموی -

اثیر (ع) وزن خبیر ، آسمان ، دنیا و کره آتشین که عنصر اعلی عناصر اربعه است آنرا چرخ اثیر نیز گویند و قیل فلک الافلاک بلندی هر چه باشد ، درموید است آفتاب و سرشک آتش -

اثیم (ع) بزه کار و دروغ گوی -

اج (ف) بضم[4] ، کدو -

اجاج (ع) بضم ، شور و تلخ -

اجاره (ع) معروف و مزدوری و اجرگرفتن و رهن داشتن -

اجازه (ع) رخصت دادن ، در تاج است بمعنی روا داشتن -

اجاعه (ع) گرسنه شدن -

اجام (ع) بکسر و فتح و بمد و اجم بضمتین جمع اجمه بمعنی بیشهٔ شیر -

اجی[5] (ت) بالفتح ، برادر کلان -

---

1. اثلب Earth or stones or small fragments of either (Johnson).

۲ - رک : اثجل

3. *aşiş*, luxuriant, entangled (as shrubs or hair) (Johnson).

۴ - بفتح اول و سکون (برهان‌قاطع)(Hony)

5. *Agabey*, Elder brother

اجترا (ع) دلیر کردن ـ

اجترام (ع) بجیم ، گناه کردن وبحای مهمله ، حرمت داشتن ـ

اجتماع (ع) گرد آمدن و نام شکل پانزدهم از علم رمل بدین شکل ⁝ و در شرفنامه شکل چهاردهم گفته اما اول اصح است ـ

اجتناب (ع) جنب شدن و پرهیز کردن و دور شدن ـ

اجتیاح (ع) از بیخ بر کندن[1]

اجدان (ع) بفتح یکم و تشدید سیوم ، روز و شب ـ

اجدع (ع) بریده بینی ـ

اجدل (ع) چرغ[2] ، اجاول جمع آن ـ

اَجر (ع) بفتح ، پاداش و مزد و علوفه ، و بضم جیم و تشدید را ، خشت پخته ـ

اجرا (ع) بکسر و سکون جیم ، بمعنی راندن و مصطلح اهل حساب آنکه چون صاحب خرج را مجرا دهند و صحیح کنند گویند اجرا کرد چنانچه چون قاضی سجل کند ویا صدر تصحیح نماید امضا گویند ـ صاحب موید گوید بمعنی وظیفه داران غلط است زیرا آنچه در صراح جرایه بکسر جیم باین معنی است و در شرح مخزن کم کن اجرا بمعنی مجرا آمده است ـ

اجرام (ع) بجیم ، آسمانها و سیارات و ثوابت ، صاحب موید گوید جمع جرم بکسر است و معنی آن تن و گونه و آواز است ـ

اجرام چرخ (ف) افلاک و کواکب ـ

اجرام سماوی (ع) ستارگان ـ

اجره (ف) نکه خارهای بازگونه دارد ، هند چر چره[3] گویند ـ

اجز[4] (ت) بضمتین ، ارزان بها ـ

اجسام (ع) جمع جسم بکسر ، تن

اجع (ت) تلخ و شور و ترش ـ

اجفان (ع) جمع جفن ، پلک چشم و نیام شمشیر ـ

اجل (ع) مثلهٔ[5] بمعنی مهلت ، مرگ و موت ـ

---

1. Ruining, destroying (Johnson).

۲ ـ طائرشکاری است (فرهنگ آنندراج)

3. The plant *Achyranthes aspera* (Platts).

۴ ـ اوجوز *üjuz*, Cheap (Redhouse)

۵ ـ رک : اسل

اجلّ (ع) بمعنی بزرگ و در براهیمیست بمعنی آروغ و بفتحتین و تشدید ، بزرگتر ، بمد و کسر جیم ، بجهان چنانکه عاجل عکس آن ـ

اجل[1] گیا (ف) زهر

اجلواذ (ع) بکسر یکم و سیوم و بتشدید واو ، شتافتن شتر ـ

اجله (ع) وزن اعزه ، بزرگان ـ

اجم (ع) بفتحتین ،بیشهٔ شیر ـ

اجماج (ت) بوزن الماس و در براهیمی است بضم ، بهشت و در سوید بخای معجمه جیم اخیر حای مهمله نیز گفته ـ

اجماع (ع) عزم کردن و براهم آمدن و اتفاق کردن بر چیزی

اجماح (ف) بضم ، همان[2] که در جیم گذشت ـ

اجمال (ع) جمله کردن و بجمل گردانیدن ضد تفصیل ـ

اجمال التفصیل (ع) معنی ترکیبی معلوم و مصطلح اهل معانی آنکه ، کلام اول بر طریق اجمال آرند و بعد ازان بعبارتی دیگر تفصیل آن کنند ـ

اجمر (ع) درپنج بخشی است بجیم پارسی ، دود فانی ، بزرگ خراسانی گوید در حل لغات اجمر جانوری است دریای که بماهی ماند واز غلبهٔ موجها در کنار افتد و در انتظار باز آمدن امواج در جای خود هلاک شود ـ

اجمود (ف) بوزن فرمود ، اجواین خراسانی و در بعضی طب است بمعنی کهور اجواین ، بمد نیز ـ

اجموده (ف) همان اجمود مذکور

اجمه (ع) بفتح ، بیشهٔ شیر ـ

اجناس (ع) بفتح جمع جنس ، و مصطلح دفاتر اکبر شاهی و آن که سپاهیان را سوای نقود در وجه علوفه ایشان دهند و ازیاس نیز گویند ـ

اجنحه (ع) جمع جناح بازوهای مرغان ـ

اجهر (ع) آنکه چشم او در آفتاب خیرگی کند ، و در مهذب بروز کور گفته ـ

اجیج (ع) بفتح وجیم دوم ، زبانه زدن آتش ـ

---

۱ ـ (بکسر کاف فارسی)
۲ ـ رک : اجاج

[اچاکو] - رک- ایچکو -

احاطه (ع) گرد کردن و دانستن و در گرفتن -

احبا (ع) بفتح یکم و کسر دوم بتشدید ، دوستان -

احباب (ع) دوستان -

احبال (ع) جمع حبل بفتحتین ، آبستن[۱] -

احتباس (ع) باز داشتن و باز داشته شدن -

احتراز (ع) پرهیز کردن باماله نیز آمده -

احتراص (ع) دروغ گفتن -

احتراق (ع) سوختگی ستاره وغیر آن -

احترام (ع) (بحای مهمله ، رک : اجترام) حرمت داشتن -

احتساب (ع) معروف و مردم چشم داشتن و در شمار آوردن -

احتشام (ع) شرم و یا هراس داشتن -

احتطام (ع) شکستن -

احتفال (ع) بفا ، پاک داشتن و گرد آمدن -

احتما (ع) بکسر ، خویشتن را از چیزی نگاهداشتن -

احتمال (ع) باربرداشتن وقبول کردن و در محل اشتباه نیز مستعمل است ، چنانچه گویند احتمال دارد چنین باشد و بمعنی می شاید و میتواند -

احتیال (ع) حیله ساختن و حواله پذیرفتن -

احد(ع) بفتحتین ، یکی و بضمتین نام کوهی و نام جنگی که در آن دندان مبارک حضرت رسالت پناه شهید شده بودند -

احداث (ع) بکسر ، نوپیدا آوردن ، بفتح ، جمع حدث بمعنی بی وضو -

احدب(ع) بحای مهمله ، کوز -

احدل[۲] (ع) بفتح ، بحای مهمله و ذال معجمه ، بی مژه -

احراز (ع) درپناه گرفتن -

احرام (ع) بحای مهمله ، در حرم شدن و در ماه حرام شدن و باز داشتن کسی را از چیزی وحرام کردن و در عرف شرح احرامی که در راه مکه ببندند -

احران (ع) گوشت و شراب -

۱ - حبل بفتحتین ، بارشکم (صراح)
۲ - حذل بالتحریک ، افتادن مژه (صراح)

احساس (ع) بکسر ، دیدن و دریافتن و بخای معجمه خست و کمینگی کردن ـ

احسنت (ع) بفتح ، در محل شاد باش استعمال کنند و معنی صنعی نیکوی کردی ـ

احسن تقویم (ع) روی خوب و در بعضی تفسیر راست قامت و نیکو سیرت ـ

احشا (ع) بفتح ، جمع حشا ، درون تن کذافی المؤید ـ

احشام (ع) بفتح ، طایفه صحرا نشین و جمع حشم و در بعضی فرهنگ بمعنی اول باخای معجمه نیز آمده ـ

احص (ع) بحای مهمله و تشدید آخر ، بد اختر ـ

احصا (ع) بکسر ، حصر کردن ، شمردن و درحل لغاتست شمردن برسبیل اهتمام و دانستن و توانستن ـ

احصف (ع) اسطرلاب

احفاظ (ع) بکسر ، نگاهداشتن

احق (ع) بفتح ، سزاوار تر و آن اسپ است که پای در زمین هانجا نهد که دست نهد و آن اسپ که عرق نکند ـ

احقاد (ع) جمع حقد بمعنی کینه

احقب (ع) گورخری که تهی گاه او از هر دو طرف بود ـ

احکام (ع) استوار گردانیدن و بفتح ، جمع حکم ـ

احلام (ع) جمع حلم بضم ، و آن مردیست که خواب شونده در خواب بیند که آن علامت بلوغ است

احمد حسن (ع) نام وزیر سلطان محمود سبکتگین و نیز سر لشکر دریا ـ

احمد زمجی (ع) یکی از سران لشکر ابو مسلم مزوری است که بسیار بهادری و جلادت نموده ـ

احمر (ع) بفتح یکم و سکون دوم ، سرخ و نام جانوری مانند سگ در زمان سلوا شاه پیدا شده بود ، بعد ازان کسی ندیده ودر تاج است مردی بی صلاح و مرگ سخت امابدین معنی برای معجمه مصحح است چنانکه گویند موت الانتظار احمر کذافی المؤید ، در ابراهیمی و سکندری است اهمر[1] بهای هوز معنی

---

[1] ـ اهمر بروزن احمر ، شغال را گویند وآن جانوریست مانند سگ لیکن از سگ کوچکتر است گویند در عهد کسری بهم رسیده و پیش از آن نبوده ـ (برهان‌قاطع)

جانور مذکور و نیز در موید است درفصل پارسی ـ

احمس (ع) دلیر ـ

احمش (ع) باریک ساق ـ

احناق[1] (ت) بضم ، سنگ و نیز بمعنی خوی ـ

احنف (ع) در صراحست نام مردیست که اورا صخر نیز گویند و هم درصراحست صخر سنگ بزرگ و پسر عمر و برادر خنساء که آن نام زن مشاعراست ـ

احوا (ع) بمعني درگیرنده تر ـ

احواج (ع) بمعنی جمع حاجت ـ

احور (ع) نام ستاره مشتری و کسی که سفیدی چشم او سخت سفید و سیاهی سخت سیاه باشد ـ

احول (ع) گاز چشم یعنی آنکه یکی را دو بیند ، لمؤلف :

احولا دور کن دوئی زنظر
در ره عشق یار شو یکتا

و نیز سید جعفر سرهندی :

احول اردید یکی دو چه عجب‌دورا چار
وین چار دویک کار همه کور انست

احیا (ع) بکسر ، زنده کردن ـ

احیاز (ع) بفتح و سکون حای مهمله ، بمعنی اطراف ـ

احیان (ع) جمع حین ، زمانها و بمعنی عوام نیز آمده ـ

احیانا (ع) زمانی و گاهی از زمانها ـ

اخ (ع) برادر ـ فارسیان در محل آفرین استعمال کنند ، اخ اخ همچو بح بح و مکرر گویند ـ

اخاذ (ع) بکسر ، خوض و بفتح و تشدید بسبار گیرنده ـ

اخبیه (ع) بخای‌معجمه و بفتح یکم و کسرسیوم ، ستاره[2] ، نیز جمع خیمه ـ

اختاسهیل (ع) آن دو ستاره که عرب شعریان خوانند ـ

اختتام (ع) ختم کردن و آخرکار ـ

اختر (ف) فال نیک و ستارهٔ نیک وطالع و نام منزلی ازمنازل ماه و علم و رایت و نام فرشته ایست که در عالم آمین گویان میگردد و هر دعای که

---

۱ ـ احساق (موید)

۲ ـ موید ـ خبا ، ککتاب داغی که بر موضع پوشیده نهنند از ناقه نجیب ، اخبیه (آ ب یَ) جمع ، وخرگاه و خیمه (منتهی الارب) نام منزل بیست و چهارم از منازل قمروآن چهار ستاره است نحس (غیاث)

بآمین او پیوسته باجابت میرسد، موافق این معنی است ؎

هر آن فالی که از بازیچه برخواست
چو اختر میگذشت آن فال شد راست

و موید بعض ازان معنی این ابیات فردوسی :

بتازید کاید نزد سپاه
چو ترکان بدیدند اختر براه
چنین گفت هومان که این اختراست
که نیروی ایران بدان اندراست
نکو اختران دان که دخترش نیست
چو دختر بود روشن اخترش نیست

در موید از لسان الشعراء است و یکی ازان هفت ستاره هر که باشد و در قنیه بمعنی فال گیرو منجم است ـ

اختراع (ع) از خود پیدا کردن و چیزی بر انگیختن ـ

اختران تب زده (ف) ستاره های که از غایت تابش در آب نمایند، در سکندریست ستارهای لرزان وگردان ـ

اختر دانش (ف) مشتری و عطارد یا بمعنی اضافت بیانیه ـ

اختر سرسبز (ف) ستاره سعد و فال سعد و قیل سعید ـ

اختر شناس (ف) منجم ـ

اختر کاوان (ف) بکاف تازی، علم فریدون که قصه اش مذکور و مشهور است و در ضمن درفش کاویانی بتفصیل مذکور خواهد شد و اورا **اختر کاوانی و اختر کاویان و درفش کاوان و درفش کاویانی** نیزگویند، چنانچه فردوسی در شاهنامه:

فروزندهٔ تاج و تخت کیان
فروزندهٔ اختر کاویان

[اختر کاوانی] رک : اختر کاوان

[اختر کاویان] رک : اختر کاوان

اختر هفتم (ف) زحل ـ

اختسان (ف) نام بادشاهی ـ

اخشیجان (ف) با یای پارسی جمع آخشیج که مذکور شد ـ

اختگان (ف) بفتح جمع اخته، بمعنی آخورمک و اورا میر آخور نیز گویند، چنانچه درین بیت استاد[۱]

شب قضیم اختگانت ز ارتفاع سنبله
میکند حاصل بدوش کهکشان می آورد

اختل[۲] (ع) نام شاعری ـ

اختلاط (ع) بکسر، آمیختن ـ

---

۱ ـ بالفتح جمع اخته که اسپ خایه کشیده را گویند چنانچه درین بیت سلمان ساوجی :
شب قضیم اختگانت ز ارتفاع سنبله می کند حاصل بدوش کهکشان می آورد
۲ ـ اخطل نام مردی (صراح) لقب شاعری است مشهور در عرب (فرهنگ آنندراج)

اختلاع (ع) بلام مشتق از خلع ، بیرون کردن جامه و جز آن و خلعت دادن -

اختلال (ع) خلل پذیر شدن -

اختلام (ع) معروف و بخای معجمه سخت گرم شدن و زبانه زدن آتش -

اخته (ف) بوزن تخته ، اسپ ۱ -

اخثاء البقر (ع) پاچک دشتی -

اخچه (ف) بجیم پارسی ، مهر و درم که از نقره و زر سازند ، **اقچه** بضم و جیم پارسی ، چیزی که در کشت نصب کنند ، هند آنرا دهو که گویند در ابراهیمیست همان اخچه مذکور ، آقچه ، باقاف و مد نیز آستاد :

شاهد طارم فلک است زدیو هفت سر
ریخته بهر دریچه اخچهٔ زر مشتری

اخدب (ع) بخاء معجمه ، دراز و ابله -

اخدم (ع) بخای معجمه ، آن اسپ که پای وی بجای خلخال سفید باشد -

اخدود (ع) بفتح ، شگافهای زمین و کوه -

اخذ (ع) بفتح ، گرفتن -

اخر (ع) بفتح همزه و خای معجمه نیز ، بمعنی دیگر و بکسر خای معجمه ، پیش و نهایت و تمام و بمعنی باز ، در شرح مشارقست اول بمعنی پیدا آرنده موجود الاخر و آنکه همیشه باشد -

اخراج (ع) بیرون آوردن -

اخرس (ع) گنگ -

اخرف (ع) بفتح بریده گوش و آنکه هیچ کار نتواند کرد -

اخرم (ع) بوزن ابکم ، بینی بریده -

آخری (ع) بفتح و الف مقصوره ، بمعنی سزاوار تر -

اخزا (ع) بخای و رای معجمتین ، خوار کردن و شدن -

اخش (ف) بفتح و سکون خای معجمه ، قیمت -

اخشب (ع) بخاء وشین معجمه ، کوه بلند و بزرگ -

اخشم (ع) بالفتح ، آنکه بوی در نیابد ، (کشف اللغات)

اخص (ع) بخای معجمه خاص تر

اخضر (ع) سبز و اسپ و نیز در حل لغات است بمعنی آب صاف -

اخطب (ع) خری که برپشت

---

۱ - رک : آخته

اوخطی سیاه بود و نام مرغیست سبز رنگ ـ

اخطل (ع) درازگوش ـ

اخطی (ع) بفتح یکم و سیوم ، نام شهریست منسوب بخوبان ـ

اخفش (ع) نام مردی از آئمه لغت و نحو و قرأت ، در تاج است بمعنی ضعیف چشم و در حل لغاتست و نیز خرد چشم و بدبین ، در موید است شپرک ـ

اخگر (ف) انگشت سوزان و افروخته که بی زگال گردد و در موید است بمعنی آتش ـ

اخگوژنه (ف) بفتح و زای پارسی و قیل کاف نیز پارسی ، همان انگله مذکور۱

اخلاص (ع) دوستی بی آمیغ و بی ریا ، در تاج بمعنی سیرت نیکو و خالص است ـ

اخلاط (ع) بفتح ، جمع خلط که آن چهار طبع و بکسر ، خلط گردانیدن

اخلاق (ع) جمع خلق بضم ، خوی و بفتحتین ، کهنه ، و بفتح اول و کسر دوم ، خوش و خرم ـ

اخمسه (ف) بمد و کسر ، وزن مخمصه و بسین مهمله و معجمه ، شرابی مثل بکنی که از ارزن و جو سازند ـ

اخمص (ع) بفتح و خای معجمه، آنجا که در زمین نشینند از پای و در صراح بمعنی باریکی کف پای است۲

اخنوخ (ف) وزن فرتوت ، نام نوح علیه‌السلام و در تواریخ نام ادریس علیه‌السلام گفته ـ

اخی (ع) برادر من در تبختریست و در عرف صاحب مروت را گویند ـ اخیان تبریزی مشهور اند ـ

اخیار (ع) بفتح ، گزیدگان و آن هفت تنند ازجمله سیصد و پنجاه وشش

اخیروس (ف) گندم دشتی ، بشین معجمه نیز در تبختریست و تحقیق آنست که نباتی است که نزد آب بروید و سبزی سیاه و کوچک و گلی سفید دارد ، دانه او در ادویهٔ چشم و گوش مستعمل است ـ

اخیره (ع) مثله۳ و ضد نخست ـ

ادام (ع) بکسر ، نانخورش ـ

---

۱ - بروزن بکسوزنه ، تکمهٔ کلاه و جامه و گوی گریبان و امثال آنرا گویند (برهان)

۲ - صراح ، ص ۲۱۳ ۳ - رک : آجله

اداقت[1] (ع) بکسر ، حلقهٔ در [زدن]

ادب (ع) بفتحتین ، فرهنگ و پاس و شگفت و نگاهداشتن حد هرچیز لمؤلف :

نیست کم لطفی تو بی چیزی
گرشدم بی ادب ادب آموز[2]

ادبار (ع) پشت دادن و پشت ستور و پشتی کردن خداوند و ستور پشت ریش شدن و باد دبور بودن -

ادب آموز گرد (ف) بلند قدر و نام آور شد -

ادب آواز گرد (ف) مثله[3] -

ادبس (ع) اسپی که نه یوز بود و نه کمیت پاک دو شاب رنگ بود و بیشتر بیوز ماند ، کذافی القنیه ، و در تاج است اسپ نیک سرخ -

ادبیر ع همان ادبارست باماله ، فارسیان الف را یا نویسند -

ادراج (ع) نور دیدن و در آوردن و بفتح جمع درج -

ادرار (ع) انعام همیشگی و قیل روان شدن شیر ، در حل لغات است فرو گذاشتن شیر و باران -

ادراك (ع) دریافتن چیزی -

ادرم (ع) معروف ، آنکه از پشم سازند و زیر زین باشد و در تاج است ادرم جای هموار -

ادریس (ع) نام پیغمبری معروف که او در بهشت پنهانی رفته و آن مشتق از دروس است بمعنی ناپدید شدن به نشان و قیل از درس است که بسیار درس علم گفتی -

ادریس خانه (ف) بهشت -

ادعو (ع) میخوانم من -

ادق[4] (ت) ساق -

ادکن (ع) بفتح ، خاک رنگ و این مشتق از دکنه است بضم[5] ، رنگی که بسیاهی زند -

ادم (ع) بضمتین ، جمع آن[6]

ادم (ت) بفتحتین ، همان آدم علیه السلام -

ادمان (ع) پیوسته شراب خوردن در شرح هدایه است مدمن آنکه شراب پیوسته خورد نه باین معنی است که در تمام اوقات بلکه هر که

---

۱ - دقاقة الباب (Elias) Knocker, clapper

۲ - فر (ا)　　　۳ - رک : ادب آموز گرد

۴ - اودلق (موید)　　　۵ - صراح　　　۶ - رک : ادام

باید بخورد و انکار نیارد ـ

ادویه گرم (ف) کنایت از حوائج دیگ ـ

ادهم (ع) اسپ سیاه و نیز نام پدر سلطان ابراهیم بادشاه بلخ چنانکه قصه اش مشهور است که سلطنت بلخ ترك داده و درویشی اختیار نموده و اورا بر سلطان مذکور نیز اطلاق کنند ، استاد :

سالکان اسلام گر آسان بدی
هر کسی چون شبلی و ادهم شدی

لمؤلف :

دنیی دون است زنی بیوفا
زود چو ادهم بده اورا طلاق

در حل لغات رنگ سیاه و بند چوبین که بر پای نهند نیز آمده و بنابر دو معنی قبعثری که یکی از شعرای مشاهیر عرب بود از جنگ حجاج ظالم خلاص یافت ، چنانکه منقول است که قبعثری در وقت غورهٔ انگور باجمعی از ظرفا در باغی نشسته بود اتفاقاً نام حجاج درمیان آمد ، قبعثری گفت : اللهم سود وجهه‌ واو قطع عنقه‌ و استقی من دمه‌ یعنی بار خدایا سیاه گردان روی اورا و یا بران گردن اورا و بیاشامان مرا خون او ، چون این خبر بحجاج رسید باحضار قبعثری امر فرمود بعد از احضار تهدید و تو بیخ بسیار نمود ، قبعثری گفت که مراد من ازین کلام این بود که بار خدایا سیاه گردان این غوره انگور را تا بکنم خوشه اورا و بیاشمم شربت اورا ـ بعد ازان حجاج از سر غضب گفت اورا : لاحملنک علي‌الادهم یعني هر آینه سوار کنم ترا برادهم ، مراد حجاج قید و بند بود قبعثری انتقال بمعنی دیگر نمود و گفت : مثل الامیر احملن علی الادهم یعنی امثال بادشاه مرا بر اسپ سیاه سوار کنید ، پس چون حجاج در سخن عاجز شد و بر فطانت قبعثری تحسین نمود و خلعت و نعمت ارزانی فرموده کذافی المطول الهروی ـ

ادیم (ع) در تاج است ظاهر هر چیزی گویند ادیم‌نهار یعنی بیاض او و روی هر چیز چنانکه بدین معنی موید است بیت بوستان : سه

ادیم زمین سفرهٔ عام اوست
برین خوان یغماچه دشمن چه دوست

فارسیان گویند پوستی است خوشبوی سرخ دام و در ینج بخشی است پوست

از گوسپند که آن چرم بلغار[1] و چرم سرخ است ، در موید است بفتح خوشبوی که هنگام طلوع سهیل آنرا رنگ و بوی حاصل می آید و آن دو نوع است ادیم یمنی و ادیم طایفی -

ادیم پیکران (ف) شقایق بسیار

اذخر (ع) بکسر یکم و سیوم ، گیاه خوشی -

اذفر (ع) در تاج است گنده بغل و مشک تیز بوی -

اذله (ع) بتشدید لام ، سست دلان و خواران و جمع ذلیل -

اذن الحمار (ع) مثلثه ، گیاهی است که برگها مقدار بدستی عریض باشد و بیخ اواز گزر بزرگترباشد بمقدار ساعد و اورا بخورند شیرین میشود -

اذن الفار (ع) بفتحتین و اذن الفار بضم یکم و سکون دوم ، رستنی است که برروی زمین گسترده شود و گل او بنفشه رنگ باشد و شاخهای او باریک بود و هرشاخی از و مثلث بود برگهای او خرد مانند گوش موش و اورا مرزنگوش نیز گویند و هندش موساکنی -

اذن الفاره (ع) همان که در را[2] گذشت -

اذهران (ع) مهر و ماه -

اذیال (ع) جمع ذیل ، دامن ، ذیول نیر جمع اوست -

اذیه (ع) رنجانیدن -

ار (ف) مختصر اگر و بمعنی بای عاطفه نیز ، و اگر و گر نیز برای

---

۱ - بلغار بر وزن گلزار - ف - شهری است مشهور ، بعضی بر آنند که اصل آن بن غار بود که اسکندر وقت رفتن ظلمات حکم کرده بعضی اسباب و مردم درین غاری تا مراجعت توقف کنند و بعد از مراجعت بمرور ایام شهری شده و بکثرت استعمال بلغار خوانده اند و رشیدی گوید که بلغار و بلغاک بمعنی ترکیبی شان بسیار غار بوده و بسیار غوغا بوده و صاحب قاموس گفته صحیح بلغر بی الف ، وجه صحت آنرا بیان نکرده - بهر صورت بلغار بترکستان است و بسردی هوا معروف و طوطی درآن شهر زنده نمی ماند ، ازین روی خاقانی گفته :
عدلش بدانسامان شده کا قلیمها یکسان شده سنقر به هندوستان شده طوطی ببلغار آمده
حکیم ناصر خسرو در صفت ترکان بلغاری و حسن ایشان گفته :
برون آرند ترکان راز بلغار برای پردهٔ مردم دریدن
و بمعنی چرم ادیم چنانکه مشهور است در کتب معتبره نیاورده اند اما کاتبی بدین معنی اشارتی کرده و بهلهٔ از چرم که باز داران در دست کنند آورده و بلغار نسبت داده چنانکه گفته : باز داران ترا بر بهلهٔ بلغار کل (فرهنگ آنندراج)

۲ - رک - اذن الفار -

عطف آمده و نیز مختصر ارّه ، مستشهد معنی اول این بیت شاهنامه است ، فردوسی :

ستمکار خوانیمش ار دادگر
خردمند خوانیمش اری هنر

و موافق معنی ثانیست این بیت مؤلف که در خاتمه کتاب ناز و نیاز واقع است لمؤلف :

تکلف بر طرف درکار اینست
اگر اندک و اگر بسیار اینست

و متضمن معنی ثالث است این بیت شاهنامه فردوسی :

به یزدان که او داد آئین و فر
که برم میانش ببرنده ار

اراریس (ع) جمع آن[1] ۔

اراقت (ع) ریختن آب ۔

اراك (ع) بفتح ، درخت شوره و در تاج است بمعنی درخت مسواک

ارام (ع) بفتح ، جمع رئم ، بزکوهی و آهو در پارسی معروف و درحل لغاتست جمع رئم بمعنی آهوی سفید چنانکه سلمان ساوجی میفرماید :

دیدار کبک درایام تو شاهین شاهی
کرد با شیر بدوران تو آرام ارام[2]

ارّان[3] (ف) بفتح و تشدید ، نام ولایتی معادن زر و نقره ۔

ارانب (ع) جمع آن[4]

اراوند (ف) بفتح بزبان پهلوی ، دجله و در پنج بخشی است اراوند بمعنی دیده و اروند دجله و نام کوه در اداتست اروند بسه معنی اول و اوراوند دجله و در حل لغاتست بمعنی تجربه و آزمائش نیز و در اسکندری هر دو بیک معنی گفته اند و در فرهنگی آورده اند بتقدیم واو بررا ، نیز درحل لغاتست اروند بمعنی بها و زیبا و پسندیده و در شاهنامه است دجله ، فردوسی :

اگر پهلوانی ندانی زبان
بتازی تو اروند را دجله خوان

ارایک(ع) جمع اوه[5] بمعنی تختهای آراسته ۔

ارباب (ع) مرادف اصحاب است بمعنی یاران ۔

---

۱ ـ رک : اریس ۲ ـ دیده از کبک در ایام تو شاهی شاهین کرده باشید بدوران تو آرام آرام (بهار عجم)

۳ ـ رک : معجم‌البلدان و حدودالعالم و نخبة الدهر ۴ ـ رک : ارنب

۵ ـ رك : اریک ۔

ارباب قلوب (ع) صاحبدلان -
ارباح (ع) یعنی سودها و نفعها جمع ربح بکسر -
ارباض (ع) جمع ربض ' دیوار گرد شهر -
اربعین صباح (ف) آن چهل صبح که بر طینت آدم گذشت -
اربعین صباح بدر (ف) آن چهل صباحی که خمیر آدم علیه السلام در آن شده -
اربغ (ت) بفتح با ' پاک -
اربیان (ف) ملخ آب و آن نوعی از ماهی خرد است[1]
ارتجاج (ع) بتای قرشت و جیم اول نیز ' لرزیدن و جنبیدن -
ارتحال (ع) بحای مهمله ، کوچ کردن و روان شدن و در حل لغاتست بار ازمنزل برداشتن و بر پشت کسی نشستن و بجیم پارسی ، گرفتن و شعر به بدیهه گفتن و خطبه -
ار (ت) بضم ' اسب خرمنج و بکسر مرد -

ارتضا (ع) بکسر ، خشنود شدن
ارتعاب (ع) بعین مهمله ، ترسانیدن -
ارتعاش (ع) بکسر ، باخویش لرزیدن -
ارتفاع (ع) بلندشدن -
ارتق (ت) لاغر در ابراهیمی است[2]
ارتقا (ع) بر رفتن -
ارتقاب (ع) بقاف ' چشم‌داشتن
ارتکاب (ع) سوار شدن و اختیار کردن گناه و مانند آن -
ارتکام (ع) برهم نشستن -
ارتماض (ع) بکسر ، سوخته شدن از درد و اندوه و تباه شدن جگر رمضان از ینجاست -
ارتنگ (ف) بکاف پارسی ، نگارنامه مانی نقاش و قیل بجای تای دو نقطه بزای معجمه و بسیاری از فضلا براول کذاقی الادات و در

---

۱ - اربیان ، بکسر اول و ثالث - ع - ملخ آبی که عرب جرادالبحر و شیرازیان میکو بفتح میم خوانند و نمک سود خشک آنرا خورند و بابرنج و روغن نیز پزند همانا عربی است - (فرهنگ آنندراج)

۲ - بسکر یکم و سوم ، زیاده (موید) ارتق بکسر یکم و سیوم ' زیادت (شرفنامه) ارق بفتح یکم و کسر دوم ، لاغر (موید و شرفنامه)

سکندری بر چهار نوع آورده اورنگ و ارنگ و ارشنگ و ارتنگ و قیل ارزنگ نام پهلوانی تورانی و نیز نام دیوی و در موید است که نام چادریست که درو همه نقشها نگاشته بود یعنی علم خانه ، استاد:

پادشاهان جهان راست ز تو چندان فرق کز نقوش ملکی تا بنقوش ارتنگ در تبختریست بشای مثلثه نیز و در حل لغاتست به سه معنی آورده یکی صورتهای مانی که در چین کرده بود و دوم بمعنی بت خانه سیوم نام کتاب مانی و بدین معنی ارژنگ است ، در سکندر نامه :

روان کرد کلک سیه رنگ را
به برد آب مانی وارژنگ را

ارتو (ت) بضم ، پوشش ـ

ارتوج (ت) بوزن فرسود ، سبز ـ

ارتوق[1] (ت) بفتح ، پای ـ

ارتیاح (ع) شاد شدن ، و بخشودن و راحتمند شدن ـ

ارج (ع) بفتحتین ، خوشبو کذا فی النصاب و معنی دیگر در پارسی مذکور میشود ـ

ارج (ف) بفتحتین بوزن فرج ، پرنده ایست که بآن شکار کنند و بوزن حرج ، قدر و قیمت و اندازه ، ارجمند مرکب ازانست ـ

ارجاسپ (ف) بفتح و بای پارسی ، نام پهلوان افراسیاب و نام بادشاه توران که بیست و نه پسر ترکستان شاه را در جنگ کشته و به آفرین را که دختر گشتاسپ بود اسیر کرده بود و در دژ روئین[2] محبوس ساخته ، آخر از پیش اسپند یار هزیمت خورد ـ

ارجل (ع) در موید است بضم جیم ، مردی کلان و اسپی که پای وی سپید باشد و آنرا شوم پندارند و در سکندریست بوزن احمق بمعنی اخیر و در حل لغاتست بزرگ پای و بمعنی اسپ مذکور ، خسرو ملک سخنوری ملک الشعراء انوری اشهب و ادهم و ارجل را بر نهجی که باید در مطلع جمع کرده است و موید تصحیح صاحب سکندریست ، انوری :

جرم خورشید چواز حوت در آید بحمل
اشهب روز کند ادهم شب را ارجل

ارجمند (ف) عزیز و بزرگ و در سکندریست حرکت برجیم غلط است

---

۱ ـ بالفتح ، پاوباریک تر (موید) پای گدا (موید ، نسخهٔ خطی نگارنده) پای (شرفنامه)
۲ ـ روینه (برهان قاطع)

چنانکه از ضابطهای که رقم یافته معلوم خواهد شد و در موید است بی همتا و غالب وگرامی یعنی عزیز ، در حل لغاتست بمعنی قیمتی نیز -

ارجو (ع) آمید می دارم من -

ارجوان[1] (ع) بضم ، ارغوان و گویند بنفشه سرخ و روشن -

ارحل (ع) بحای مهمله ، اسپ سپید پشت -

ارخ (ع) بکسر یکم و سکون دوم ، جانوریست در هند که آنرا کرگدن و در مجمل لغت آورده است

اراخ بکسر بمعنی آدمی -

ارخط گل (ف) عرش -

ارخم (ع) بخای معجمه ، اسپی که همه سر او سپید بود -

ارخووق (ت) جوزا -

ارد (ع) بفتح ، نام قبیله و قیل نام شهری -

ارد (ف) بضم و فتح بوزن سرد ، همان آرد مذکور بمعنی اخیر و بیست و پنجم از ماه اردی بهشت ، مقوی معنی ثانیست بضم این بیت شاهنامه :

همی رفت سوی سیاوش گرد
بماه سفیدار در روز ارد

موید معنی اول است این بیت کمال سپاهانی :

داریم ز نعمتی تو هر چیز
اکنون هسیتم بارد تو محتاج

ارد پیل (ف) بفتح و بای پارسی نام شهریست بحد آذر بائیجان و قیل بباي تازی و مشهور همان اولت اگرچه در بعضی جا بواسطه قافیه اختیار کنند ، چنانچه در بوستان :

یکی آهنین پنجه در اردپیل
همی بگذرانید بیلک ز بیل

ارد جان (ف) نوعی از اسرار و اشکال نجوم -

[اردستان] رك : آردستان

[اردسته] رک : آردستان -

ارد شیر (ف) نام پسر شیرویه بن پرویز بادشاه ایران و نام پسر ساسان بن بهمن -

اردمز (ت) بکسر یکم و چهارم ، بی هنر -

اردمه (ف) نام درختی[2]

اردو (ف) بوزن کلبو ، لشکر گه ، چنانکه درین بیت است از آستاد :

یک شمه ابروی تو خورشید منور
یک خیمه در اردوی توگردون معلا

اردوان (ف) بفتح همزه و

۱- رک : نزهت القلوب ص ۹۹

۲ - درخت شخار کذائی زفانگویا (موید)

دال و نیز بضم نام پادشاهی از آل گشتاسپ ـ

ارده بخرك (ف) در ابراهیمی است بخرك[1] نام میوه ایست و ارده بمعنی مالیده و در موید است بمدو قیل بغیر مدو بضم باء ، چنگال و بادام کوهی و درسکندریست و آن چیزیست که آنرا بادوشاب و رطب خورند چنانچه ارده کنجد که مذکور شد ـ

ارده خرما (ف) بفتح ، چنگال خرما بمعنی مالیده ـ

ارده دوشاب (ف) بفتح و واو پارسی است ، چنگالیست یعنی مالیده که ازآرد سازند وبا دوشاب میخورند ـ

اردی بهشت (ف) وزن اسپی فرشت، مدت ماندن آفتاب در برج ثور، فارسیان ماه شمرده باین نام خوانند و رومیان آبان و هندش چیت نامند و نیز روزی از ماه[2] چنانکه در ضمن او رمزد مذکور میشود ـ صاحب سکندری از فرهنگ حسینی و شیخ واحدی نقل کرده که بضم الف است و بفتح غلط است و در موید است بفتح و الف و ضم آن اما آنچه الحال در محاورات مذکور میشود بفتح مشهور است ـ

اردیکی[3] (ت) بکسر یکم و فتح سیوم ، هنر مند ـ

اردن (ف) بضم سیوم که ذال معجمه است ، نام شهری از شام مدفن یعقوب علیه‌السلام و چاهی که در آن یوسف علیه‌السلام بود در آنجاست و کنعان بدوازده فرسنگ از انجا است

ارز (ع) بفتح یکم و ضم دوم بتشدید، بمعنی برنج و در شرح نصاب است بفتح همزه و ضم رای مهمله

---

۱ ـ بخرک بضم اول و سکون خای منقوطه و فتح رای مهمله و سکون کاف نام میوه ایست که آنرا بادام کوهی می‌گویند و چوب آنرا بجهت میمنت عصا کنند ـ (هفت قلزم)

۲ ـ اوستا Asha Vahishta پهلوی Urt vahisht Ashvahist مرکب از دو جزء: اول arta و asha بمعنی درستی و راستی ؛ دوم وهیشته صفت عالی از صفت veh بمعنی به و خوب ، پس کلمهٔ مرکب بمعنی بهترین راستی است ـ اشا وهیشته یکی از امشاسپندان است ـ که نگهبانی دومین ماه و سومین روز باو سپرده است ـ وی در جهان مینوی نمایندهٔ پاکی و تقدس و قانون اهورامزداست و در جهان خاکی نگهبانی آتش بدو سپرده است ـ
(دکتر محمد معین : روزشماری، ۱۸ ـ ۱۹)

۳ ـ اردمکی (شرفنامه)

وزای معجمه مشدده ، برغ و دران پنج لغت است دیگر ضم همزه و زاء و ضم همزه و راء و تخفیف راء - ارز بفتح یکم و سکون دوم قدر و قیمت و عظمت و ارز بفتح یکم و ضم دوم بزای مشدود و قیل بالتخفیف ، برغ (کشف) -

ارز (ف) بفتح و سکون رای مهله ، قدروعظمت و بها که عرب آنرا قیمت گویند و در موید است درخت نار وقیل درخت سرو وقیل صنوبر -

ارز و رز (ع) بضم رای سهمله و تشدید زاء ، و نیز بضم راء و سکون نون و تخفیف راء ، در شرح دیگر است و دروی لغاتست فتح اول و سکون ثانی و ضم هر دو و ضم اول و سکون ثانی ، درخت نار و مصدر بمعنی باهم آمدن و استوار شدن -

ارز (ت) بضمتین ، روزی -

ارزبیز[1] (ت) بکسر تین و بکسر چهارم ، و ربع -

ارزلو (ت) بضمتین ، روزی مند -

ارزن (ع) نام درخت است سخت چوب و نام دشتی و بپارسی معروف ، استاد :

دی محتسی براه بگذشت
بردست گرفته چوب ارزن

و بمعنی سیوم لمؤلف :

طوطی طبع من شده بیشک
قانع ای شه بارزن اندك

ارزن ریزه (ف) قطرات باران و جرعه می‌و شراره آتش و کفگیر شراب -

ارزن زرین (ف) جرعه مئی زعفرانی و حباب و ستارگان -

ارزه (ف) بوزن برده ، که گل و نام درختی چلغوزه میوه اوست[2] -

ارزه (ف) وزن هزره ، کاه‌گل و بلغتی نام درختی -

ارزیتون (ف) نام دختر بادشاه مغرب که حباله بهرام گور بود -

ارزیز (ف) قلعی خوب بتازیش رصاص خوانند ، چنانچه بدین معنی واقعست در سکندر نامه ـــه

مشو نرم گفتار با زیردست
که ز الماس ارزیز گیرد شکست

---

١ - ارزسیز بمعنی ربع (شرفنامه)

٢ - بالفتح کاهگل و نیز نام درختی ست کذا فی الشرفنامه و فی‌القنیه درخت نار و قیل عرعر یعنی قسمی از سرو و نیز در قنیه است درخت چلغوزه که ارزه بروزن لرزه صنوبر را گویند و فی حاشیه المصابیح چلغوزه که آن بار درخت صنوبرست و درادات مذکورست درختی ست که چلغوزه میوهٔ اوست (موید)

ارس (ف) بفتحتین ، نام رودیست کنارهٔ آذر بائیجان سه
ای صبا گر بگزری بر ساحل رود ارس
بوسه زن برخاك آن وادی و مشکین کن نفس
ودرحل لغاتست بسکون دوم ، آب چشم

ارساغ (ع) بفتح ، جمع رسغ بضم ، بندگاه دست و پای و باریکی پیوند سردست -

ارساغ (ت) زرده -

ارسطا (ف) بفتحتین ، نام حکیمی که آستاد زاده و وزیر سکندر بود و در علم شاگرد افلاطون و او را ارسطاطالیس و ارسطور و ارسط نیز گویند چنانچه بیشتر در ضمن هر حرف او مذکور خواهدشد -

ارسطاطالیس (ف) هر دو طای مهمله، نام حکیم و ذکر آن در ارسطا گذشت -

ارسطو (ع) همان ارسطا که گذشت

ارسطوی (ف) همان ارسطا که گذشت -

ارسلان (ت) شیر و نیز نام بادشاه ایران -

ارسلن (ت) نیز الپ ارسلان بیای پارسی همان[۱] معنی و نیز نام مبارزی -

ارسمندش (ف) بفتح یکم وسیوم و چهارم ، نام حکیمی ندیم اسکندر -

ارشد (ع) راه یافته تر و نام پهلوانی که علم تیر ازوست -

ارض (ع) زمین و ارضات و اراض جمع آن -

ارطیون (ف) بفتح همزه و را ، زیرك و دانا و کار دیده و نام مردی حکیم رومی -

ارعش (ع) لرزان دست -

ارغ (ت) بفتح ، خرس و درموید اریغ بیای پارسی آورده -

ارغا (ف) بفتح ، در تبختریست جوی و در مویدالفضلاست ارغا بفتح آب و مستشهد معنیٔ اول است این بیت آستاد برو :
شدم غرق هردم بدریای خون
ز دیده روان شد دوارغای خون
و در ابراهیمی است در بیان الفاظ ترکی بفتح اول وارغاو بزیاده واو نیز -

ارغاف (ف) بضم ، جوی آب -

ارغام (ف) آب جوی -

ارغاو (ت) بفتح ، جوی آب و

---

۱ - رك : ارسلان

آنرا بغیر واو نیز گویند چنانچه گذشت ـ

ارغن و ارغنون (ف) بفتح یکم و ضم سیوم ، نوعی از سازهای رومیان ساخته افلاطون ، صاحب موید نقل کرده جمع آواز مزامیر مثل رباب و چنگ و طنبور و بربط را گویند و نیز چون هر آدمی از مرد و زن پیروجوان مزا میر مختلف و آواز های متنوعه یکبارگی ساز کنند و بنوازند آنرا ارغنون نامند و گویند ساز و آواز هفتاد دختر بکر که یک مرتبه کنند ' مؤلف این کتاب از فاضلی شنیده که من در دکن دیده ام سازیست که خانها و حجرها دارد آواز هاش بغایت غریب است و از رومیان است ـ

ارغنده (ف) وزن فرخنده بفتح و ضم غین معجمه ' مردم دلیر و خشمناك ، شاهنامه :

سرا پرده سبز دیدم بزرگ
سپاهی بکردار ارغنده گرگ
همایون سواری چو ارغنده شیر
توانا و چابک عنان و دلیر

ارغوان (ف) در موید است گلیست سرخ و قیل گیاهیست سرخ و صحیح آنست که درختست که شاخهایش باریک چون مرجان میشود ـ

ارغوان تن (ف) مریخ ـ

ارغون (ف) اصل ترکان واسپی که از جای ترکی و از جای تازی بود ـ

ارفاغ (ع) بفتح ' بغلهای دست و ران ـ

ارفاق (ع) نفع رسانیدن و چیزی گرفتن ـ

ارفت (ت) بفتح یکم ، پشت ـ

ارفش[1] (ت) بفتح یکم و کسر سیوم ، کاردان ـ

ارق (ت) بکسر یکم و فتح دوم ' دور و بفتح یکم و کسر دوم لاغر ـ

ارقا (ت) بفتح ، حجامگاه ـ

ارقاق (ع) تنگ گردانیدن و نیز بنده کردن ـ

ارقان (ع) آفتی که بکشت می رسد و آنرا یرقان نیز گویند ، درتاج است آفت کشت و بیماری روده اما یرقان شوریده مشهور به بیماری چشم است که اورا زرد می سازد ، هندش کنولیاد[2] گویند ، چنانکه درین بیت است از شاه طاهر

---

۱ ـ ارقش ـ کاردان (شرفنامه)

2. Jaundice (Platts and Fallon).

جناب سخاوت مرزا صاحب

''نصاب الاحتساب' عربی کا کاتب غواصی گولکنڈوی''

نصاب الاحتساب فقه حنفی میں بزبان عربی ایک مشہور کتاب ہے جس کے مصنف علامه ضیاء الدین عمر بن عوض الشامی ہیں ۔ معاصر شیخ نظام الدین اولیاء بدایونی المتوفی ۷۲۵ھ ۔ بعض کاتبوں نے ان کا لقب امام سراج الدین لکھا ہے ۔ مگر اخبارالاخیار مؤلفه شیخ عبد الحق محدث دہلوی اور نزهة الخواطر مؤلفه حکیم عبدالحی مطبوعه میں ''ضیاء الدین'' ہے ، جو صحیح معلوم ہوتا ہے ۔ ہم کو یہاں نسخه[1] نصاب الاحتساب عربی مکتوبه ملا غواص گولکنڈوی سے بحث ہے ۔ اس کا سنه تصنیف قبل تالیف[2] فواید فیروز شاه (عهد فیروز شاه تغلق ۷۵۲ تا ۷۹۰ھ) یعنی آٹھویں صدی ہجری بیان کیا جاتا ہے ۔ اس کتاب کے نسخے دنیا کے مشہور کتبخانوں مثلاً جرمنی ، مصر ، ہندوستان ، رامپور ، حیدرآباد دکن ، پٹنه وغیره میں موجود ہیں ۔ اور یه کتاب ٹائپ پر بھی چھپ چکی ہے ۔

اس کا ایک فارسی ترجمه الموسوم به دستور الاحتساب[3] ، ترجمه نصاب الاحتساب ، خواجه ابن احمد بن محمود نے بطور سوال و جواب ، سلطان مظفر شاه حلیم بن محمود شاه سلطان گجرات کی خدمت میں پیش کیا تھا ۔ جس کا ایک نسخه ورناکیولر سوسائٹی احمد آباد میں ہے ۔

اس کتاب کا ترجمه ہماری زبان اردو میں ، حافظ محمد فضل حق[4] نے ۱۲۹۴ھ میں بایماء برادر افتخار الامرا صاحبزادۂ عبید الله خان

---

۱ - نسخه کتبخانه جامعه عثمانیه حیدر آباد ۔

۲ - فہرست کتبخانه پٹنه جلد مطبوعه ۔

۳ - رساله معارف ۱۹۳۱ء ۔

۴ - ترجمه نصاب الاحتساب (کتبخانه آصفیه) ۔

فیروز جنگ کیا تھا ، جو به مطبع نامی لکھنؤ ۱۳۱۰ھ میں طبع اور شایع هوچکا ہے -

نصاب الاحتساب عربی کے چند نایاب نسخے کتبخانه آصفیه میں موجود هیں - جن کا مختصر تذکرہ یہاں نامناسب نه هوگا - جو خاص اهمیت رکھتے هیں -

سلاطین آل عثمان فقه حنفی کے سخت متبع رہے - یه نسخے سلاطین آل عثمان کے کتبخانه کے معلوم هوتے هیں - چنانجه نسخه نصاب نمبر ۱۲۲ کے حاشیوں پر سلطان مراد فاتح بغداد کا ذکر ہے جس کا کاتب کوئی ترک فاضل معلوم هوتا ہے - جس کے آخر میں حسب ذیل عبارت درج ہے :

''کتب هذا الحدیث الشریف خط قاضی زاده الفاضل المرحوم بعصر سلطان مراد فاتح البغداد -

عبارت نمبر ۲ استصحفه العبد الفقیر یوسف ضیاء الدین.........
کتبه محکمه اخی چلپی بدارالخلافه غفرله -

اس نسخه پر دو مهریں حسب ذیل ناموں کی ثبت هیں - مهر (یوسف ضیاء الدین) ، دوسری مهر (محمد آمین) - نیز ایک اور عبارت اور سنه بھی اس طرح :

''سلطان مراد ک بغدادی الحرب غزئ انه و بی ۱۰۲۲ - نیز بعض شعر ترکی اور ترک حکام کے نام :

''بکمال پاشا غرصم عزم بقا ایدی سندنا؟
رو غریوب شهر بغداد بلاندم قلدم؟

اسی کے ذیل میں کمال پاشا کے فرزند کا نام اور یه شعر ؎
لابن کمال پاشا ؎

نقد و جودک البسه فقر و فنا تلف
سیمرغ قاف همت اویوب.........

نام کاتب :- کتبهٗ مصطفلی بن عبد الله الکرد وتات؟ و کذا ارجو ممن قراه ان یدعولی بالدعوات فالله تعالی مجیب بالدعوات الصالحات فی التاریخ ۱۰، فی شهر الحرام فی یوم الجمعة ۹۱۲ھ

نسخۂ احتساب نمبر ۱۵۱ آصفیه کے حاشیه پر ایک دستخط ''اختری'' سنه کتابت یه ہے :—سنه ثلثه و ثلثین و مایة و الف۔ (۱۱۳۳ھ)۔

نسخه نمبر ۳۹۶ (آصفیه) بھی خاص اهمیت کا حامل ہے۔ اس لئے که یه هماری رائے میں کتبخانه سلاطین بہمنیه کا نسخه ہے جو شہنشاه عالمگیر کو فتح بیدر کے مال غنمت میں ملا ہوگا۔ جس پر عالمگیر کے ایک امیر کی مہر ہے۔ ''بو علی بنده بادشاه عالمگیر''۔ ۱۱۰۱ھ

دوسری مہر حاشیه پر خاص معلوم ہوتی ہے جس میں لفظ ''المعتصم'' صاف پڑھا جاتا ہے۔ اس قسم کے القاب خلفاء عباسیه بغداد کے ہوا کرتے تھے، اور آخری سلطان ابو عبدالله ابن مستنصر، (۶۴۰ تا ۶۵۶ھ) گزرا ہے۔ جو اس نسخه کا کاتب ہے۔ مہر کی پوری عبارت اس طرح بمشکل پڑھی جاتی ہے :—

''للہ الملک المنان من کتب العبد المستعصم عبدالحلیم المجلس الاشرف''
''وزیر الممالک خدا داد خان؟''

سلاطین بہمنیه نے خلفاء عباسیه کی اتباع کی ہے اور ان سلاطین کے سکوں میں، المؤید بنصر الله (مجاهد شاه)۔ الواثق بتائید الرحمن (محمد شاه ثانی بہمنی) اور سلطان محمد شاه ثالث بہمنی المعروف به شکری جس کا مشہور وزیر خواجه محمود گاوان تھا اس کے سکه پر ''المعتصم[1] بالله ابوالمظفر شمس الدین والدنیا''، ضرب محمد آباد بیدر ۸۷۷ھ کنده ہے۔ یه نسخه سلاطین بہمنیه کے کتبخانه کا نہیں معلوم ہوتا۔

خطاطوں اور کاتبوں کی اکثر اوقات بڑی اهمیت ہوجاتی ہے۔ اور وه بھی مصنفین و مؤلفین کے ساتھ ساتھ زندگی جاوید حاصل کر لیتے هیں، بقول ''نوشته بماند سیه بر سفید'' جبکه کاتب خود مصنف هی ہو یا کوئی عالم و فاضل ہو تو معامله اور بھی اهم ہو جاتا ہے۔ جس پر کتاب کی صحت کا دار و مدار ہوتا ہے۔

ملا غواص دولت قطب شاهیه دکن کا ایک نہایت مشہور دکنی زبان کا شاعر بلکه ملک الشعراء تھا۔ اس کے نام کا کہیں پته نہیں چلتا، اس کی تصنیف سیف الملوک و بدیع الجمال، طوطی نامه طبع

---

۱ - رساله اسلامک کلچر حیدرآباد مضمون ڈاکٹر اسپیٹ سکه جات بہمنی

هو چکی ہے اور کلیات پر میرا تحقیقی مضمون قبل ازین رسالہ اردو پاکستان اکتوبر ۵۴ء میں شایع ہو چکا ہے ۔

نسخہ نصاب الاحتساب زیر بحث جامعہ عثمانیہ حیدر آباد کا ایک خاص نسخہ ہے جو (۲۵٦) صفحات پر مشتمل ہے کاتب نے اپنا پورا نام لقب یا تخلص اس طرح لکھا ہے :

''شیخ حسین ، بہاؤ الدین المقلب بہ غواصی ، سنہ ۱۰۸۹ ھ''۔

اصل ترجمہ یہ ہے :

''و قولی[۱] بفراغ تنمق ھدہ الرسالتہ وقت عصر یوم الاربعۃ الثالثہ''۔

''من ربیع الثانی سنہ تسع و ثمانین و الف من الھجرہ النبویۃ''۔

''و انا المحتاج الی اللہ المتین ، شیخ حسین بہاؤ الدین الملقب بغواصی''۔

''قد بلغ المقابلۃ بحسب الطاقۃ البشریہ''۔

یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ اس میں کاتب نے اپنا لقب غواصی لکھا ہے نہ کہ تخلص ، اور لقب اور تخلص میں بڑا فرق ہے ، لقب تو وہ ہے جو اپنے نام کے علاوہ خاص صفت کے لئے استعمال کیا جائے مثلاً جلال الدنیا والدین ، بہاء الملت والدین وغیرہ اور تخلص شاعر کا مختصر نام ۔ جو شاعری کے لئے مختص ہے ۔ مثلاً ، ظہوری و عرفی ، وجہی ، فیروزی وغیرہ ۔

ہمارا ناقص خیال یہ ہے کہ کاتب نے جو اپنا لقب یہاں ''غواصی'' بیان کیا ہے وہ در اصل لقب نہیں بلکہ تخلص ہی ہے ۔ کیونکہ اس قسم کے القاب مروج نہیں بلکہ تخلص ہی ہوا کرتے ہیں اس لحاظ سے در اصل کاتب نے پہلے اپنا نام ''شیخ حسین'' لکھا اس کے بعد اپنا لقب بہاؤ الدین ، اور آخر میں اپنا تخلص ''غواصی'' لکھا ہے ۔ جس نام سے وہ بہت زیادہ معروف تھا ۔

دوسری چیز قابل غور یہ ہے کہ غواصی نے جو شاید عربی جانتا نہ تھا کیوں نقل کی ، اور پھر ایسی عمر میں جبکہ وہ ضعیف العمر تھا؟ عربی جاننے کے متعلق غواص کے نسبت بظاہر کوئی سند نہیں ہے ۔

---

۱ ۔ نصاب الاحتساب عربی مخطوطہ جامعہ عثمانیہ ۔

کہ وہ عربی کا بھی فاضل ہو۔ مگر اس کے کلیات دکنی میں بیسیوں عربی الفاظ، عربی ترکیبیں اور ترجمے موجود ھیں۔ مثلاً انجس الانجاس ظل اله الناس، عجلوا فی صلواۃ، الدنیا جیفة و طالبھا کلاب وغیرہ۔ یہی حال اس کے معاصر وجہی[1] مصنف سبرس کا ہے۔ غواصی کے زیر مطالعہ اساتذہ فارسی کے دواوین رہے ھیں۔ جس سے اس کی قابلیت فارسی و عربی پر روشنی پڑتی ہے۔

نصاب الاحتساب زیر بحث خط نسخ میں ہے خط متوسط درجہ کا ہے، ممکن ہے کہ غواصی کو یہ کتاب مرغوب ہو۔ اور وہ فقہ حنفی کا پیرو ھو اور یہ ایسی مقبول تالیف ہے۔ جو سلاطین عالم اسلام کے محکمہ جات قضا میں نہایت مقبول اور متداول رہی ہے۔

ترجمہ میں آخری فقرہ میں یہ اشارہ ہے کہ اس نے آخری عمر میں نقل کی ہے۔ ہمارے قدیم بزرگ ضعیفی میں بھی، کتابت سے دل بہلایا کرتے تھے اور بیکاری کو پسند نہ کرتے تھے۔ غواصی بلحاظ عقاید حنفی المذھب اور قادری المسرب تھا۔ جس کا ذکر ھم اپنے طویل مقالے ''ملک الشعرا غواصی'' میں کر چکے ھیں۔ اس نصاب کی کتابت سے ہمارے خیال کی مزید تائید ھوتی ہے۔

سلاطین قطب شاھیہ امامیہ مذھب کے پیرو تھے اور ظاھر ہے کہ امامیہ فقہ پر کاربند تھے، مگر رعایا کی اکثریت اھل تسنن پر مشتمل تھی اور یہ یقین ہے کہ ان کے مذھبی قضیے بلحاظ فقہ حنفی طے کئے جاتے تھے، اگر یہ رواداری ملحوظ نہ ھوتی تو وہ حقیقی معنوں میں سیکیولر گورنمنٹ کے حامی تصور نہ کئے جاتے۔

ان حالات کے تحت جب تک اس کے خلاف کوئی اور شہادت معرض وجود میں نہ آئے یہ تصور بیجا نہ ہوگا کہ اس کا کاتب دکن کا وھی مشہور اور بلند پایہ شاعر، ملک الشعرا غواصی گولکنڈوی ہے۔ اور یہ ایک بڑا انکشاف ہے کہ اس کا اصلی نام شیخ حسین، لقب بہاؤ الدین اور تخلص غواصی تھا، جس سے علمی دنیا ابتک لاعلم تھی۔ اور اس

---

۱ - اوریئنٹل کالج میگزین مضمون پروفیسر محمود شیرانی۔

شاعر کی اصلی تحریر دو چار سطر نہیں بلکہ پوری ۲۵٦ صفحات کی کتاب ، خود اس کی قلمی جامعہ عثمانیہ کے کتبخانہ میں محفوظ ہے ۔ بلحاظ سنہ کتابت یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ عبداللہ قطب شہ ۱۰۳۵ھ تا ۱۰۸۳ھ کی وفات کے پانچ سال بعد تک یعنی سلطان ابو الحسن تانا شا کے اوایل عہد ۱۰۸۹ھ تک بقید حیات تھا ۔

The diwan of Shah Wali which contains both Persian and Arabic poems of different lengths and forms, is now preserved in the library of Nadwatul 'Ulama, Lucknow (India). This was compiled by Ishaq b. Muhammad 'Irfan of Baraili (d. 1234 A.H./1818 A.D.), who was a pupil of Shah Abdul Qadir.

(26) *Persian Poems Given in Hyāt-i-Wali* : (*Vide* also the *Kalimatut Tuyyibāt*, Mujtaba'i Press, Delhi, Maktubat Shah Wali Allah Dehlavi, p. 191). Shaikh Rahim Bukhsh, the author of the *Hyāt-i-Wali*, has included in his biographical work (an irregular translation of Shah Wali's own book the *Anfasul 'Arifin*) some Persian poems which he believes are of Shah Wali Allah. The poems, as the author says, is a selection from a larger collection the name of which he has not disclosed. It would be presumptuous to challenge the authority of a well-known author like Shaikh Rahim Bukhsh and to deny a well-established fact. If such delicacy had not stood in the way I would have openly stated that these poems appear to be of doubtful origin. It is very likely that they may have been wrongly ascribed to the great saint, at first by Shaikh Sahib and then by others. In some of the poems the poet gives his name or تخلص Amin. It, however, could not be ascertained from other sources that Shah Wali ever used Amin as his *nom de plume*.

In کلمات الطیبات (a collection of the writings of various authors) some رباعیات (quatrains) and their mystic significance have been ascribed to Shah Wali Allah. We cannot be sure about the origin of these *rubai's* tco. Whatever the case these *rubai's* are of mystic rather than of literary value.

Besides this, there are other books on the same subject, such as al-Balaghul Mubin, al-Muqaddimatul Saniyya, Fathul Wudud (all in Arabic) and al-Maqalatul Waddia fil Wasiyya (in Persian).

Maktubat (مکتوبات)

(24) *Siyasi Maktubat*: It is a beautiful collection of Shah Wali's letters written to several persons of authority at his time. The letters were actually collected by Shaikh Muhammad 'Ashiq and his son Shaikh Abdur Rahman in two volumes. The first volume contained 281 letters and the second only 77. The Siyasi Maktubat is a selection out of these two volumes made by Prof. Khaliq Ahmad of the History Department, Muslim University, Aligarh. In these letters Shah Wali has made an appeal to the king and the nobles to set things right and to stop the rot. "If the revolts of the Marathas, Jats, etc., are not quickly suppressed, the poor people, no doubt, will be crushed under their heels. He, however, forgives the Rohillas of their vandalism. Otherwise they were no less revolting against the authority of the king. Ghulam Qadır Rohilla sometime after Shah Wali's death, perhaps, did the greatest mischief in blinding the Emperor of Delhi.

The letters no doubt are a fine piece of literature and speak loudly of the writer's proficiency in the language and wide knowledge of the political situation.

Poetry

Diwan (دیوان شاہ ولی اللہ): Shah Wali Allah had a great command over the languages of Arabic and Persian and could compose verses without any difficulty. But he is not a first-rate poet and his poems lack the masterly touches of the professionals. Excepting the poem which begins with the line :—

كَأَنَّ نجومًا اومضت في الغياهب

عيون الأفاعي او رؤس العقارب

"The stars which shine (on the sky) in the dark
Are either the eyes of dragons or the heads of scorpions",

his poems are of mediocre quality. This poem is really a good one. His son Shah Abdul Aziz wrote a *takhmis* on it.

'Umar Faruq) deserved par excellence the position they occupied.

The book is divided into three chapters (مسالک) dealing with the qualities of Abu Bakr and 'Umar and the opinions of the companions of the Prophet about them. At the end Shah Wali gives his own conclusions about these Caliphs. For instance, he contacted the souls of the two Caliphs in the Haziratul Qudus (حظیرۃالقدس), *i.e.*, the place where the souls of the most excellent beings meet the Great Soul or Ruh-i-A'zam, and found their light intermingled with the light coming out of the Soul of the Prophet Muhammad. He elaborates this fact in this way, that the nisbat (نسبت) (a peculiar spiritual state) prevailing at the time of the Prophet which is a manifestation out of the manifestations of the Divine Light, ended with the death of the two Caliphs. Then the other manifestation, which s like the world of similitude (مثال), came into being. The first was the path of Nubawwat (نبوت) or Prophethood and the second one of Wilayat (ولایت) or Sainthood. That is Hazrat 'Uthman and Hazrat 'Ali belong to the cadre of saints. Hence their succession came later.

'Aqa'id (عقاید)

(23) *Al-Aqidatul Hasanah* (العقیدہالحسنہ) : It is a small treatise covering a few pages in which Shah Wali has given the formulae of the Muslim creed. The booklet begins with the words: "I shall call upon God and those who are present from amongst angels, genii and men, to bear witness that I believe from the core of my heart that for the world there is a Creator, eternal and self-existent .... He has created the world from mere nothing. He says 'be' and the thing intended comes into existence..." Shah Wali explains that God is the ultimate cause of all things. He is in reality the curer of all the ills, a physician is only a medium.

In regard to the succession of the Caliphs (Orthodox Caliphs), Shah Wali says in clear-cut terms that it was in right order. "There could not be any change in it. Abu Bakr is decidedly superior in view of his services to Islam to any of the Prophet's followers. Next to him in position is 'Umar Faruq". He does not say anything here about 'Uthman and 'Ali.

The book is written in simple Arabic and published with Urdu translation.

In the third section different faiths and their codes of laws (شرائع) are mentioned.

(19) *Al Qaulul Jamil fi Sawa'is Sabil* (القول الجميل في سواء السبيل) In this book Shah Wali has discussed various orders of the sufis like Qadiria, Chishtia, Naqshbandia, Suhrawardia and others. He has explained the significance of *bay'at* (بیعت), the qualifications necessary for a preceptor (مرشد) and the rules for the training of a novice (مرید). He has also given necessary *aurad* (اوراد) and *waza'if* (وظائف), *i.e.*, extraordinary recitations etc. of each order and their individual physical and spiritual benefits.

(20) *Anfasul 'Arifin* (انفاس العارفین) : This volume contains life accounts of various sufis and other savants including Shah Abdur Rahim, and details about the ancestors of the author, the mystic views of the former, and a brief autobiographical note.

The book is invaluable for the biographers and the students of mysticism. It contains references to some unknown but important mystics of the medieval times.

Other small but important treatises on this and other allied subjects written by Shah Wali Allah are : Atiyyatus Samadia, Sharh Ruba'yatain (Commentary on the two rubais of Khwaja Baqi Billah), Anfasu Muhammadia, Lam'at, Al-Khairul Kathir, Shifaul Qulub, 'Awarif, Altaful Qudus, Tawilul Ahadith, Faid-i-'Am, Surul Mahzun, Maktubul Ma'arif.

Munazara or Verbal Contests

(21) *Izalatul Khifa* (ازالة الخفا) : The main theme of the book is the justification by arguments the succession of the four caliphs of the Prophet (peace be on him). In the course of the discussion the principles of sociology too have been dealt with. In the opinion of M. 'Abdul Hayi of Farangi Mahal (Lucknow) there is no better work to be found in the whole of Islamic literature. The original book is in Persian. Its Urdu translation is also available. But both Persian and Urdu editions are not very well done.

(22) *Quratul 'Aynain* (قرة العینین) : Shah Wali Allah wrote this book at the instance of Khwaja Muhammad Amin to answer the charges of the Shias and to remove the doubts of the *misled* people. Shah Wali has proved by historical evidences that the two early caliphs (Abu Bakr Siddiq and

definition of the *path* leading to the Absolute Reality and illustrates the difficulties of it by his personal experiences. The path begins with the "obedience of the laws of Shariat" and gradually drifts away from it as one advances on it. There comes a stage when (in a majdhubi state) one can be exempted from religious observances. But this stage is reached by few only who for the sake of the world rather prefer to stick to the Shariat. His father, Shah Abdur Rahim, was allowed to go without religious observances but he chose to remain in his actions within the pale of Shariat.

The differences in the experience of the sufis are merely due to the difference in grades of their perfection. But all the sufis are to be respected for their devotion to the Almighty and search for Truth. The book was completed in 1148/1735.

(17) *At-tafhimat Ilahiya* (التفہیمات الہیہ): It is another record of Shah Wali's mystic experiences written both in Persian and Arabic. He discusses therein the theoretical and practical knowledge of the sphere of the *unknown*. Some of his expressions are unintelligible by ordinary readers. At the end the editors of this record have given Shah Wali's famous letter to Isma'il Affandi of Madina in which he has discussed the possible reconciliation of the doctrines of "Wahdatul Wujud and Wahdatush Shuhud" (وحدة الوجود و وحدة الشهود).

(18) *Al-Budurul Bazigha* (البدورالبازغه): The book in a way is a supplement to the Hujjat and deals both with mystic and sociological developments. It is divided into three sections (مقالات), each section having various parts (فصول). In the first section Shah Wali discusses the innate human qualities which determine one's ethical and social achievements. He proves by illustrations the superiority of human nature over other species of animals. Unlike beasts who act under instinctive urges and never (or seldom) change their modes, human beings have the capacity to control their instincts and modify their behaviour. He discusses in detail the sociological progress of humanity ranging between a barbarous condition of the forest dwellers and the highest form of culture and civilisation.

The second section deals with the natural capacities of human beings by which they seek knowledge, practical as well as theoretical, of God. The life after death, the sufferings of human beings in the grave, and punishments of hell are also briefly discussed in it.

The Prophet forbade "buying and selling of a fruit-garden before the fruit is ripe." This order was not given merely out of fancy. It was done so because such a bargain was likely to create trouble in the society. Such explanations of the religious commands have been given by Ghazāli, al-Khattābi, Ibn 'Abdus Salam, and a host of other 'ulama.

The commands (الاحکام) are indeed based on reason; but the reason itself has no permission to tamper with them. Some learned men believe that to discuss such explanations of the ahkam is forbidden, because the companions of the Prophet as we know did not care to look into the inner motives of the commands. But these learned men are mistaken on their part; such explanations are quite necessary now to silence the innovators-in-religion (بدعتی) in their mischievous arguments.

Shah Wali Allah claims to have followed his independent course in his arguments of the Ash'arite School. Although the subject is pretty tough, yet he has put things in a simple and understandable way. The simple and beautiful language has turned the tedium of reading into a pleasant study.

Mysticism (تصوف)

Shah Wali Allah's contribution to this subject is fairly large, which bears witness to the fact that he had great interest in the subject and had actually covered many stages of the Tariqat (طریقت) or mystic path.

(14) *Sat'at* (سطعات): It is a booklet in Persian wherein the author has tried to explain the relations between "The Creator and His Creation" or Dhāt-i-Baht and 'Alam-i-Shahādat (ذات بحت و عالم شہادت).

(15) *Fuyuzul Haramayn* (فیوض الحرمین): This is a record of religious experiences which Shah Wali had had in the Ka'aba and at the tomb of the Prophet. The book is extremely valuable to a student of mysticism for information regarding approach to the Absolute Reality. In all there are forty-seven visions (مشاہدات) in the book which deal with different aspects of practical and theoretical mysticism. He has described the way unity exists in diverse forms of the universe, and the capacity of man to know that unity.

(16) *Ham'at* (ہمعات): It is a book on historical development of Islamic Mysticism. Shah Wali gives in it the

no right to interfere with the verdicts of the early jurists. His duty is only to give fatwas according to those given by the old jurists. *Taqlid* technically means to follow any particular school of Fiqh without questioning the authority of any of its verdicts. Imam Ibn Hazm and other scholars believe that taqlid is not permitted in Islam. "If it were really permitted the companions of the Holy Prophet were the most suitable persons to start with it. But we know for certain that they followed their own individual course in the masa'il of Fiqh."

Ibn Hazm is right indeed ; but his verdict is not tenable in the case of the people of the later generations swayed by many considerations other than mere service to Islam. The selfish motives of the qadis (judges) of the present age stand in the way of dispensation of justice. While influenced by personal interests one cannot take correct inferences. It is therefore necessary to depend for the knowledge of the Shariat on the ijtihad of the specialists of this science.

Scholasticism (کلام)

(. .) *Hujjatullahil Balighah* : *vide* 11 op. cit. part one of the book contains discussions on scholastic problems (مسائل علم الکلام). The author has explained (as given above) the true significance of the main dogmas of Islam. He discusses the action of the divine attributes, khalq, ibda', tadbir and tadalli (*i.e.* creation, adjustment of it in various spheres and divine guidance to keep things in order), some metaphysical problems, eternal law of God, the soul, the secret of responsibility, and its predetermination. Reward and Punishment are the essential features of Responsibility and moral and spiritual attainments vary according to individual capacity. He also discusses in brief about human actions and their effects on the Nafs, truth about Death, Barzakh, and Resurrection, etc.

It is wrong to believe that the commands (ahkam) of Shariat are merely an assertion of God's Will. But on the other hand each command has special purpose or object before it. Prayer is made obligatory so that man may establish contact with his Creator and thereby may get His vision on the Day of Judgment. In the same way there is a definite object of pilgrimage, giving of alms, fasting, retribution (قصاص), etc.

there is hardly any scholar of Hadith and Fiqh who can successfully take inferences of sound nature. Also if all the people begin to take inferences from the Hadith or verdicts of the Ashab of the Prophet there will a lot of confusion in the legal affairs. This, however, is not incumbent on any Muslim that he must follow only such and such particular school of Fiqh. It is up to his choice to follow *any one* of the four. The best thing, however, is to follow the one which is followed by majority of the poeple in the land. For instance, in this sub-continent it is essential for an individual to follow the Hanafi school, for most of the people here are Hanafites.

(13) *'Iqdul Jid* (عقد الجيد) : In this book Shah Wali explains the intricacies of the masa'il of *ijtihad*[15] and *taqlid*. Ijtihad may roughly be described as an attempt to find out the correct solution of the masa'il of ahkam furu'i (احکام فروعی) (or problems of the minor commands of Shariat) with the help of the Quran, Hadith, consensus of opinion (اجماع) of other great jurists, and personal views (قیاس و رائے). It is wrong to believe that there could not be any *mujtahid* after the great Imams or the founders of the schools. Any one who has thoroughly mastered the Quran, Hadith, the opinions of the jurists, and possesses intellectual powers to take inferences, can be a *mujtahid*.

Mujtahids are of various categories. Mujtahid Mutlaq (مجتہد مطلق) or independent mujtahid is one who on the merit of his great knowledge of the Scriptures and the Hadith, etc., and capacity for initiatives, follows his own course as it was done by the founders of the four schools of Fiqh and other 'ulama of the early two centuries of Islam. According to Shah Wali there have been no such independent mujtahids after the fourth century of Hijra.

Next to Mujtahid Mutlaq in rank is the Mujtahid Muntasib (مجتہد منتسب) which is of two categories: Mujtahid bil Madhhab wa Mujtahid bil Fatwa (مجتہد بالمذھب و مجتہد بالفتویٰ). The former class which includes in it savants like Imams ibn Taimiya and Jalaluddin Suyuti uses its intellectual powers within one particular school in determining the *furu'at* only. He follows the broad principles of Fiqh (usul) and the fundamental texts of any one of the founder Imams. A *mujtahid bil fatwa* is a minor type of mujtahid who has

15. Ijtihad literally means to strive after or struggle for.

4. Management of a family affairs including marriage, mode of living, responsibility of a married life, divorce, education of children ;

5. Administration of a state, caliphate, justice, holy wars, protection of the weak ;

6. Social etiquettes ;
7. Visions and dreams ;
8. Sketch of the life of the Prophet ;
9. Miracles, their significance, etc.
10. Al-Fitn, etc.

The book by itself is an authentic collection of the hadiths of the Prophet (peace be on him), which have been arranged according to the topics. The second part in some places overlaps the first. The language, however, is very simple and charming.

Fiqh or Islamic Law

(12) *Al-Insaf* (الانصاف)[14] : Shah Wali in this book has elaborately dealt with the causes of differences among the Ashab over various problems of the Muslim Law which gradually led to establishment of four schools of fiqh. Differences, he says, occurred due to misunderstanding of certain acts of the Prophet, or due to forgetfulness on the part of the reporters (who confused one thing with the other), or due to change which took place in the report in the course of its transmission.

The founders of the schools differed only in minor points, fundamentally they followed the same course. It is wrong to assume that these schools are final and no improvement could be made on them. The fact is that the scholars who possess sufficient knowledge of the Quran and the Hadith must verify all verdicts of Imams of the schools and reject them if they contradict any authentic hadith. This is what the Imams themselves have indicated in their writings. Also a scholar can reject the *ra'i* of an Imam if he can produce a better one for himself.

The emphasis laid by several jurists on following any of these schools is merely an expedient measure for the sake of uniformity in worship and other things. In this age, besides,

---

14. This was actually written as a regular chapter of the حجة الله البالغه but later on it was given a separate book form with a few changes here and there.

reference books and as no reliance could be put on the personal attainments and the memory, he had to put off the plan until he returned to his country. He started this work at the instance of his favourite pupil and relation, Shaikh Muhammad 'Ashiq of Pahlit. Shah Wali actually wanted to evade this request but had to accede to it when the latter reminded him of the fact that the refusal to answer the problems of Shariat is to make oneself liable for the punishment of hell.[13]

"Of all the branches of Islamic Sciences", writes Shah Wali, "the secret and philosophy of the commands of Shariat are the most important". Shah Wali in this book has made an attempt to explain these secrets which in his opinion has not been done by any scholar of very high integrity.

The book is divided into two parts. The first part deals with the dialectic problems. In the second part he has explained in details the message of the Prophet handed down through his traditions.

The first part, in fact, consists of problems (مسائل) of special interest to the students of scholasticism; that is, the creation of the universe, spheres of angels, similitude, and matter (ملکوت، مثال and مشاهده); significance of responsibility and its natural outcome in the form of reward and punishment in this world and the next one, sociological problems, attainments of سعادت (virtue) through various means, significance of tauhid (توحید), attributes of God, etc., etc. Therein he has proved by illustrations that the الاحکام (commandments of Shariat) are not given merely out of fun ; but they have a definite purpose and have their bearing on the very nature of those intended to.

In the second part, which is also further divided into various sections Shah Wali, has discussed :

1. Faith along with its *arkan*, ablution, prayer, pilgrimage, fasting, poor tax, and the Quran ;

2. Various stages on the path of spirituality (معرفت) ;

3. Means of earning livelihood and its other implications concerning society, like co-operation in work, business, etc.

---

13. *Vide* Introduction to the *Hujjat*. In the opinion of some scholars Shaikh 'Ashiq Muhammad was to Shah Wali what Hassan Hussamuddin was to Rumi. Shah Wali remembers him in these words : "He is embodiment of my teachings and a treasure of my achievements. His engagements are to preserve my scientific acquisitions and study my works. The fact is many of my works are inspired by him. He prepared their manuscripts. (*Vide Maktubat*, p. 35.)

school of Fiqh. Among the available collections of hadith *Al-Muwatta* occupies the foremost place on the basis of its authenticity. In *Al-Masaffa* Shah Wali has arranged and explained the hadith according to the ijtihad and thus made it more useful for the students.

(5) *Al-Musawwa* (المسوّى) : It is an Arabic commentary of the *Muwatta*. In it he has also given the learned criticism with regard to the interpretations of different hadiths by various scholars. The hadiths too have been arranged in a form that it may be convenient for reference. In each chapter he has mentioned the legal problems of both Hanafi and Shafi'i schools.[12]

(6) *Sharh Tarajam Abwab-i-Bukhari* (شرح تراجم ابواب بخاری) : The book contains illuminating annotation on the chapters in the collection of hadith of Imam Bukhari. The material of course has been taken from various books of tafsir. The author has also given some of the principles underlying the headings of the Bukhari. (*Vide* for detail ***Contributions of India to Arabic Literature*** by Prof. Zubaid Ahmad.)

(7) *Musalsilat* (مسلسلات) : It is a small treatise on the authorities of the hadith of the Prophet.

(8) *Intibah fi Isnad Hadith Rasulullah* : It is another Persian work (in two parts on the authorities of the traditionists).

(9) *Al-Irshad Ila Muhimmat ul Isnad* : This book deals with the same subject as the *Musalsilat* (given above). Its MS. is preserved in the Hamidia Library, Bhopal (India).

(10) *Chihl Hadiths* (or اربعين) : A modest collection of forty hadiths of the Prophet which deal with the basic principles of the religion of Islam.

(11) *Hujjatullahil Balighah* (حجة البالغة) : This ***magnum opus*** of Shah Wali Allah is a unique work for its distinguished features. It is really a book of which our scholarship could justly boast. In the opinions of some great savants the *Hujjat* is an improvement on the *Ihyaul 'Ulum* (احياء العلوم) of Imam Ghazali. Shah Wali discusses in this book both scholasticism ('ilm-i-kalam) and the secrets of the science of Hadith (which he regards as the most important of all other sciences).

The idea of writing such a work occurred to his mind when he was in Arabia. But owing to lack of authentic

---

12. *Contributions of India to Arabic Literature*. p. 38.

sense of the Quran. According to him the Quran is similar in many ways to the collection of *farmans* of a king which naturally will have no regular sequence in the context.

Shah Wali divides the text of the Quran into five distinct subjects: (*i*) *al-Ahkam* (الاحکام) or commandments; (*ii*) *mukhasima* (مخاصمہ) or contention with four classes of people, *viz.*, polytheists, Jews, Christians, and hypocrites; (*iii*) *Tadhkir bi ala' Allah* (تذکیر بآلاء اللہ) or an account of the gifts of God; (*iv*) *Tadhkir bi ayyamillah* or references to the past history of mankind. rewards to the good and punishment of the evil; (*v*) *Tadhkir bil maut wa ba'd al maut* (تذکیر بالموت و بعد الموت) or an account of death and the life-after-death, scrutiny of the deeds of men, paradise and hell, etc.

Shah Wali does not put much emphasis on the events which are often taken as the causes of revelation of the verses of the Quran. The verses would have been revealed, he believed, even though there were no such events. Also he feels that the verses should always be taken in the general sense and not in the particular. That *this* verse was revealed for "X" and *that* for "Y", minimises the importance of the message of God.

Shah Wali believes in the *tansikh* (تنسیخ) or abrogation of certain verses of the *al-Ahkam*; but their number is not very large as many scholars of the past believe.[11] He proved by facts that the Quran is a linguistic miracle, and it is impossible to produce its like.

(3) *Fathul Khabir* (فتح الخبیر): It is a small treatise on tafsir written in Arabic. Shah Wali has explained certain words and phrases of the verses in the light of the hadith and authentic verdicts of the اصحاب (companions). The book actually forms a supplement to the *Fauzul Kabir* and is essential for the study of tafsir. This book contains the explanation of those words etc. which have not been included in the famous book *Ittiqan* of Jalaluddin as-Suyuti.

Hadith or Tradition

(4) Al-*Musaffa* (المصفیٰ): It is a Persian commentary of the *Muwatta* of Imam Malik, the founder of the Maliki

11. *Vide Shah Wali Allah aur unka Falsafa*, p. 72. Some scholars think there is no tansikh of verses, while others believe there are as many as five hundred abrogated verses in the Quran. According to Shah Wali the number of abrogated verses cannot exceed five.

the patron of the society, the plan for further publications seems to have been abandoned.[7]

Shah Wali's important works known to us are :—

Tafsir (Exegesis)

(1) *Fathur Rahman* (فتح الرحمن) : It is a simple translation of the Quran with occasional marginal notes. The notes have made it a regular tafsir or commentary useful for both a scholar and a lay man. In the Introduction of *Fathur Rahman* Shah Wali writes that only the exigency of the time and the circumstances prompted him to render the Quran into simple Persian (the official language of the land) without showing any pedantic erudition and dilating upon stories and parables as done by other scholars of the past.[8] It was started before Shah Wali left for the Hejaz. On his return, due to other engagements, he could not take it up soon and finish it at a stretch. It was abandoned for some time because the pupil who used to take it down as dictated by Shah Wali, went away home. Thus doing it by fits and starts, it was completed on the Idud Duha, 1150/1738 and adjusted with the text in Ramadan, 1151. Then through the efforts of Khwaja Amin, several copies of it were prepared and made available to the scholars.

The idea behind this translation was that by this simple Persian the children of the labouring classes who were not able to acquire proficiency in Arabic would learn the meanings of the Quran quite easily.[9] This translation is distinguished for following peculiarities : (*i*) It is a simple rendering of the verses, neither too literal nor merely carrying the sense. The middle course has been adopted. (*ii*) Allusions are only briefly mentioned. (*iii*) Taujih is based on genuine hadith or the verdicts of the Faqihs. (*iv*) Translation has been given in a way that a man even with a little knowledge of the language can follow it.[10]

(2) *Al-Fauzul Kabir* (الفوز الكبير) : It is a valuable book on the principles of tafsir (exegesis) written especially for the benefit of higher students. Shah Wali has laid down certain rules which if followed could help one grasp the general

7. Prof. Sarwar translated *Al-Qaulul Jamil, Ham'at, Fuydul Haramayn* and published from the Academy.
8. *Vide* MS. 133 (A.S.B., Calcutta), fol. 1, 2.
9. *Ibid.*, fol. 3.
10. *Ibid.*

Delhi was now no longer the seat of Islamic learning and education. The scholars had left for other suitable places and founded their madrasas there. After some time Maulvi Muhammad Qasim,[6] a graduate of Shah Wali School and a very well-known theologian, opened an institution at Deoband, which may now be taken as the true replica of its prototype or rather a real successor of that great seat of learning.[6] The institution has ever remained the flourishing centre of Islamic Studies. The ex-pupils of this madrasa are to be found in every part of this sub-continent. About the same time Sayyid Ahmad, the pupil of Shah Muhammad Ishaq, planned the scheme of a university where the sciences of the West of which he was a great admirer, could be studied along with those of the East. This university which actually came into existence a little later at Kaul (now called Aligarh) had done the greatest service to the Muslim community in India.

Shah Wali Allah's Works

The value of a work can be judged not from its volume but from its quality and the useful effects it produces on the minds of the readers. Shah Wali's works have always been a guide to the learned and a source of inspiration to the seekers after truth. In fact, by his works, the prophecy of Shah 'Abdur Rahim that his order will last up to the day of Judgment has become true. The light kindled shall survive the storms of time and age.

Shah Wali was a prolific writer. He wrote a large number of books of which nearly all the important are now available either in MSS form or lithographed editions. The difficulty is that much care has not been taken in bringing out the edition of any one of them. All the published works, some with translations, are full of errors and slips (both in caligraphy and translation). Sometime back a publishing society of Lahore named *The Sindh Sagar Academy*, under the patronage of Maulana 'Ubaidullah Sindhi, undertook to bring out the critical editions of Shah Wali's works and some of them were actually published (in Urdu translation) with illuminating introduction by Prof. Muhammad Sarwar, formerly of the Jami'a Millia, Delhi. But since the death of

6. Maulvi Muhammad Qasim (d. 1292/1879) opened his school at Deoband in 1283. It has maintained its tradition up to this time.

area.[4] After Shah Wali's return from the Hejaz (1145/1732) the madrasa was shifted to a more convenient place in the New Delhi of Shah Jahan. The building which was not far from the Jamia Masjid, the famous cathedral mosque of Shah Jahan which still exists in its original beauty and grandeur, was donated by the then ruler, Muhammad Shah commonly known as the "Rangila" (Pleasure-lover). A small masjid was also attached to it wherein some sufis and learned scholars from amongst the pupils of Shah Wali had taken up residence. Shah Wali himself lived with his family in a part of the building.

As the graduates of the school went back to their homes, they opened their own schools on the pattern of this madrasa. In this way a net-work of institutions was established throughout the country for the diffusion of the light of knowledge. The most important of them all were the Madrasa of Nawab Najibuddawla at Najibabad where nearly all the students received monthly stipends; the Da'ira of Shah 'Alimullah at Bareili; and the Madrasa of Mulla Muhammad Amin at Tattha (Sindh).

The Madrasa'i Rahimiya continued in its distinguished position long after Shah Wali's death. After him his eldest son, Shah 'Abdul 'Aziz, took charge of it. The chief feature of it now was that Persian was replaced by Urdu as the medium. After the death of his four sons ('Abdul 'Aziz, 'Abdul Qadir, Rafi'uddin, and 'Abdul Ghani), and migration of his grandson, Shah Muhammad Ishaq to Arabia, Mukhlisullah and Musa, two sons of Shah Rafi'uddin, supervised teaching work. But the glory of the past had disappeared. As the Sepoy Mutiny came (1857) and Delhi passed into the hands of the British, remnants of the Muslim population quitted Delhi and settled elsewhere. The madrasa closed down, its building was sacked by the mutineers and all the movables stolen. The site was then auctioned and purchased by some Hindu rich man. The lane still, however, was called after Shah 'Abdul 'Aziz.[5]

---

4 *Vide* for the description of the Feroze Shahi Masjid, Sayyid Ahmad Khan's famous book *Athar-o-Sanadid*. Taimur took up his residence in the Masjid during his invasion and sack of Delhi (139 A.D). After Shah Wali's death Shah 'Abdul Qadir gave his lectures in this place. The mosque disappeared during and after the mutiny of 1857.

5. *Darul Hukumat Delhi*, II, 173-74.

Hejaz *via* Calcutta. After an extensive tour of Arabia and the adjoining countries for two years, they returned to Delhi in 1239/1824. Now Shah 'Abdul 'Aziz was dead and Shah Muhammad Ishaq had taken charge of the madrasa and also had become the head of the movement of Jihad. It was now decided to take the field. As the Indian Muslims could not wage full-scale war single-handed and also it was not possible to establish its Headquarters at Delhi, Shah Ishaq proposed to shift to the tribal territory in the north. Besides, it was felt as necessary to punish the Sikhs first who, having established their state in the Punjab, were giving much trouble to the Muslims. Even the freedom of worship at various places was denied to them.

According to this decision Sayyid Ahmad with his associates, Shah Isma'il and 'Abdul Hayyi and others left Delhi for the frontiers of the sub-continent (December, 1826). After halting a little at Khairpur (Sindh) for reinforcement from Delhi, they marched on and reached their destination sometime in January 1827. As arranged beforehand with the Pathans, the war was immediately started with the Sikhs. In several skirmishes with the enemy the Mujahids gained some ground. Peshawar too fell in their hands in course of time (May 1829). Now Sayyid Ahmad proclaimed himself the Caliph and struck coins bearing his name. But it must be admitted here, the Sayyid lacked the sagacity of a shrewd statesman. He made some tactical blunders in dealing with his new associates the Pathans, which led to unfortunate consequences. The Pathans for certain reasons killed all of his civil adminstrators and he was forced to leave with a small band of warriors to seek shelter in Kashmir. But on his way at Balakot (Kaghan) he was surprised by the Sikhs and killed. Shah Isma'il also fell in the same battle (1830). This was the end of the first phase of the Jihad. (For details about this Jihad see *Sayyid Ahmad Shahid* by Maulana Ghulam Rasul Mihr, which appeared sometime back and is very well written).

Shah Wali's Madrasa

The Madrasa of Shah Wali Allah was actually started by his father, Shah 'Abdur Rahim, after whom it was called the "*Madrasa'i Rahimiya*", some time during the reign of Aurangzeb. It was located in a building adjacent to the Feroze Shahi Mosque in Kotla Feroze Shah (Tughlaqabad)

That fatwa which actually does not bear your name is regarded as a questionable authority. It will be a great honour if you favour us with a visit. The king of Turkey will be pleased to receive you in his audience "[1]

Shah Abdul 'Aziz wrote several books on tafsir and hadith and other subjects and simplified further the philosophy of Shah Wali Allah. Shah 'Abdul Qadir and Shah Rafi'uddin translated the Quran into Urdu and thereby made it understandable to the masses. The fact is, as Maulana 'Ubaidullah Sindhi puts it, Shah Wali awakened the intellectuals only; but Shah 'Abdul 'Aziz and his associates approached the middle class and through them the masses.[2]

Now the times were changed and the situation had become desperate. The Farangis (English), known only a little to Shah Wali[3], taking advantage of the chaos, penetrated deep into the land and became the *de facto* rulers of the Mughal Empire. The king was reduced to a titular position only.

It was now thought fit by the followers of Shah Wali to take some effective step to recover the lost prestige and the territory of Islam. Shah 'Abdul 'Aziz declared the country as Enemy Land (دارالحرب) and he called upon every Muslim to fight against the infidels or leave the country. A movement was started to organise the masses under efficient leadership so that war could be declared against the new rulers. Among the leaders of the movement Shah Isma'il, son of Shah 'Abdul Ghani, was the most enthusiastic and he wanted to take the field straightaway.

In the meantime Sayyid Ahmad, a pupil of Shah 'Abdul Qadir, returned from Tonk where he was a cavalier in the army of the Nawab (1231/1816). On the merits of his experience he was selected to be the chief of the holy warriors. Messengers were sent to all parts of the country to acquaint the people with the new decisions taken in favour of *jihad*.

A few years later when the movement gained sufficient momentum and the name of its leader was on the lips of every one, the Sayyid (Ahmad) and his associates left for the

---

1. *'Ulama'i Hadith Hind*, p 50
2. *Siyasi Tahrik*, 72.
3. *Vide Maktubat*, 47. In his letter to Shah Abdali, he refers to the Farangis who rendered help to Nizamul Mulk in driving away the Marathas.

Amir Muhammad b. Isma'il Yamani, Shaikh 'Abdul Khaliq.... and a host of others who though followed their own respective paths, knew the secrets of the Truth. But it should be known that the position of a victor or king of the age was yet to be filled by one, named Shah Wali Allah, the proof of Islam. Of course, other people did a lot of work for the (revival of the) faith, but that what was done by him could be done only by a person of his calibre.[64]

II

LEGACY OF SHAH WALI ALLAH

AT HIS DEATH Shah Wali Allah was survived by his—

(1) four sons (and a daughter) and a large number of his pupils trained by him and so much devoted to him as anybody else ;

(2) madrasa or school (مدرسۂ رحیمیہ) for whose stability he spared no pains ;

(3) his works, the treasure of information regarding physical and spiritual affairs.

Shah Wali's progeny : It is but extremely rare that the sons of great savants are also great. In the old memoirs we find them mostly succeeded by their disciples rather than their sons or close kinsmen. But in the case of Shah Wali it is a wonderful exception. Shah Wali's four sons, Abdul Aziz, Abdul Qadir, Rafi'uddin, and Abdul Ghani, were equally distinguished scholars of religion and philosophy. Shah Abdul Aziz, the eldest, took charge of the madrasa and proved equal to the task. He was assisted by his brothers and classmates and pupils in his work. In fact, it was a very fortunate group which meets but very seldom.

The school was attracting students from different parts of the world and Shah Abdul Aziz commanded a great respect among the peoples of all the lands of Islam. Any 'fatwa' or decree bearing his signatures was looked upon as an inviolable law of the shariat. Mulla Rashidi Madani, in his letter to the Shah which he wrote from Istanbul, says : "Shah Sahib, your name is so widely known that if any fatwa is issued, the people look for your signature on it.

64. *Tadhkira Azad*, p. 258.

Usul, cannot be denied by any one unless he is blind to these facts."[61]

At another place the Nawab says : "Indeed, if Shah Wali Allah had lived in the early days of Islam he would have been counted as the Imam of Imams and the crown of mujtahidin. The admiration and appreciation of his works by the contemporary 'ulama is so sincere and voluminous that these few lines seem so superfluous and unnecessary. The number of scholars who attained their perfection in 'ulum-i-zahir wa batin (علوم ظاہر و باطن) and then reached the pinnacles of spiritual greatness by simple reading the marginal notes of his writings, is very large. His children too stand unique and unparalleled in their 'ilm-o-'amal, wisdom and understanding, oratory, eloquence, piety, honesty and faith. So are his grandsons. The whole house, so to say, is a source of light and this chain of genealogy is nothing but of pure gold."[62]

Maulana Shibli, another critic and prolific writer in Urdu of this century, pays his tribute to the Shah in these words : "By the mental or intellectual degradation (or perversity of learning) which started among the Muslims after (or rather in) the time of Ibn Rushd and Ibn Taimiya, there was little hope left that any man with all the faculties of head and heart intact would take his birth again. But just mark the miracle of nature that at a time when Islam had reached the last stage of its existence there appeared Shah Wali Allah who infused a new spirit into it, in a way that the deeds done by Ghazali, Razi, and Ibn Rushd paled into insignificance."[63]

Maulana Abul Kalam (Muhayyiddin Ahmad), the renowned commentator of the Quran of our own time, recording the appreciation of services rendered by various savants during the twelfth century, writes : "Just see the progress of science and learning in the 12th century, the land was going to be barren (of course there were some patches of green and red left here and there). In India and in other lands too there were some prominent persons like Shaikh Ibrahim Kurnani, Muhammad b. Ahmad Asfarini, Sayyid 'Abdul Qadir Kaukabani, Shaikh 'Umar Fani Taunsi, Shaikh Salim Basri,

61. *Vide* previous page for the note.
62. *Ulama's Hadith Hind*, p. 14.
63. *'Ilmul Kalam*, p. 109.

There have been very few such learned men in the past who possessed both intellectual and spiritual perfection."[59]

The work which Shah Wali completed (by preaching and writing) in so short a time has ever since remained unequalled and unique. It has made the 'Ulama of the later times to marvel over the volume and the quality of it. A traditionist of Yemen whom M. Muhammad Qasim of Deoband (d. 1297/1879) met on his way to the Hejāz, remarked: "Shah Wali Allah is a tuba tree (طوبیٰ) (which grows in paradise and bears all varieties of fruit) the branches of which are spreading out in all directions. His descendents are the branches of that tree, and wherever they are, there lies paradise."[60] Maulana Fadl Haq Khairabadi having gone through a part of Shah Wali's *Izalatul Khifa* said—"The man who has written this book must have a profound knowledge of the Quran, Hadith and Fiqh."

Nawab Siddiq Hasan Khan, another great genius of the 13th century, and himself a prolific writer, finds him specialist of every branch of religious science, and admires with equal seriousness and justice the services rendered by him. He says: "Every member of Shah Wali's family is like his eminent forefathers unique among the learned ('ulama) and the sufis. And why he should not be so? Besides unequalled talents, he had Faruqi blood in his veins. But, alas, ravages of time have effaced the family from the earth to its last vestiges. Inna lillah ... ... انا لله وانا اليه راجعون

"All the members of this distinguished house have not only possessed mâstery over the 'ulum-i-zahir wa batin but had also the capacity to be the leaders of the age. There is not a single family in India which could stand as a match to that of the Shah. It is a different matter if any other family happened to acquire so much of worldly wisdom, and owing to that it commanded great respect among the ignorant masses; yet the achievements of Shah Wali Allah and his descendents in the field of Hadith, Tafsir, Fiqh and

59. Mirza Mazhar Jan Janan, Shamsuddin Muhammad was a sufi of the order of Imam Rabbani Sarhindi His ancestors had ever been in the service of the Mughal kings but he cut off all connections with them and devoted himself to the study of sufiism and spiritual perfection. He was assassinated on the 7th of Muharram, 1195/1780 in Delhi by a Shia fanatic.

60. *'Ulama-i-Hadith Hind*, pp 12-13. Nawab Siddiq Hasan Khan was born at Qannauj, completed his education at Delhi and then settled at Bhopal. The Begum of Bhopal whom he married later on appointed him the court minister. He died in 1307/1881. His writings like *Ithafun Nubala* are very well known.

and a new group of puritans came into being whose duty it was to take his words to the remotest corner of the land.

It would not be out of place here to mention that Shah Wali did not receive any regular grant for his school from the king or any other official source. At least we are not aware of it. It is, however, probable that he may have received any occasional gifts. It is said that Shah Wali was an expert physician and had a large practice. Presumably this practice yielded an income which was enough to meet the necessary expenses.[55]

Shah Wali Allah died on the 29th of Muharram, 1176 A.H. (1762 A.D.) when he was sixty-one years and three months old. *Ubud imam-i-a'zam-i-din* (اوبود امام اعظم دین) was recorded as the chronogram.[56] The other chronograms quoted by M. Manazir Ahsan Gilani from the *Malfuzat Shah Abdul Aziz* is :

ھائے دل روز گار برفت

بست نہم محرم وقت ظہر[57]

He was buried in his family cemetery by the side of his father. This is actually the place where Shah 'Abdur Rahim had opened his madrasa. As the school shifted to the new town Shah Jahan Abad (Old Delhi) the old place became a regular graveyard for the family. The site can now be located outside the Turkoman Gate, just behind the Old Jail (in Kotla Feroze Shah area).[58]

Appreciation of his Services

Shah Wali, in fact, lived for others, passed his entire time in the service of Islam, and died as a martyr to the mission he was inspired with. The great scholars of the succeeding generations paid due tribute to his indomitable and indefatigable spirit. Mirza Mazhar Jān Jānān acknowledging the debt of Shah Wali Allah writes : "Hadrat Shah Wali Allah, (may God have mercy on him !), has given us a path to follow. He has discovered a method to fathom the depths of the secrets of divine knowledge (ma'rifat). Besides being a great scholar of several sciences, he was gifted with a clairvoyance.

55. *Hayat-i-Wali*, p. 269.
56. *'Ulama'i Hadith Hind*, p. 15 : *Tadhkira Gilani*, p. 278.
57. *Hada'iq-i-Hanafia* (p. 470), gives *Muqtada'i haqiqat-shanas*.
58. The place was near the Feroze Shahi Masjid (now defunct) the details of which have been given in the *Athar-o-Sanadid* of Sayyid Ahmad Khan.

that man's obligations to society are as important for his spiritual perfection as his religious duties. "It is not the *will of God* that men should quit towns and live in lonely caves worshipping all the time there." Such a custom will leave the world barren and the human race thus will be wiped out in due course. "The fact is every action performed by man has its reactions on the soul." Thus by his preachings and writings which continued without a stop he trained a large community of scholars who went about the country with the message of the revival of the faith.

Shah Wali Allah's End

Delhi was no safe place for a peace-loving scholar ; but Shah Wali preferred to live in the thick of the battle and carry on work to the end. Although there have been many indiscriminate killings in the capital, yet he somehow escaped unaffected.[51] No doubt he received a lot of mental pain from the misbehaviour of his co religionists and the scenes of vandalism enacted in the streets of Delhi ; yet his own life (physically) remained uneventful. The story that Shah Wali was once mobbed by the miscreants in the Fatehpuri Mosque is not based on facts.[52] We cannot also vouch for the truth of the treatment meted out to him at the instance of Najaf Khan, the Shia Governor of Delhi, who did not like Shah Wali's plain-speaking about the virtues of the Khulafa'i Rashidin.[53]

The opponents gave him trouble by open disapproval of things he preached. In fact, introduction of genuine hadith in the school curriculum and its study with a conscientious zeal was a challenge to the superstitious, half-baked scholars. It could not be tolerated by them so easily. It is related that Shaikh Abdul Haq, known as Muhaddith of Delhi, had made a similar attempt in the 10th century, but for certain reasons could not succeed.[54]

In spite of all this stiff opposition, Shah Wali's preaching and writings worked their way into the hearts of the people

51. *Maktubat*, p. 70.

52. *Tadhkira*, p. 300.

53. *Hayat-i-Wali* p. 231. It is related that Najaf Khan ordered Shah Wali's wrists to be dislocated. This was done to prevent him from writing anything against Shiaism.

54. *Ulama'i Hadith Hind*, p. 31.

But you have ignored this rule of nature and your responsibility.......Remember, one is not obliged to carry the burden of others ; so you should not be strict upon your persons lest you may fall into the sea of sin. God wants that His creatures should take advantage of the concessions made to them in the matter of worship and other duties. Satisfy your appetite by pure and simple diet, and earn as much as it is sufficient to meet your necessities. Neither should you be a burden on your kinsmen for livelihood, nor on the state and its officers. If you have a desire to work, God will provide you with its means too.

"O progeny of Adam, contentment is a prerequisite of prosperity. A person can lead a happy life if he has comfortable corner to rest, sufficient water to quench his thirst, clothes to cover his body (and his family's), a noble wife to help him in day-to-day life and to prevent him from doing sin. ....There are customs among you which make your life miserable. How extravagant you are in celebrating your marriages, births, and deaths ! You prevent widows from marrying for the second time, and do not allow women to take divorce .. ...You have given up the payment of poor-tax (Zakat), though there is not a single person among you who has no poor neighbours and relations about him. If they are helped, their life will become worth living. Soldiers amongst you go without observing religious duties, thinking that their heavy work entitles them to be exempted from any other obligations. But their pleas are flimsy. They are a heavy burden on the state as they remain idle all the time. If the king fails to pay their salaries any time, they plunder the poor subjects. Is it not a fact ?"[50]

From this long quotation it is quite clear that Shah Wali regards negligence of religious observances as the root of all the ills. Their ignorance of Islam had divided them into sects and schisms. So, after his return from the Hejāz, he took upon himself to preach true Islam among all classes of people and tried to make them conscious of their duties to God and man. He took up all the subjects of study including tafsir, hadith, fiqh, mysticism for discussion. He presented them in their true colour and "made truth (haqiqat) visible to the naked eye." But he laid special emphasis on the fact, which, however, is not to be traced in the works of other scholars,

---

50. *Tadhkira Shah Wali Ullah*, p. 105.

always say thus : 'God can do this' ; that is God is there only to change the time (in your favour)."[47]

Shah Wali Allah takes the soldiers, the holy warriors, to task in similar terms ; for they, due to addiction to liquor and bad manners, had suffered every possible degradation. They bred horses and collected arms only to loot and plunder, neglecting the real purpose of their existence. The manners of the learned men and sufis were also repugnant for him. The dishonesty and the foul means of livelihood of the craftsmen and the working classes was an open revolt against the Shari'at of Islam. The learned men ignoring the Quran and the hadith were lost in the philosophy of the Greeks and the problems of Grammar and they regarded it as the real pursuit of knowledge. Shah Wali reminds them that the true knowledge lies only in the Quran and the Hadith.[48]

Among the learned men there was a class of pseudo-sufis who sat at the tombs of their great ancestors and *sold* their names for a few coins. Each of such sufis was engaged in doing propaganda in favour of his own *holy man* whom he proclaimed to be the dearest to the Lord and through him any wish could be fulfilled. These unworthy sons of the saints were giving wrong lead to the people, turning them away from the right path of the Shari'at. "I cannot be a party to them," says Shah Wali, "who take bai'at (make disciples) just to swindle money. What a shame that the divine science (sufiism) is being exploited in this way ! But they should bear this in mind, this world is for those who follow the *Path of God*."[49]

Shah Wali sums up this criticism by addressing all the classes together : "O sons of Adam, you are morally defunct, for you play into the hands of the savage impulses and ignore the strict rules of society and its obligations. Women are set against men and men are indifferent towards the rights of women. Vice is pleasant for you and virtue is just tasteless. I can assure you God has not put anyone into a difficulty which is not within his power of endurance. It was intended that you should satisfy your sex desires by marriages even though you may have to keep four wives.

47. *Tadhkira Shah Wali Allah*, p. 88.

48. *Ibid*.

49. *Ibid*., p. 100.

"As such distinction is made you should settle down to the administration of the state. See that you appoint governors at all strategic points, each point situated at three days' journey from the other. The men selected for the job must be embodiment of justice and fairplay and be strong enough to enforce the law of God among the people. They must always remain alert to any revolt against the state or the faith. Every step should be taken to check major or minor crimes and every one should be urged to do his duty conscientiously.

"Each governor should be allowed to keep an armed force sufficient to maintain order in his territory. In no case it should be more than 12,000 men. He should by no means be allowed to muster strength so as to rise in revolt against the king.

"The regents or the viceroys of the provinces should be appointed from among the nobles experienced in warfare. Each regent should have an authority to wage a war if necessary against any rebel without reference to the crown.... After this, O kings of Islam, God wants you to attend to the social welfare of the subjects, to solve their difficulties and settle their affairs in a manner that there should not be left such thing as contrary to the shariat. It is after this arrangement only that the people can get real peace and prosperity."[46]

Addressing the nobles Shah Wali says : "Look, you are not fearing of God ! So engrossed in mortal pleasures you are that you have quite neglected the people put under your care. As a result of this, the big fish are swallowing down the small fish...you drink in the open and are not ashamed of it. Don't you see the lofty palaces built by some of you just for the commission of sin, extraction of liquor, and gambling ? And worst of all, you never interfere with their pursuits as if you are a party to the vice.

"Your mental energies are directed towards procurement of sweet dishes and enjoyment with soft and delicate women. You care little about anything except building magnificent palaces, wearing luxuriant dresses ! Have you ever bend your heads before your Creator ? No. God's name is there for you to be mentioned in stories and fables ! Or rather, I presume, by Allah, you mean changes of time ; for you

46. *Tadhkira Shah Wali Allah*, p. 88.

number of administrators and in keeping the army what is essential for the defence and maintenance of order. These are the secrets of statesmanship which the persons in authority should carefully follow."[44]

At another place he explains the same thing thus: "When a nation is brought (by force of circumstances) to such a state of economic inequality, it is not impossible that its poor people may become beasts of burden (like oxen and asses). But such a state lasts for a very short time. The divine will comes to the rescue of the oppressed as it inspires them with the means of deliverance (*i.e.*, the divine will feels it necessary to provide them with sufficient spirit and stamina to cast off the burden which the interest of the few had put upon them). In order to prove the truth of our statement the cases of the downfall of the Persian and Roman empires can be very well presented here. The ruling classes of these ancient empires were so deeply lost in personal pleasures and comforts that the interests of the poor who supplied them the means of pleasure were totally neglected. God inspired the people of Arabia with religious enthusiasm to march upon these territories and to relieve the labourers there from the tyrannies of the feudal lords. It is just for the reason that the death of a Pharaoh and the ruin of a Kaisar or Kisra is included in the duties of a Prophet......And what we see in the case of the lords of this land the stories of extravagance of Kaisar and Kisra have paled into insignificance".[45]

In his *Tafhimat-i-Ilahia*, a record of his investigations into the spiritual and physical spheres, Shah Wali reviews in a greater detail his impressions about the conduct of the kings, nobles, priests, and the common people. Addressing the king of Islam he says: "The divine will wants that you should (give up pursuit of *joie de vivre* and) draw the sword and do not bring it back to the sheath unless distinction is made between faith and faithlessness and heathenic rebels are brought to book and no chance is left for them to raise their heads again.

44. *Hujjat*, I, p 79. The translation is not quite literal.

45. In his *Siyasi Maktubat* (p. 41) he points some defects in the administration which if removed, he believe, would stabilise the empire and raise the prestige of the rulers. The most important of them are: 1. the smallness of the crown territory; 2. Small assignments of land to tiny officers who cannot control their estate; 3. disloyal elements in the fighting forces; 4. luxurious life of the amirs and nobles: and rampant bribery.

of violence. He appealed to them that if their forces passed through Delhi every precaution should be taken against arson and loot " because the citizens of the capital have already seen much of it ". He once wrote to Asaf Jah calling upon him to stop banditti in the land and assuage the condition of the famished people ; for the sighs of the people will stand in the way of his success.

Causes of the Ills

A close study of the *Siyasi Maktubat* and other similar works reveals that Shah Wali's observations about the causes of the ills of the state were remarkably correct. Although every class of the people contributed to the general chaos and downfall of the state, yet he puts the greater part of the blame on the stupidity and weakness of the king and the intrigues of the nobles. Owing to the weakness of the king the provinces one after the other passed out of his hand. The small territory of the Khalisa (crown land) did not yield sufficient revenue to meet the expenses of the services. The treasury was empty and heavy taxes were imposed on the working classes which in their own turn were giving up their professions. The unpaid soldiery lost its morale and deserted.

"In this time", he says summing up the discussion, "two are the main causes of the ruin of the country : (1) bankruptcy of the state treasury. It is just because a large number of people draw on it without doing in return any useful service to the state. They claim state help on the plea that they are soldiers, learned men, or belong to the order of sufis, ascetics, or class of poets and other such parasites. These pensions would naturally unbalance the state budget and the whole country will suffer for it.

"The second cause of the ruin of the country is the imposition of heavy taxes on its labouring classes such as cultivators, business-men, and craftsmen and their oppressive realisation, especially from those who lack proper means to pay within the fixed time. Forcible extraction of taxes leads to far-reaching effects which the state ordinarily cannot face. This compels the labourers to give up their profession and indulge in some anti-social activities. It often makes the discontented subjects desperate and disloyal. It should be borne in mind that the prosperity of the state lies in tolerable taxation, and in the appointment of limited

Due to their divided loyalty the empire was breaking up into shreds and pieces. The king's authority was recognised only in Delhi and its suburbs. Even Delhi was not quite safe from the frequent raids of the rebels. In a letter to Shah Abdali, Shah Wali Allah, describing the general condition of the state writes: "There were nearly one lakh men in the service of the king which included cavalry, infantry, the cadre of jagirdars and pensioners. Now owing to negligence of rulers things have come to such a pass that jagirdars cannot assert their authority in their jagirs. As a result of this maladministration the treasury has become empty and salaries cannot be paid. Thus all have dispersed and now are going abegging. The Government is there but only in name. When the state of the officers is like this one can easily imagine the condition of the general public, particularly the craftsmen and the traders. Over and above this, there came the blow of vandalism of the Jats and their associate Safdar Jang, which rendered numerous families homeless and indigent. Then the famine descended from heaven! In short, the condition of the Muslims is pitiable" (*vide Maktubat*, p. 51).

Shah Wali witnessed many a program in the capital. In fact, such scenes were very disgusting and the troubles had passed people's endurance. "The knife," as he writes, "had reached the bone". Yet he did not lose heart to gain back the glory of the past and peace of the old times. Physical helplessness provides one an opportunity to display one's mental worth. Shah Wali studied minutely the causes of the ills and prepared a program for the removal of them. He wrote to the rulers of the state including the king, the ministers and the nobles, reminding them of their duties. He asked Asaf Jah and Najibud Dawla to start a war against the Jats and the Marathas "because there is no time to wait and think, but to stir up the Muslims and strike". He encouraged them by assurance of divine help. He told them that the power of the Marathas was just a *tilism-i-batil* (fragile magic) which will disappear by a little effort. He also supplied them the ta'widh-i-Siláh تعویذ سلاح (amulet for victory of arms) for raising the morale.

Shah Wali urged all the powerful nobles to rise up at once and set things aright, for any more delay would be suicidal. He at the same time implored in the name of God not to interfere with the common people and avoid every kind

Condition of India on Shah Wali's Return

On his return after two years' absence to Delhi, Shah Wali felt that things on the political front had definitely gone from bad to worse. Muhammad Shah's bacchanalian revelries which won him the interesting title of "Rangila" (pleasure lover) had affected all classes of his subjects. The court was full of stinking intrigues ; each noble was set against the other in self-aggrandisement. Wine and women, rather than the duty and the state, swayed their mind. The provinces were full of banditti and rapacious marauders. The whole thing was in a state of hopeless confusion, which no doubt was an open invitation to the royal adventurers from across the frontiers of this subcontinent.

The new ruler of Iran, Nadir Shah, with his bloodthirsty horsemen, invaded the land and marched straight into Delhi after meeting a nominal resistance at Karnal, and celebrated his 'Id (10th Dhil Hijj, 1150/1738) by general massacre and arson in the capital. After a halt of nearly two months he left for home taking with him the huge wealth of the empire, the throne of solid gold, and the royal prestige. The loss of the last mentioned was really the greatest blow that an empire could suffer and it only hastened the end of the Great Mughals[43].

The Iranian king left an unfortunate precedent for other invaders to follow. A few years after, the incursions of Ahmad Shah Abdali started. Ahmad Shah, an ex-army officer of Nadir Shah and the new Afghan ruler (the one who is really responsible for the creation of '*Afghanistan*', came as many as seven times in the life of Shah Wali Allah. In his letter to Shaikh Muhammad 'Ashiq he has expressed his deep concern over these raids which were only sapping the life-blood from the veins of the empire. (*Vide Siyasi Maktubat*, pp. 68-78). Owing to unrest stirred up by these raids, the northern provinces were practically lost from the grip of Delhi Administration.

After the death of Muhammad Shah (A.D. 1748), the crown virtually became a toy in the hands of the nobles who mostly drew power from the Maratha, Jat, and Rohila rebels.

---

43. Shah Wali saw this massacre with his own eyes and has referred to this in his *Siyasi Maktubat*.

of the Prophet and bear their responsibilities, to communicate truth to the people with kindness and compassion, pray for their well-being demanding from God what is useful for them in their life and death.[41] Again at Mecca on the 21st of Dhil Qa'd 1144/1731, he saw in vision the powers of faithlessness creating havoc in his fatherland and the faithful being gradually eliminated from the scene of action. He was told of what he had to do under the circumstances ; *i.e.*, to bring about revolution and break down the old system and replace it by a new one adaptable to the time.[42]

To sum up what has been said before : Shah Wali during his stay in the Haramayn performed pilgrimage twice, read hadith with Shah Wafadullah, Shaikh Tajuddin, and Shaikh Abu Tahir. From the last-mentioned sufi saint he received the khirqa of all the sufi orders. He was inspired with the idea of renovation of the faith (Islam) and had developed sufficient powers for it. He recorded his religious experiences in a book (*Fuyudul Haramayn*), collected material for the biographies of his teachers which he included in his *Anfasul 'Arifin*, and planned at the instance of his brother Muhammad Ashiq, his chief work, the *Hujjatullahil Balighah*.

Shah Wali Allah Back in Delhi

On his return to Delhi (14th Rajab, 1145/1733) Shah Wali rejoined his school, reorientated the previous arrangement of teaching of subjects and passed time busily there. He introduced hadith of the Prophet as the most important item of the curricula. In teaching the Quran he confined only to simple recitation, the literal meanings, and time and occasion of the revelation of the verses ; and he left the other technicalities to the pupils themselves to think over them. He did not encourage the students to start with the difficult commentaries of the Quran and indulge in unnecessary controversies raised by various commentators. The spare hours he devoted to writing books and treatises on various masa'il and therewith carried on his work of reforms. He never wrote anything but what he was actually inspired with in his meditations. (*Vide Malfuzat-i-Azizia*).

---

41. *Fuyud*, p. 220.
42. *Ibid.*, pp. 297-298

enlightenment or bestowal of power to write books on religion for the revival of the faith. The gift of the pen from Imam Husain was specially significant that he would have to put up fortitude of the martyr of Karbala for the achievement of his object.

In Medina too, the visions continued and the revelation of the secrets of the Truth flowed on unchecked. The Prophet met him several times in his visions and disclosed to him "the secrets of life and the nature of his own existence". Shah Wali sought from him answers to some controversial religious masa'il which had ever troubled him before. The Prophet told him :

1. All the schools of Fiqh *viz.* Hanafi, Maliki, Shaf'i, Hanbali, were equally acceptable to him ; none was superior in any respect, for all of them were fundamentally the same.

2. All the sufistic orders *viz.* Naqshbandi, Qadiri, Suhrawardi, Chishti etc., were acceptable to God provided they were followed for His sake alone and without any kind of bias for any order.

3. The quarrel over the excellence and attributive greatness of Hazrat Ali on the one hand and that of Hazrat Abu Bakr and Hazrat Umar, on the other, were quite unnecessary and liable to create disruption among the Muslims. All of them were no doubt the worthy companions of the Prophet, and endowed with the qualities special to each one of them.[39]

In the same vision the Prophet honoured Shah Wali with the distinction of Ijmali Madad (implicit support) which means that he was selected for the position of *Mujaddid* (Revivor) of the 12th century[40]. Once again in the precincts of the Prophet's tomb and surrounded by an aroma of heavenly fragrance it was revealed that through him God Almighty wanted to bring together all the disunited limbs of the community, and that he would be called upon to follow the path

39. *Fuyud* pp. 123-124.

40. *Ibid.*, p. 127. Mujaddid or renovator of the faith is an inspired person who appears in the beginning of every century and reintroduces the commands of the Shari'at ignored by the people. The idea has its origin in the following hadith :

(God will, at the end of every century raise a person in this nation who would renew the religion—Abu Da'ud ; *Vide* also *Hujjat*, V. I, 341). It is maintained that there have been many persons like Umar b. 'Abdul Aziz, Imam Shaf'i, Imam Ghazali, Shaikh Jalaluddin Suyuti, Shaikh Ahmad of Sarhind and others, who held this distinguished position.

'Abdur Rahim too was a great master of the works of Shaikh-i-Kabir, having minutely studied them; but he was extremely cautious in regard to putting those ideas before the common people, because he feared they might be misled by them.[35]

At the time of bidding farewell to sufi Abu Tahir Shah, Wali Allah recited the verse (بیت):

نسیتُ کل طریق کنتُ اَعرفه　　　اِلّا طریقاً یوٴدینی لربعکم

i.e. I forgot all the paths I knew except the one that leads me to thy house.

The words struck deep into the heart of the sufi and tears welled up into his eyes. The Shaikh died two months after Shah Wali reached Delhi (Ramadan, 1145).

But of all the gifts which Shah Wali collected during his sojourn in the Hejaz, the greatest was the spiritual perfection attained at the tomb of the Prophet (peace be upon him). In his book called Fuyudul Haramayn (فیوض الحرمین), an account of his religious experiences, he writes about this gift: "The most important of all the experiences I have had in the Haramayn is an insight into the 'Invisible' and a meeting with the Prophet".[36]

It was in Mecca on the 10th of the Safar, 1144 A.H. (1731) that the first of the series of the visions took place. The vision had far-reaching effect on the future life of Shah Wali and determined the line of his actions. He relates that he saw in dream that Imam Hasan and Imam Hussain, the grandsons of the Prophet, had come to his house. Imam Hasan was holding a pen the point of which was broken. The Imam stretched his hand to give the pen to Shah Wali; but he held it back to have it mended first by Imam Husain. After mending Imam Husain handed over the pen to Shah Wali. Then the Imams gave him the striped mantle of the Prophet which he raised to his head out of respect and praised the Almighty for His mercy.[37] After this dream a change came upon him which was felt even by his companions.[38] This was a kind of inspiration and

35. *Anfas*, p. 48.
36. *Ibid.*, p 200.
37. *Fuyudul Haramyan*, p. 99, *Vide* also introduction to *Hujjat*.
38. *Al-Furqan* (Shah Wali Allah No.) p. 235. His brother Muhammad Ashiq saw a great change in him and his speech.

was the pupil of his father, the distinguished jurist, Muhammad b. Muhammad b. Muhammad Suleman Shah Wali received from him the ijazeh or permission for reciting, quoting and teaching of the ahadith (traditions) of the *Muwatta* Shah Wali also read the other noted book of hadith, the *Bukhari*, with Sheikh Tajuddin along with the revision of the *Muwatta* (*Kitabul Athar*), and the *Musnad al-Darmi*. Besides these two scholars he also contacted other learned men of the town who had specialised themselves in various sciences.

At Madina (Yathrab) Shah Wali met Shaikh Abu Tahir b Ibrahim Kurdi who in course of time developed a great love for his new pupil. With this reputed mystic and muhaddith, Shah Wali again read some of authentic books of hadith and received due permission for reporting, etc., from him. It is said that Shaikh Abu Tahir was very proud of being the teacher of such a talented pupil and often remarked : "Shah Wali seeks philological explanations of the words from me' while I seek his help in understanding the meanings thereof".[32] Shaikh Abu Tahir was a sufi of a very high order. He was the disciple of his father who in turn received the khirqa (mystic robe) from various sufis of different orders. The Shaikh granted Shah Wali the khirqa of all the orders he himself had received. In mysticism, Shah Wali is more indebted to this sufi than any other scholar or mystic. The reason was that Shaikh Abu Tahir's religious views were identical with those of Shah Wali's father, Shah 'Abdur Rahim ; for both of them traced their pupilship to the eminent logician and ethicist, Mulla Jalaluddin Dawwani.[33] The mutual love which sprang up between the teacher and the pupil was therefore quite natural. Shaikh Abu Tahir interpreted the Quran in the light of philosophy of Shaikh-i-Kabir Muhayyiddin Ibnul Arabi,[34] the great exponent of the doctrine of Wahdutul Wujud (Unityism or Pantheism). Shah

---

32. *Anfas*, p. 100.

33. Jalaluddin Dawwani was born at Dawwan in the district of Shiraz where his father was a Qadi. After finishing his education he worked as a lecturer in the Darul Ayatim at Shiraz. He died in 908/1502. His work *Akhlaq-i-Jalali* is very well known.

34. Ibnul Arabi, Muhayyiddin, Shaikh-i-Kabir, was born at Murcia (Spain) in 560/1165 , but he shifted his domicile to Seville where he stayed for 30 years, In 1201 A D he set out for the east and after seeing many places reached Damascus where he died in 1240 He belonged to the Zahirite school and rejected all kinds of taqlid in doctrinal matters, He is said to be the author of 400 books of which فتوحات مکیه and فصوص الحکم are very famous.

religionists. Things were too bad to start with the reforms single-handed. He therefore felt an urge to visit the Hejaz and have spiritual contact with the Prophet and receive his blessing for his work.

In the Hejaz at that time a large number of great traditionists and sufis had taken up residence. Shah Wali had in mind to meet them, attend their lectures, and attain thereby perfection in both physical and spiritual fields. The story quoted by the author of *Hayāt-i-Wali* (p. 231) that Shah Wali was obliged by the bigoted mullas of Delhi who did not like the idea of free circulation of the Persian version of the Quran among the masses, to start on his pilgrimage, appears to be nothing but a fiction. Shah Wali's translation was completed many years after his return from the Hejaz. Besides, his was not the first translation. There existed already many other.[28]

Shah Wali in the Hejaz

Shah Wali started for Surat on the 8th of Rabiul Thani, 1143, along with relative and friend, Muhammad 'Ashiq, the same who requested him to write his magnum opus, *Hujjatullahil Balighah* (*Vide* introduction to *Hujjat*). He returned to Delhi on the 14th of Rajab, 1145 A.H., having stayed over a year (14 months) in the Hejaz and performed twice the pilgrimage[29]. While in the two sacred cities (Haramayn), Mecca and Medina, he never missed the useful company of great mufassirin, muhaddithin, and sufis whose biographies he has included in his *Anfasul 'Arifin*[30].

Among the Meccan scholars, the one with whom he was for most of the time, was the renowned traditionist and sufi, Shah Wafadullah. Shah Wali read with him the *Muwatta* of Imam Malik edited (or reported) by the famous Spanish Faqih, Yahya b. Yahya.[31] Shah Wafadullah

28. In his tafsir "*Bahre Mawwaj*" Shihabuddin Daulat Abadi has given a translation of the Quran in Persian. Shihabuddin was born at Daulat Abad in the 2nd half of the 8th century A.H He received his education in Delhi and at the time of Timur's invasion he left for Jaunpur where he died in 849-1445. Shaikh Sa'di is also said to have translated the Quran into Persian.

29. *Vide 'Diwan Shah Wali Allah*, p 146. (Preserved in the Nadwatul Ulama Library, Lucknow).

30. In his *Anfas* (*Insanul 'Ain*) he has given a brief account of the scholars of the two sacred towns and has also referred to their mystic or other views.

31. Yahya b. Yahya was the pupil of Imam Malik. Through him the Malikite system became the law of Spain under Ummyids. He died in 849 A.D.

After the ceremony Shah Wali began to help his father in his teaching work at times when he was free from his studies of Tafsir and Hadith—the two subjects in which he intended to specialise. Shah Wali's marriage was celebrated rather in a hurry. He was yet fourteen when his father asked the parents of the bride for the solemnisation of his marriage, to which the latter objected for they lacked sufficient means to do it straightway. But Shah 'Abdur Rahim obliged them to accept the proposal for certain reasons which he did not disclose. The reason for the haste, however, came to light soon by the turn of events. After the marriage, death entered the family and took a heavy toll of it, leaving the house in a state of seething convulsions. "If marriage had not taken place at that time it would have been indefinitely delayed".[26]

Shah Wali was about sixteen when his father died (1131). He now took charge of the Madrasa and remained at the helm of its affairs till he decided to go on a pilgrimage to the Hejaz (1143). During these twelve years he had achieved sufficient intellectual maturity. Besides his lectures on *ulum-i-duniya wa din* (theology and natural sciences) delivered to his pupil, he had the opportunity to "explore the depths of the ocean of knowledge". He often sat in meditation at the grave of his father and received spiritual guidance from him. He succeeded in attaining many stages of the *suluk* (mystic path) which widened the scope of his religious experiences.[27]

Twelve years is a long period. A huge volume of water flowed down the river Jamna. Many horrible scenes were witnessed in the capital of Delhi. The throne of the great Mughal was desecrated and the king's person insulted. The royal prestige was reduced to the lowest point. As a result of this, administrative machinery broke at various places which gave an opportunity to half-hearted loyalty to change into an open revolt.

Shah Wali was not a passive spectator of all this. He wished to put off his garb of an ordinary school teacher; he intended now to offer his inspired guidance to his co-

---

26. *Anfas*, p. 202. After the marriage Shah Wali's mother-in-law died. This was followed by the death of grandfather of his wife (maternal side) and the death of his step-mother. Shaikh 'Abdur Rahim too fell ill, grew very weak and died in 1131 A.H.

27. *Ibid.*, p. 204.

Shah 'Abdur Rahim also met the other great sufis of the town and received sufficient encouragement from them.

Shah 'Abdur Rahim's ancestors were the followers of the Chishtia order of sufis. But he himself preferred Naqshbandi order, not for any particular reasons but just for his personal inclination toward the latter. He had attained such a high spiritual power that he could tamper with the natural course of actions; *e.g.*, he could cure the incurable diseases; talk to the spirits, and could understand the language of the beasts and birds.[22] Of his writings only a number of letters have survived which were published by the Mujtaba'i Press (Delhi) in 1915. Shah Wali Allah has given in his *Anfas* some of Shah 'Abdur Rahim's table talks and a few verses quoted here and there.

Shah 'Abdur Rahim was survived by three sons: Shah Wali Allah, Shah Muhibullah, and Shah Ablullah.[23] Shah Wali the eldest was born on the 4th of Shawwal, 1114 (1703) at Delhi or Pehlat, the place of his maternal relations. At the age of five he started attending the lessons in his father's madrasa. Shah Wali had inherited all the intellectual gifts of his father which helped him to learn things without any difficulty. Besides, he had greater opportunities than his father for developing his talents and natural gifts and aptitudes. So, he had greater chances for the service of the community and with greater success. He was just seven when he learnt the Quran by heart and understood the meaning of it. Thereafter, he took to the study of Arabic and Persian language and literature and attained sufficient mastery over both of them. He could now follow elementary books of philosophical subjects. He was only fifteen when he completed the course of his studies, prescribed for the graduates of the Madrasa'i Rahimia.[24] The occasion (*dastar bandi*) was celebrated by a big fete wherein all the relations and friends of Shah 'Abdur Rahim were present. In the midst of applause and jubilations, Shah Wali was granted the diploma, a permission to impart his knowledge to others as he had received from his own teachers.[25]

22. *Anfas*, pp. 37-50.
23. Shah Wali had also a step-brother named Salahuddin (*Anfas*, p. 63).
24. *Anfas* (Juz'i Latif), p. 203. The course included *Tafsir al-Baidavi*, *Mishkat* *Hidaya* and *Waqaya*, and books on logic, kalam, etc.
25. *Ibid*. The ceremony of *dastar bandi* was really a great occasion for the students of those days. This was very much similar to the University Convocation of these days.

was, however, hesitant to enter into the service of the king; but he had to accept it for the sake of his mother who thought it would relieve the family of its financial worries. But he did not work long there. He had to relinquish it soon at the instance of his preceptor. The preceptor, Khwaja Abul Qasim of Agra, regarded dependence upon the royal subsistence as an obstacle in the way of his spiritual perfection.[21]

After staying for some time at Agra attending the lectures of Mir Zahid, the majalis (assemblies) of Khwaja Abdulla and Khwaja Abul Qasim, and having perfected himself in various sciences and mysticism, Shah 'Abdur Rahim moved to Delhi and permanently settled there. Like his great ancestor, Shaikh Shamsuddin Mufti, he founded a school and made arrangement for the teaching of the subjects he had learnt so well. The school was known after him as the *'Madrasa'i Rahimiya'*. Schools in those days were only private enterprises started by individuals at their own initiative for the purpose of social service. They were mostly residential and mono-pedagogic institutions which often closed after the death of their founders. The royal subsidiary grants were only occasional if the school had become sufficiently popular to attract the attention of the high officials. The school of Shah 'Abdur Rahim was started at such a happy moment that it was not to die down immediately after the death of the founder. Nay, it was destined to flourish with greater success after him. He left behind him his son who made the school an everlasting institution. The present generation of theologians and traditionists, it must be admitted, owe their knowledge to the graduates of that madrasa; and the religious institutions which now exist in this subcontinent are mostly off-shoots of the same.

This school was the first in many centuries in India where Hadith was given a special attention instead of Fiqh, the subject which so far had dominated the field of study. Besides being a versatile scholar of various religious sciences, Shah 'Abdur Rahim was a mystic in the real sense of the term. He is said to have covered many stages of the path of spiritualism. He was the disciple of Shaikh Abdullah, a khalifa of the great saint Shaikh Adam Banauri, and of Shaikh Abul Qasim of Agra. At the instance of Shaikh Abul Qasim

21. *Anfas*, p 24. It is also said that his colleagues arranged for his dismissal; for once he wrote something on the margin for which the Emperor took the leader, Mulla Nizam, and his deputy, Mulla Hamid, to task.

Shah Wajih was a God-fearing man with abstemious habits and polite manners. There was nothing of wrecklessness of the medieval soldiery in him. He never let some personal considerations sway over his good intentions and his duty. Even in his dire need as his provisions ran short, he never allowed his horses stray into the fields of the peasants as other troopers did; he always depended on his own resources.[16]

Shah Wajih was survived by three sons: Abu Rida, 'Abdur Rahim, and 'Abdul Hakim. Shah 'Abdur Rahim, the father of Shah Wali Allah, the hero of our dissertation, was the most distinguished of the three brothers, on account of his achievements in the field of exoteric and esoteric sciences. No doubt he was gifted with the physique and spirit that is essential for a soldier, but he preferred an intellectual pursuit to a military career.

Shah 'Abdur Rahim was born in A.H. 1059/1644 probably at Rohtak (may be, at Agra). He received his early education from his father, Shah Wajih and his elder brother, Abu Rida.[17] He also attended for some time the lectures of Mir Zahid Harvi at Agra, who was famous for great study of fiqh, falsafa and kalam.[18] Owing to his love for learning and capacity to grasp things with comparative ease, Shah 'Abdur Rahim became a favourite pupil of Mir Zahid. Even in his early student life, Shah 'Abdur Rahim had made a good name among the jurists and the traditionists of his time. At the time of compilation of the *Fatawa'i Alamgiri*, a valuable book on Islamic Law, the services of Shah 'Abdur Rahim were requisitioned.[19] A board of prominent jurists under the supervision of Mulla Nizam was set up for the purpose. Shah 'Abdur Rahim was put on the committee appointed for revision of the parts compiled.[20] The Shah

---

16. *Anfas*, p. 162.
17. Shaikh Abu Rida Muhammad (d. 1101, 1689) was an eminent scholar of Hadith, and a great sufi of his time. In his *Anfas* (p. 87) Shah Wali has given a detailed note on his life and his mystical views.
18. Mir Zahid, son of Qadi Aslam of Herat, came to India during the reign of Jehangir (d. 1626) and was appointed the Qadi ul Qudat of Delhi. Shah Jahan made him the chronicler of Kabul (1653). In 1666 he was appointed as the Muhtasib of Agra. Mir Zahid was also a sufi of the Naqshbandi Order (*Vide Anfas*, p. 33).
19. *Fatawa'i Alamgiri* or *Fatawa'i Hindia* is an important book on Fiqh compiled at the instance of Aurangzeb (d. 1707), on the lines of Hidaya. A large number of 'Ulama took part in its compilation. The book was translated into Persian by 'Abdullah Chalpi. (See *Ma'arif*, 1947).
20. *Anfas*, p. 24.

Jahan. Shah Wajih possessed courage to jump into the fray single-handed and fearlessly. It was due to his extraordinary boldness, presence of mind, and tactics, that the almost defeated army of Aurangzeb won a great victory over the brave troops of Shah Shuja'. In the most critical moment of the battle when Aurangzeb's forces were on the verge of disastrous defeat, had no courage to face the wild elephants brought into action by Shuja', were retreating leaving behind only four soldiers to meet the onrush of the enemy, Shah Wajih's prompt action turned the situation of the war. Shah Wajih being one of the soldiers left behind, commanded his comrades to follow as he went forward to attack the advancing line of the elephants. Without a moment's loss he ran up to the elephant leading the others and cut down its trunk. The wild animal turned its back and fell upon the troops of Shuja'. This sudden and unexpected fury on the part of their own elephant caused a stampede, providing the army of Aurangzeb with an opportunity to make a fresh charge. The scattered enemy was hotly pursued and relentlessly dealt with. The field was left in the hand of Aurangzeb. The Emperor who was an eye-witness to this display of remarkable courage, presented Shah Wajih with a sword and offered him a high rank in the army. The Shah however unceremoniously refused to accept it; for he had done all that as a duty-bound and not for the sake of prizes.[14]

In his old age Shah Wajih was excused from active service and had virtually developed a disliking for the wars; but his desire for a martyr's death yet lingered in his mind and occasionally urged him to take up the sword once again. One morning as inspired with the hope of his object being fulfilled started for the Deccan—the notorious cockpit of war in the Mughal period—to join the imperial army at war with the Marathas. But he was killed on the way on the bank of Narbada in a skirmish with the highwaymen. He fought against the gang as valiantly as he did in his youth. He continued the fight until he received as many as twenty severe wounds and fell down senseless and his head was cut down.[15]

---

14. *Anfas*, p 165. *Vide* also *Islamic Culture* (Hyderabad, Deccan)—1947, p. 358. Aurangzeb defeated Shah Shuja' in the battle of Khajwah (Bihar) in January, 1659. With this victory the whole of Bengal came into Aurangzeb's possession. Shah Shuja' with a little, disheartened detachment of soldiers escaped towards Burma."
15. *Ibid*, p. 167.

to his instructions. But to the astonishment of all his bier was found without his corpse.[11]

Shamsuddin Mufti's descendents, for many generations, remained at Rohtak until Mahmud, the great-grandfather of Shah Wali, joined the Mughal service and left the town. Thus with Mahmud the family changed its profession from teaching or erudite scholarship to fighting and distinguished itself in that field too. Shaikh Mahmud's son Ahmad, grandson Mansur and great-grandson Mu'azzam, were more or less professional soldiers. It is related, Mansur was given a command of a force sent to subdue a rebel Raja. His son Mu'azzam who was only twelve at that time, was in command of the right wing. At the time of the general charge Mu'azzam held his position well; but soon the rumour went round that Mansur, the commander, was killed. This made the boy-commander desperate, and he carried an assault deep into the enemy lines reaching all alone right up to the elephant of the Raja. The Raja appreciating the gallant spirit of the young boy, ordered his soldiers not to do him any harm. The Raja informed the boy that his father was yet alive and fighting. It is said that the boy at last became the cause of conclusion of peace between the two parties.[12]

Shaikh Mu'azzam was renowned for his strength of will, undaunted courage, and large-heartedness. Shah Wali's father, Shaikh 'Abdur Rahim, heard it from an old peasant of Shaikhupur, a village in Shaikh Mu'azzam's jagir, that he saw the Shaikh fighting against a big gang of robbers which had raided that village. The Shaikh being a good marksman shot down a number of robbers and brought the rest to such a tight corner that they had no choice but to surrender. He drove them back to the village and asked them to return the looted property to its real owners.[13]

Shaikh Mu'azzam was survived by three sons: Jamal, Feroz, and Wajihuddin. Shaikh Wajihuddin about whom we have received comparatively a detailed information, was a true picture of his father. He was a gallant soldier, a great scholar, and a renowned mystic. He held a high rank in the Mughal army and sided with Aurangzeb in the war that started in 1068/1657 among the sons of Shah

---

11. *Anfas*, p. 159.
12. *Ibid.*, p. 161.
13. *Ibid.*, p. 162.

According to Shah Wali, the first of his ancestors who migrated to India from Persia or Turkistan was Shaikh Shamsuddin Mufti.[10] It is difficult for us to ascertain the date of his arrival in India; but by rough calculations, taking three generations in a century, Shamsuddin may be supposed to have come somewhere during the reign of Sultan Ghiathuddin Balban (664-685/1265-1286). Maybe, he migrated to India as forced by the onslaught of Mongolian hordes which carried fire and sword everywhere. On his arrival in India, Shamsuddin settled down at Rohtak, a township about thirty miles towards the north-west of Delhi. It is said Rohtak in those days was a flourishing centre of business and culture. Shamsuddin was a great scholar of theology and mysticism and was therefore much respected by the people of the town. He opened a school there and attracted a large number of students from different parts of the country. In recognition of his services to the religion and for his profound knowledge of Fiqh, he was made the mufti or the consulting judge of Rohtak. He held this honorary office throughout his life. Even after his death the muftiship remained in his family for generations. It was only in the time of Mahmud, the great-grandfather of Shah Wali, that muftiship passed out of the family; for he had joined the Mughal forces and lived for most of his life in the cantonments.

Shaikh Shamsuddin was not merely a scholar of Quran and Hadith, but was also a sufi of a very high order. A number of miracles have been ascribed to him. It is said that at the time of his death, he asked his friends and relations to leave his bier in the mosque after the burial prayer (namāz janāzah) was over. It was done according

---

10 *Anfas*, p. 158. It is really doubtful whether Shamsuddin came from Persia, Iraq, or Turkistan The peculiar names given in the genealogical table (given below) may suggest anything :—

ولی اللہ بن شیخ عبدالرحیم بن شہید وجیہ الدین بن معظم بن منصور بن احمد بن محمود بن قوام الدین عرف قاضی قادن بن قاضی قاسم بن قاضی کبیر عرف قاضی بلہ بن عبدالملک بن قطب الدین بن کمال الدین بن شمس الدین مفتی بن شیر ملک بن محمد عطا ملک بن ابوالفتح ملک بن عمر حاکم ملک بن عادل ملک بن فاروق بن جر جیس بن احمد بن محمد شہر یار بن عثمان بن ہامان بن ہمایون بن قریش بن سلیمان بن عرفان بن عبداللہ بن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ و عنہم اجمعین -

Shah Wali had found this table from the house of Shah Arzani of Badaun who was a descendent of Sher Malik (see above).

of eminence, to be a bright luminary in the galaxy of scholarship and erudition.[6]

Shah Wali's birth, as in the case of all great men of the past, especially religious reformers, was announced in visions and dreams to his parents and other relations. His father Shah 'Abdur Rahim, was once informed in a vision at the tomb of Khwaja Qutubuddin Bakhtiar Kaki (d. 634/1236), a disciple of Khwaja Muinuddin Chishti of Ajmer, that God would bless him with a son really worthy of him. As his wife had reached the age of sterility, he interpreted the vision as blessing for an intelligent khalifa or successor. But the Khwaja cleared up his doubt by saying that the son would be his real son, his own flesh and blood, and that he should name the child after him—Qutubuddin.[7]

Shah 'Abdur Rahim was nearly sixty at that time. But as directed by the Khwaja (despite jeers and mocks and annoyance of other relations), he married for the second time. It is related that some time before the birth of Shah Wali, Shah 'Abdur Rahim and his wife as they were busy in morning prayer saw two little hands raised with them in invocation to the Almighty. Shah 'Abdur Rahim took it to be the hands of his son that was yet to be born.[8]

Shah Wali's Ancestors

Shah Wali Allah traces his origin from father's side to 'Umar Faruq, the second Caliph of the Prophet Muhammad, and from mother's side to Imam Musa Kazim (138/755), the great grandson of Hazrat 'Ali, the fourth Caliph of the Prophet. The family's connection with the great sons of Islam, distinguished for statesmanship and learning, can lead us to presume that its members might have inherited the great qualities of forefathers.[9]

---

6. *Anfasul 'Arifin*, p. 202. Some of the astrologers declared that the star at the time of his birth was in the second degree Pisces the sun had risen one degree ; the Saturn was in the tenth degree of Aries ; the Jupiter in its fifteenth ; and the year was of the brightest conjunction and it was in the degree of Taurus ; and Mars was in its second degree and Dragon's Head in the Cancer.

7. *Ibid.*, p. 44.

8. *Ibid.* At his birth the child was named *Wali Allah*. But when his father remembered the words of Khwaja Bakhtiar, he renamed him Qutubuddin Ahmad.

9. 'Umar Faruq (*d.* 644 A.D) is renowned for his statesmanship and Hazrat 'Ali (*d.* 660 A.D.) for his chivalry and learning.

Vandalism of the nobles and squabbles of the learned men and the sufis had adversely affected the masses. Due to heavy taxes imposed on them by the rulers' the craftsmen were reduced to poverty and immorality. (*Vide* details in the *Tafhimat*). A large number of people went idle and swindled the state treasury by clever tactics. Their religion was confined to a few repugnant superstitions only. In short, the rulers and the ruled were on the verge of ruin. It was at this time that Shah Wali Allah appeared on the scene.

"In fact, it is in the *interest* of the Creator of the Universe that the life of the world should run smooth ; there should be no aggression and aggressors. He wants that all should lead a life of mutual sympathy and co-operation. If the affairs go bad anywhere in His creation, He inspires someone to take up the task of reforms.[5]" It is for this reason that usually a renovator of the faith is sent at the turn of every century. Shah Wali Allah possessed all the talents—and was provided by nature with the opportunities to develop them on the right lines—that go in the making of a *Renovator of the Faith*, a representative of the Prophet of God.

Shah Wali Allah studied the situation from different angles and realised the actual causes of the evil, and started upon the task to root them out. In his daily sermons and his writings, he pointed out to every one the defects in the general behaviour of the rulers and the ruled and suggested remedy for them (*Vide Siyasi Maktubat*, pp. 41—44). He occasionally addressed letters to men in authority advising them to suppress revolts and thereby assuage the sufferings of the poor people. He wanted that Muslims under all circumstances should revert to simple ways of early Islam ; and in his opinion an unbiased study of the Quran and the Hadith would automatically compose all the differences of the various sects in Islam.

Shah Wali Allah's Birth

Shah Wali Allah (Abul Fayyad Qutubuddin Ahmad) was born at Delhi or Pehlat (a village in U.P.) on the 4th of Shawwal, 1114 A H. (1703 A.D.) in a family already distinguished for its learning and swordsmanship. The positions of the stars at the time of his birth suggested extreme auspiciousness, predicting child's rise to the heights

5. *Hujjat, II*, p. 168.

morale of the ruling class, the disgruntled and dissatisfied non-Muslims fell upon the land and devastated it.

The reign of terror did not stop with the victory of Bahadur Shah I (1707-1712) and his succession to the throne. The new ruler was too old to stand the strain of the vast administration and reorganisation of the fighting forces. He gave himself up to a life of ease and comfort.

Bahadur Shah had idiosyncrasies which did not befit a descendent of Babur and Akbar and a ruler of a vast empire. At a time when chaos was the order of the day, he marched against a strong enemy in a spirit of going on a pleasure trip. He was not at all ashamed to return from an expedition unsuccessful or defeated. It is very amusing to note that he often refused to march against a rebel not quite up to his standard of imperial dignity. Successors of Bahadur Shah were no better. Every one of them loved a life of pleasure, letting the nobles take care of the state. The nobles were no less devoted to ease and comfort. Their bacchanalian habits and great pomp and show surpassed even the feudal lords of Rome and Persia of the VI century.[2] They were divided into various factions (three of which, Indian, Persian and Turkish were the main), each trying to outmanœuvre the others. The court was full of intrigues and mutual mistrust, and no effective expedition could be sent against any rebel. The crown was actually a toy in their hands.[3] The treasury was empty and the unpaid soldiery had become disloyal. In fact, with the reins of authority in the hands of such selfish weaklings there was no possibility of defending the faith and protecting the faithful.

It was not only the political field that was so badly affected ; the religion too was regularly betrayed by the so-called sufis and jurists. It was virtually split up into various sects and schisms. The main occupation of the each sect was nothing but to outwit the other by peculiar argumentation. Kalam, tasawwuf, and ahkam-i-shariat were confused with one another and their masa'il were interpreted according to the needs. Their interest in mysticism and regard for the sayings of the saints had superseded their faith in the Quran and the Hadith.[4]

---

2. *Vide Hujjat, I*, p. 199.
3. *Shah Wali Allah ke Siyasi Maktubat*, p. 52.
4. *Al-Furqan* (Shah Wali Allah Number), p. 97.

An Exhaustive Study

OF THE

LIFE OF SHAH WALI ALLAH DEHLAVI

Dr. FAZLE MAHMUD, M.A., D.Phil (Cal.)

INTRODUCTION

SHAH WALI ALLAH[1] belongs to that class of savants who appeared one after the other in Islam in the course of the past thirteen centuries to revive faith and to remove from it all superstitious beliefs and heretic inclinations. In fact for a religion which claims to be *final* and abrogator of all the other religions of the earth, such a revival and occasional check-up is quite essential. This will save it from deterioration and ultimate death. It was a piece of good luck that of all the world a revivor in the person of Shah Wali Allah appeared in this sub-continent and rescued the Muslim community from the grip of terrible catastrophe.

Circumstances of a piquant and persistent nature invariably bring about a change in the mentality of the people directly connected with them. A comparison between the Muslims of the early Muslim rule in India and those of the early eighteenth century provide us with a good illustration to support this statement. The unity of purpose and ruthlessness of action which characterise the early Muslims, are not found in the Muslims of the later times.

The reason is not far to seek. As centuries passed with the Muslims ruling the land, one dynasty after the other, the community in general was led to believe that there could be no people strong enough to wrest power from them. Self-complacency reached such a pitch that even factors essential to keep power in hand were lost sight of. Over and above, political and strategical blunders on the part of some persons in authority made the matters still worse. Aurangzeb's strict religious policy made the non-Muslim subjects of the empire conscious about their self-interest and led them to action. As the strife for succession among the sons of Aurangzeb progressed, taking toll of life and destroying

1. The name is written thus merely for the sake of convenience. Actually its transliteration should be Shah Waliyullah.

صرف سرورق
پنجاب یونیورسٹی پریس لاہور میں چھپا
۱۳۸—۳,۰۰۰—۱۸-۸-۵۵